خطبات لاہور
خواجہ شمس الدین عظیمی
www.azeemisoul.blogspot.com
مکتبہ عظیمیہ اردو بازار لاہور

خطبات لاہور
(باتصویر)
الشیخ خواجہ شمس الدّین عظیمی
مکتبہ عظیمیہ اُردو بازار لاہور۔
برائے رابطہ: 158 مین بازار مزنگ لاہور۔
فون: 042-37243541

انتساب:

"اُس جبلِ نور کے نام"

جہاں سے متجلّی ہونے والے نورِ ہدایت نے نوعِ انسانی کی ہر معاملے میں راہنمائی فرما کر قلوب کی بنجر زمین کو معرفتِ الٰہیہ، بے نیازی اور کبریائی کے انوارات سے حیات عطا کرنے کا نظام دیا۔

نام کتاب: خطبات لاہور

مؤلف: الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی

ترتیب و پیشکش: میاں مشتاق احمد عظیمی

کمپوزنگ: منور ملک 0300-8076971

ناشر: مکتبہ عظیمیہ اُردو بازار لاہور

باہتمام: اورنگزیب عظیمی، غلام مصطفیٰ عظیمی

مطبع: اکبر ندیم پرنٹرز لاہور

قیمت: 499/- روپے

مکتبہ عظیمیہ اُردو بازار لاہور۔

برائے رابطہ: 158 مین بازار مزنگ، لاہور۔

فون: 042-37243541

فہرست

☆☆☆

"خطباتِ لاہور" کتاب آپ کے ہاتھوں میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آ چکی ہے۔ یہ کتاب دراصل مرشدِ کریم الشیخ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے ان خطبات پر مشتمل ہے جو مراقبہ ہال لاہور کے زیرِ اہتمام لاہور کی سرزمین پر دیئے گئے ہیں۔

یہ صرف مرشدِ کریم کے خطبات نہیں ہیں بلکہ یہ دراصل میرے مرشد کی پکار ہے، ایک آواز ہے وہ آواز ہے جس سے ہمارے پیارے نبی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے نوعِ انسانی کو آشنا کیا تھا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ پکار دراصل اللہ کی پکار تھی کہ اللہ اپنی مخلوق سے بہت محبت کرتا ہے اور اس بے انتہا محبت کے نتیجے میں مخلوق کو پریشان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اللہ اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی ہے۔ نبی کریم پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوعِ انسانی کو ایک ایسا نظام دیا جس کے تحت دلوں کی مردہ سرزمین، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور کبریائی کے انوارات سے زندہ جاوید ہوگئی۔

اسی نظام کے تحت نوعِ انسانی کو زندگی کے ہر معاملے میں راہنمائی عطا فرمائی گئی اور یہ راہنمائی اس طرح سے دی گئی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی زندگی میں عمل کر کے دکھایا۔ اس نظام سے نوعِ انسانی کو متعارف کرانے کے صلے میں پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری زندگی مصائب و آلام برداشت کیے،

لیکن ان تکالیف کو برداشت کرنے کے باوجود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی آواز پہنچانے میں، اور اس آواز کے اندر پیغام کو پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔ اسی نسبت کے تحت میرے مرشدِ کریم نے بھی مخلوق کو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے پیغام سے متعارف کرانے کے لئے آواز دی۔ الحمد للہ! میرے مرشد کریم اپنی ڈیوٹی پوری کرنے میں کامیاب رہے۔

یہ خطبات بھی دراصل میرے مرشد کی آواز کے اندر چھپا ہوا وہ پیغام ہے جس سے نوعِ انسانی متعارف ہو کر دکھ، درد، بیماری، پریشانی اور بے سکونی جیسی زندگی کے تمام افعال و اعمال سے، خیالات و تصورات سے نجات حاصل کر کے جنت کی زندگی اور ایک سکون آشنا زندگی سے متعارف ہوسکتی ہے۔

میرے مرشد کریم کے ان خطبات کے دوران میں قدم بہ قدم اپنے مرشد کریم کے ہمراہ رہا۔ ان خطبات کے دوران، مجھے ایک بات بہت زبردست لگی کہ ہر پروگرام میں مرشدِ کریم اور ان کے خطبات کی بہت پذیرائی ہوئی۔ میں نے اپنے مرشد کے اندر ایک عجز اور انکساری کی کیفیت ہمہ وقت دیکھی۔ جس نے مجھے بہت متاثر کیا، کہ ایک سلسلۂ کے سربراہ، کئی سلاسل کے خانوادہ، حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد، اللہ کے عرفان سے آشنا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قلبی اور باطنی تعارف رکھنے والے شخص کے اندر اتنا عجز و انکسار۔ یہ وہ عاجزی ہے جو پیغمبرانہ تعلیمات کا خاصۂ ہے۔ جو صرف اور صرف اللہ اور اللہ کے رسولؐ سے واقف شخص کے اندر ہی ہوسکتی ہے۔ اور جو شخص اللہ سے، نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اپنی روح سے واقف نہیں ہے اس کے اندر عجز و انکساری محض لفظوں کا کھیل ہے اور کچھ نہیں۔

میرے مرشد کریم نے ایک دفعہ مجھے فرمایا تھا کہ میاں صاحب زندگی میں اگر کچھ پانا ہے تو ہمیشہ عاجزی اور انکساری اختیار کیے رہنا۔

میں نے قدم بہ قدم مختلف درسگاہوں میں، کئی اداروں میں اور اپنے بچوں کو تعلیمات الٰہیہ سے متعارف کرانے کے لئے مرشدِ کریم کو یہ پکار دیتے ہوئے سنا ہے کہ:

☆ اللہ کو ایک مانو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور سب کچھ اللہ ہی سے مانگو۔

☆ اللہ کی ذات کا عرفان حاصل کرو۔

☆ حضور محمد الرسول اللہ کا قلبی و باطنی تعارف حاصل کرو۔

☆ اپنی روح سے واقفیت حاصل کرو جو کہ غور وفکر اور مراقبہ سے ہوسکتی ہے۔

☆ اپنی ہر چیز کا کفیل اللہ تعالیٰ کو سمجھو۔

☆ اپنے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو۔
☆ جھوٹ مت بولو۔ ہمیشہ سچائی کا راستہ اختیار کرو کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ساری زندگی سچ بولا ہے۔
☆ کسی چیز کو اپنی ملکیت نہ سمجھو۔
☆ غرور و تکبر سے بچو۔ اقتدار کی خواہش سے بچو۔
☆ ہمیشہ عاجزی و انکساری اختیار کرو چاہے جہاں مرضی پہنچ جاؤ۔
☆ کسی کا حق غصب مت کرو۔
☆ فتنہ سے بچو۔ فتنہ بجائے خود ایک ہلاکت ہے۔
☆ تفرقہ بازی مت کرو اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔
☆ کسی کی دل آزاری مت کرو۔ روحانیت میں دل آزاری سب سے بڑا جرم ہے۔
☆ تمام نوعِ انسانی کو یکساں سمجھو۔ کسی کو کسی پر برتری نہیں ہے اگر برتری ہے تو متقی اور پرہیزگار شخص کو ہے۔
☆ غصہ مت کرو۔
☆ شک مت کرو۔

مرشد کریم کی اس پکار کا اثر ہے کہ پوری دنیا میں مراقبہ ہال کے نام سے سینٹرز بن چکے ہیں۔ پاکستان میں تقریباً ہر بڑے شہر میں ایک مراقبہ ہال موجود ہے۔ جہاں سے پیر و مرشد کی انہی تعلیمات کو منعکس کیا جا رہا ہے۔ میں نے "خطباتِ لاہور" کتاب میں، کوشش کی ہے کہ مرشد کریم کی ان تعلیمات کو یکجا کر کے ایک تاریخی دستاویز تیار کرلوں اور آج الحمد للہ، یہ تاریخی دستاویز آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ دستاویز موجودہ اور آنے والی نسلوں کے سپرد کی جاتی ہے۔

میں آپ سب دوستوں، سلسلہ کے بہن بھائیوں اور قارئین سے انتہائی ملتجیانہ لہجے میں، درخواست کرتا ہوں کہ میرے مرشدِ کریم کی ان تعلیمات کو یکسو ہو کر، تنہائی میں بیٹھ کر پڑھنے کے بعد غور و فکر ضرور کیجئے اور ان پر حتی المقدور عمل پیرا ہونے کی کوشش کیجئے۔ سب باتوں کی بجائے اگر آپ صرف ایک بات پکڑ کر پہلے اس پر عمل کرلیں اور اس کو اپنی ذات میں راسخ کرلیں تو مرشد کریم کے ساتھ ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرزِ فکر بھی آپ کو حاصل ہو جائے گی۔ طرزِ فکر ہی سب کچھ ہے جنت بھی ہے اور دوزخ بھی۔ خود بھی جنت والی زندگی سے آشنا ہوں اور دوسروں کو بھی جنت والی پرسکون زندگی سے روشناس کیجئے۔

آخر میں اپنے سب دوستوں کا مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری اور مواد حاصل کرنے میں میری مدد فرمائی۔ اللہ اُن سے راضی ہو اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرشد کریم کی تعلیمات کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) میں نے ہمیشہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا فرمان اپنے ذہن میں رکھا کہ۔

با ادب.......... با نصیب

بے ادب.......... بے نصیب

میاں مشتاق احمد عظیمی

روحانی فرزند

الشیخ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالیٰ

برائے رابطہ: مکتبہ عظیمیہ اردو بازار لاہور

مراقبہ ہال 158۔ مین بازار مزنگ لاہور

فون: 042-37243541

0300-4452866

تاریخ اشاعت

27-1-2013

☆......☆......☆

لاہور آمد پر مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی کی ایک یادگار تصویر (23 [illegible] 1981)

شہرِ لاہور

یہ شہر پنجاب کا دارالحکومت ہے اور دریائے راوی کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ کئی صدیوں سے یہ شہر پنجاب کا صدر مقام رہا ہے۔ پہلی تاریخوں میں اِس کا نام کہیں لہاور، کہیں لہانور، کہیں لوہور اور کہیں لاہور ہی تحریر کیا گیا۔ امیر خسروؒ نے بھی اپنی کتاب میں اِس شہر کو لاہور ہی درج کیا ہے۔ پہلے پہل مہاراجہ رام چندر اوتار کے فرزند ''لو'' نے یہ شہر آباد کیا اور لوہور کا نام رکھا۔ ہزاروں سال کی مدت گزرنے کے سبب لوہور کا لفظ بگڑ کر لاہور مشہور ہوگیا۔ اور دوسرا شہر رام چندر جی کے دوسرے بیٹے ''کسنتو'' نے قصور آباد کیا۔ خلاصہ التواریخ میں لکھا ہے کہ ۴۳۵ھ ہجری سلطان محمود غزنوی کے عہد میں یہ شہر سب سے پہلے راجہ پر بھت سنگھ نے جو پانڈوں کی اولاد میں سب سے بڑا راجہ تھا آباد کیا۔ اور پھر قحط وغیرہ کی وجہ سے یہ بستی ویران ہوگئی اور صد ہا سال تک ویران رہی۔ پھر راجہ بکر ماجیت کا وقت آیا تو اس کے حکم سے دوبارہ اِس شہر کو آباد کرنے کی بنیاد رکھی گئی۔

جب اسلام کا زمانہ آیا اور مسلمان بادشاہوں نے غربی ملکوں میں قوت حاصل کی تو سلطان سبکتگین کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اُس وقت بھی اِس شہر کا نام لاہور ہی تھا اور راجہ جے پال برہمن پنجاب کا فرماں روا تھا جس کی سلطان ناصر الدین سبکتگین اور اُس کے فرزند سلطان محمود غزنوی کے ساتھ لڑائیاں ہوئیں۔ پہلے اِس شہر کی کھلی آبادی تھی۔ فصیلِ شہرِ پناہ نہ تھی۔ اکبرِ اعظم نے اِس کے گرد پختہ حصار بنوایا۔ فصیل کی دیوار بہت بلند اور چوڑی تعمیر کی گئی۔ ایک ایک دروازے کے درمیان دس دس برج کلاں بنوائے گئے۔ دروازے پختہ تعمیر کیے گئے۔ لاہور کا شاہی قلعہ بھی تعمیر کیا گیا۔ یہ فصیل سکھوں کی حکومت میں بھی قائم رہی۔ مگر جب انگریزوں کا دور آیا تو یہ فصیل آدھی کر دی گئی۔ پھر انگریزوں کے ہی دورِ حکومت میں گرا کر اُس کی جگہ ایک مختصر دیوار بنا دی گئی۔

شہر کا حدود اربعہ:

شہر کا قدیم حصہ طول میں سوا میل اور عرض میں ایک میل ہے۔ کل حصہ تقریباً تین میل کے قریب ہے۔ یہ شہر دریائے راوی کے بائیں کنارے دو میل کے فاصلہ پر آباد ہے۔ صدہا سال سے یہ شہر پنجاب کا صدر مقام رہا ہے۔ اِس شہر کی مشرقی سرحد تقریباً ۲۳ میل کے فاصلے پر ہے۔ اِس کا عرض ۳۱ درجہ ڈگری پر ۳۴ فٹ اور ۵ انچ شمال کی طرف اور طول ۷۴ درجہ ڈگری پر ۲۱ فٹ شرقاً ہے اور یہ سطح سمندر سے ۷۰۶ فٹ بلند شہر ہے۔ شہر کو متوازی اضلاع کی شکل میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اندرون شہر تقریباً ۱۱۴۶۱ ایکڑ پر محیط ہے۔ دریائے راوی مشرق کی طرف سے ایک لمبا چکر کاٹتا ہوا شہر کے شمال کی طرف سے گزرتا ہے۔ ایک زمانے میں یہ دریا شہر کی دیوار کے ساتھ بہتا تھا لیکن ۱۶۶۲ء میں اِس کا رخ بدلنے کی وجہ سے شہر کو لاحق خطرہ کے پیشِ نظر بادشاہ اورنگ زیب نے اِس کے کنارے تقریباً ۴ میل کے فاصلے تک پختہ اینٹوں اور چونا گارے سے ایک بڑا بند تعمیر کروا دیا جس سے یہ شہر تباہی سے بچا رہا۔ ہندو بادشاہوں کے دور میں خانہ جنگیوں اور ہنگامہ آرائیوں کے نتیجے میں یہ شہر ویران ہوگیا پھر ۱۰۲۳ء میں سلطان محمود غزنوی نے پنجاب کو فتح کرنے کے بعد اس شہر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اِس کو از سرِ نو آباد کیا۔ اور اپنے چہیتے غلام ملک ایاز کو یہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ ملک ایاز کی قبر اب بھی رنگ محل شاہ عالم گیٹ کے اندر موجود ہے۔ اکبر اعظم نے لاہور میں ۱۵۸۴ء سے لے کر ۱۵۹۸ء تک قیام کیا اور اس شہر کے گرد ۳۰ فٹ بلند ایک فصیل بنا دی۔ پھر جب رنجیت سنگھ ۱۸۱۲ء کو پنجاب پر قابض ہوا تو یہ فصیل ۱۵ فٹ تک رہ گئی۔ انگریزوں کے زمانے میں نہ صرف لاہور کو پنجاب کا دارالحکومت قرار دے دیا گیا بلکہ دہلی بھی اِس صوبے کے ماتحت کر دیا گیا۔ مغلوں کے زمانے میں اندرون شہر سے باہر کچھ مضافات بھی بن گئے تھے جن میں سے موضع مزنگ گڑھی شاہو، قلعہ گوجر سنگھ، اچھرہ، میاں میر، باغبانپورہ اور شاہدرہ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔

اِس شہر کے بارہ دروازے اور ایک چھوٹا دروازہ جس کو موری دروازہ کہتے ہیں شامل کر کے کل (۱۳) تیرہ دروازے بنتے ہیں۔

(۱) پہلا دہلی دروازہ:

یہ دروازہ مشرق کی سمت گویا شہر دہلی کی طرف ہے۔ اسی لئے اِس کو دہلی دروازہ کہتے ہیں۔ اِس دروازہ سے

لوگوں کی آمد و رفت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اِس دروازہ کے باہر لاہور کا ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔ مسجد وزیر خاں بھی اِس دروازے کے اندر ہے۔

(۲) دوسرا اکبری دروازہ:

اِس دروازے کو بادشاہ وقت محمد جلال الدین اکبر المعروف اکبر اعظم نے اپنے نام سے موسوم کیا۔ اِس دروازے میں ہر قسم کے غلّے کی منڈی بھی اکبر اعظم نے بنوائی جس میں ہر قسم کے اناج اور غلّے کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔

(۳) تیسرا موتی دروازہ المعروف موچی دروازہ:

یہ دروازہ موتی رام جمعدار جو ملازم اکبرِ اعظم کا تھا، اُس سے موسوم ہے موتی رام ساری زندگی اِس دروازے کی حفاظت پر تعینات رہا جس کی وجہ سے یہ دروازہ ہمیشہ کیلئے موتی بن گیا سکھوں کے زمانے میں اس کا نام موتی دروازے سے بدل کر موچی دروازہ مشہور ہوگیا۔

(۴) چوتھا شاہ عالمی دروازہ:

یہ دروازہ اورنگ زیب بادشاہ کے بیٹے اور جانشین شاہ عالم بہادر شاہ کے نام سے موسوم تھا۔ شاہ عالم بہادر شاہ نہایت حلیم الطبع بادشاہ تھا۔ اور وہ ۲۸ فروری ۱۷۱۲ء کو فوت ہوا تھا۔

(۵) پانچواں لوہاری دروازہ:

اصل نام اِس کا لاہوری دروازہ ہے۔ اِس دروازے کو خاص لاہور کا دروازہ تصور کیا جاتا ہے۔ جب سلطان محمود غزنوی نے چاہا کہ راجہ جے پال کو لہور سے بے دخل کر کے پنجاب کا علاقہ اپنے ماتحت کر لے تو راجہ جے پال چند ماہ تک اِس شہر میں محصور ہو کر لڑتا رہا اور آخر بھاگ گیا۔ محمود غزنوی نے شہر کو آگ لگا دی۔ رعایا کو قتل کیا گیا۔ جس سے لاہور شہر بالکل برباد اور ویران ہوگیا۔ آخر جب ملک ایاز نے پنجاب کا انتظام سنبھالا تو پھر اِس شہر کو آباد کیا گیا۔ سب سے پہلے شہر کی آبادی اسی محلے سے شروع ہوئی جس کو لاہوری منڈی کہا جاتا ہے اور سب سے پہلے بھی یہی دروازہ تعمیر کیا گیا۔

(۶) چھٹا موری دروازہ:

یہ دروازہ دوسرے سبھی دروازوں سے چھوٹا ہے۔ جیسا کہ اِس کے نام سے ظاہر ہے۔ جن دنوں میں راجہ جے پال سلطان محمود غزنوی کے ساتھ برسرِ پیکار تھا، تو سلطان محمود غزنوی نے شہر کومحصور کیا ہوا تھا: راجہ تو بھاگ گیا۔ مگر لوگ بدستور لڑتے رہے۔ سلطان محمود غزنوی نے چاہا کہ شہر فتح کرے تو اِس موری دروازے کے مقام سے دیواروں کو گرا کر شہر میں داخل ہوگیا۔ جب ملک ایاز نے اِس شہر کو پھر آباد کیا تو فتح کے یادگار کے طور پر اِس جگہ دروازہ قائم کر دیا یہ شہر کا سب سے چھوٹا دروازہ تھا۔ پنجابی میں موری دروازے کا مطلب ہے کہ ایسا دروازہ جس کو شہر کے فضلات، گندگی اور پانی کے نکاس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۷) ساتواں بھاٹی دروازہ:

اس دروازے کو راجپوتوں کے قدیم قبیلے بھاٹ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ملک ایاز کے زمانے میں یہ قوم یہاں آ کر آباد ہوئی اور صدہا سال آباد رہی اور انہوں نے یہاں کے حاکمِ وقت کے ساتھ یہ شرط رکھی تھی کہ ہم اپنا محلّہ آباد کرتے ہیں مگر یہ دروازہ ہمارے نام سے موسوم ہوگا۔ اس دروازے کے باہر مغرب کی طرف حضور داتا گنج بخش ہجویریؒ کا مزار بھی ہے۔

(۸) آٹھواں ٹکسالی دروازہ:

مسلمان بادشاہوں کے دورِ حکومت میں اِس کے قریب ایک ٹکسال قائم تھی جہاں پر سکے بنائے جاتے تھے۔ اس لئے اِس دروازے کا نام ٹکسالی دروازہ مشہور ہوگیا۔

(۹) نواں روشنائی دروازہ:

یہ دروازہ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے درمیان واقع ہے۔ چونکہ قلعہ سے شہر جانے کے لئے یہ ایک بڑی گزرگاہ تھی۔ اس لئے راستہ سے اُمرا، درباری اور شاہی ملازمین یہاں سے گزرنے لگے۔ رات کو ان لوگوں کے گزرنے کے لئے اِس جگہ روشنی کی جاتی تھی۔ اس لئے یہ روشنی کا دروازہ یعنی روشنائی دروازہ کہلایا جانے لگا۔

(۱۰) دسواں مستی دروازہ:

یہ دروازہ بھی ایک شاہی ملازم مستی بلوچ کے نام سے مشہور ہے۔ جو اِس دروازے کی حفاظت کے لئے مامور تھا۔ اور آخری وقت تک اِس دروازے کی نگہبانی کرتا رہا تھا۔ اس لئے شاہی حکم سے یہ دروازہ اِس کے نام سے مشہور ہوگیا۔ یہاں پر اکبراعظم کی والدہ مریم مکانی کی ایک مسجد بھی ہے۔

(۱۱) گیارہواں کشمیری دروازہ:

اِس دروازہ کا رخ کشمیر کی طرف ہے۔ اس لئے اِس دروازے کا نام کشمیری دروازہ مشہور ہوگیا۔ اِس دروازے کے اندر کشمیریوں کو آباد کیا گیا تھا۔

(۱۲) بارھواں خضری دروازہ المعروف شیرانوالا دروازہ:

مشہور ہے کہ زمانہ قدیم میں دریائے راوی شہر کی دیوار کے ساتھ بہتا تھا اور اِس دروازے کے ساتھ دریا کی گھاٹ بھی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی حضرت خضر علیہ السلام کے نام سے اس دروازے کو منسوب کیا گیا۔ وہ ایک روحانی بزرگ ہیں۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اِن کو سمندروں اور دریاؤں پر اختیار حاصل ہے۔ راجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں یہاں پر ایک پنجرے میں دو پالتو شیر رکھے ہوئے تھے اس لئے اِس دروازے کو شیرانوالہ دروازہ بھی کہتے ہیں۔

(۱۳) تیراھواں یکی دروازہ:

یہ دروازہ پیر حضرت یکی شہید کے نام کی وجہ سے مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جب بے دین مغلوں نے شمال کی طرف سے حملہ کیا تو یہ بزرگ کمال دلاوری سے اِس شہر کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔ دروازے پر اِن کا سر گردن سے جدا ہوگیا تو جسم بے سر دشمنوں سے لڑتا رہا آخر کار شہر کے ایک حصہ کے قریب گر پڑا۔ اِن کا ایک مزار اس جگہ بنایا گیا جہاں پر اِن کا سر گرا تھا اور دوسرا اُس جگہ تعمیر کیا گیا جہاں اِن کا دھڑ گرا تھا۔ اب دونوں قبریں موجود ہیں اور زیارت گاہِ خاص و عام ہیں۔

لاہور کے اولیاء اللہ:

روایت ہے کہ شہر لاہور میں تقریباً ۴۰۰ کے قریب اولیاء اللہ محوِ استراحت ہیں۔ خاص کر میانی صاحب (مزنگ لاہور) میں اِن کی تعداد ۳۰۰ سے زائد ہے۔ اِس مبارک خِطّۂ سرزمین پر حضرت سیّدنا علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المشہور حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت سید ابوالفیض میراں حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سیّد سوف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت میراں موج دریا بخاری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مادھو لال حسین رحمۃ اللہ علیہ، حضرت طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت پیر ابو اسحاق قادری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سید عبداللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت موسیٰ آہن گر رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت پیر ہجر شاہ رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت شاہ جمال قادری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت پیر ترنگ علی شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت معصوم شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بشیر قادری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عزیز الدین المشہور پیر مکی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امجد علی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیر شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عنایت قادری رحمۃ اللہ علیہ، (مرشد پاک حضرت بابا بلھے شاہؒ اور حضرت وارث شاہؒ)، حضرت صوفی غلام حسین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شمس الدین قادری بخاری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شہاب الدین بخاری المشہور پنج پیر رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت پیر یوسف مجنوں سائیں، حضرت واصف علی واصف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سعید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ کمال رحمۃ اللہ علیہ، حضرت خوشی محمد رحمۃ اللہ علیہ، حضرت محمد یعقوب قادری رحمۃ اللہ علیہ، پیر حضرت قمر علی شاہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، صوفی عبدالحمید قلندری رحمۃ اللہ علیہ، بابا محمد طفیل بلوچ قلعی گر رحمۃ اللہ علیہ، بابا سیّد رکن الدین شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ، سیّد چراغ شاہ نقوی رحمۃ اللہ علیہ، بابا نظام شاہ مجذوب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حبیب الرحمٰن خاں اویسی نظامی رحمۃ اللہ علیہ، حمید نظامی رحمۃ اللہ علیہ، حافظ محمد شفیق قادری نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، غازی علم دین شہید رحمۃ اللہ علیہ، سید یعقوب علی شاہ صابری چشتی رحمۃ اللہ علیہ، بابو غلام سرور چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ، (سعدی پارک والے)، میجر شبیر شریف شہید رحمۃ اللہ علیہ، (ستارہ جرأت)، دُلّا بھٹی رحمۃ اللہ علیہ، جناب اشفاق احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ فیروز الدین نظامی چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت محمد موسیٰ چشتی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ (ہال روڈ والے)، حضرت سید شاہ محمد بخاری

رحمۃ اللہ علیہ، حضرت بابا امام بخش نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، سید معصوم علی شاہ اورنگ آبادی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت فیروز الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، میاں مشتاق احمد قادری چشتی صابری رحمۃ اللہ علیہ (طاہر بندگی والے)، اماں جی سرکار شاہدرہ والی رحمۃ اللہ علیہ، بابا اللہ والے چشتی قادری رحمۃ اللہ علیہ، بابا چھتری والا رحمۃ اللہ علیہ، حضرت الیاس شاہ بوڑھے والے، سید عبداللہ شاہ مزنگ والے رحمۃ اللہ علیہ، حضرت نوازش علی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے علاوہ بے شمار اولیاء اللہؒ مرجع خلائق برائے فیوض و برکات لاہور میں مدفن ہیں۔

مُرشدِ کریم کی لاہور میں پہلی آمد

یہ مضمون میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب کی ان یادوں پر مشتمل ہے جو مرشدِ کریم الشیخ حضور خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی لاہور میں پہلی آمد پر مسلسل دل اور روح کو کیف ونشاط میں ڈبوئے ہوئے تھیں۔

مُرشدِ کریم لاہور میں پہلی مرتبہ ۲۳ نومبر ۱۹۸۱ء رات ۱۰ بجے لاہور کی سرزمین پر جلوہ افروز ہوئے۔ میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب کی یہ دلچسپ تحریر ''دل مرشد کے قرب کے لئے کس طرح بے قرار ہوتا ہے۔'' کی بھرپور عکاسی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس ملاقات اور آمد کا احوال بیان کرتے ہوئے میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب بتاتے ہیں کہ:

۲۱ نومبر ۱۹۸۱ء کی شام تھی جب مجھے ایک خط جناب فرخ اعظم صاحب کی طرف سے موصول ہوا کہ قبلہ محترم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب بذریعہ شالیمار ایکسپریس لاہور تشریف لا رہے ہیں میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں بار بار اپنے گھر میں بچوں سے مرشدِ کریم کے بارے میں تذکرہ کرتا اور اپنی کیفیات میں خود ہی لطف اندوز ہوتا رہا میری ساری توجہ مرشدِ کریم کی آمد پر تھی۔ میں سلسلہ عظیمیہ میں جنوری ۱۹۸۰ء سے وابستہ تھا مگر مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مدظلہ العالی سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ یہ خبر میرے لیے بہت بڑی خوشی کا باعث تھی۔ میں ۲۳ نومبر کے دن کا انتظار کرنے لگا۔ یہ دو دن میرے لیے پہاڑ تھے اور میری توجہ کا مرکز میرے مرشد کریم تھے۔ جب انسان کی توجہ خود سے ہٹتی ہے تب وہ دوسروں کو دیکھنا اور محسوس کرنا شروع کرتا ہے اور جب انسان اپنی ذات کے محدود حصار سے باہر نکل آتا ہے تب اس کو یہ دنیا ایک مختلف رنگ ایک بدلے ہوئے ڈھنگ اور ایک نئے زاویے سے نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ خط کے اندر ایک شخص کے گھر کا ٹیلی فون نمبر تھا۔ میں نے صبح دفتر جا کر سب سے پہلے کام یہ کیا کہ ان صاحب کے گھر فون کیا۔ وہاں پر ایک شخص نے بتایا کہ آپ ۲۳ نومبر کو رات ۱۰ بجے لاہور اسٹیشن پر پہنچ جائیں۔ میں آپ کو وہاں ملوں گا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ میں آپ کو کس طرح پہچان سکوں گا۔ انہوں نے فرمایا میرے ہاتھ میں ہار ہوں گے۔ چنانچہ ۲۳ نومبر کا دن تیاری کا دن تھا۔ شام کا کھانا کر میں اپنے

سکوٹر پر لاہور اسٹیشن پہنچا تو وہاں کا گھڑیال رات آٹھ بجے کا اشارہ دے رہا تھا۔ چنانچہ سکوٹر کو پارک کیا اور ریلوے اسٹیشن کی بتیوں کو دیکھتا ہوا اندر چلا گیا۔ چونکہ میرا تعلق لاہور سے تھا اور میرا خاندان ہزاروں سال سے لاہور میں قیام پذیر تھا لیکن میں اس شہر کا باسی ہونے کے باوجود اپنے ہی شہر میں ایک دیہاتی کی طرح بتیوں کو بڑے غور سے دیکھ کر خود ہی مسکرا رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ آج اتنی گہری، پر زور اور جاندار تھی کہ میں بے خود ہو گیا تھا اور اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ میرا دھیان میرے مرشدِ کریم کے انتظار میں تھا اور آج مجھے میری کوئی پریشانی، کوئی فکر، کوئی تھکن اور کوئی دفتری الجھن یاد نہیں تھی اور میری یہ مسکراہٹ ہونٹوں سے اتر کر اردگرد پھیلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اسٹیشن کے اندر اور باہر لوگوں کو آتا جاتا دیکھ رہا تھا۔ اور ان کے چہروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی کی آمد پر خوش ہیں اور کسی کے باہر جانے پر افسردہ ہیں۔ میں اسٹیشن پر گھوم رہا تھا اور پھر ایک کتابوں کے سٹال پر کھڑا ہو گیا اور دیر تک کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ آخر کار دوکاندار نے کہا کہ صاحب آپ نے کتاب تو خریدنی نہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا آپ پلیٹ فارم نمبر۴ یا نمبر۲ پر چلے جائیں۔ مجھے ایسا لگا کہ کوئی مجھے اپنی منزل کی یاددہانی کرا رہا ہے اور میری منزل مرشدِ کریم سے ملاقات تھی اس وقت رات کے دس بج چکے تھے اور میں اس شخص کو تلاش کر رہا تھا جس کو میری مراد کا پتہ تھا۔ مجھے اسٹیشن پر ایک آدمی نظر آیا جس کے ہاتھ میں چند ہار تھے۔ میں نے ان کو مؤدبانہ سلام کیا اور مرشد کریم کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں چوہدری صاحب کا ڈرائیور ہوں۔ یہ چوہدری صاحب ہیں۔ میں نے قبلہ محترم چوہدری جلال الدین عظیمی صاحب کو سلام عرض کیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ نے ٹیلی فون کیا تھا۔ میں نے اثبات میں سر کو ہلا دیا۔ بس ابھی گاڑی آنے والی ہے۔ انتظار کا ایک لمحہ بھی اس عاشق سے پوچھیں جو اپنے محبوب کے انتظار میں ہر لمحہ اپنے اندر سہانی یادوں کے سپنے سجا رہا ہوتا ہے۔ ہر بار گھڑی کی طرف نظر جاتی پھر آخر کار وہ لمحہ بھی آ گیا کہ سپیکر پر ٹرین کی آمد کا مژدہ سنایا گیا۔ آخر کار گاڑی فراواں پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور ہم چند لوگ جو گنتی میں صرف تین یا چار ہوں گے چوہدری صاحب کے پیچھے پیچھے ایک Air Condition ڈبہ میں داخل ہو گئے۔ چوہدری صاحب مرشدِ کریم کے گلے ملے اور وہ ان کو لے کر پلیٹ فارم سے باہر آ گئے اور اپنی گاڑی میں بیٹھنے لگے۔ میں لپک کر مرشد کریم کے پاس گیا اور ان کو سلام عرض کیا۔ جواب میں میرے مرشدِ کریم نے احوال پوچھا کہ چوہدری صاحب کے شوفر نے گاڑی چلا دی اور میں وہاں کھڑا رہ گیا اور گاڑی کو جاتا دیکھتا رہا۔ میری نگاہیں اس طرف جمی تھی جہاں گاڑی جا رہی تھی اور ذہن مرشدِ کریم کے نقوشِ پا کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ ذہن میں بار بار ایک ہی سوال پیدا ہو رہا تھا کہ مرشدِ کریم کا دیدار مکمل نہیں ہوا اور یہ کیسے لوگ ہیں جو پیاسے کو پانی

کی ایک بوند بھی سمندر سے نہیں لینے دیتے۔ میں نے اسی ذہنی کشمکش میں پارک والی جگہ سے سکوٹر لیا اور گھر آ گیا۔ آتے ہی گھر والوں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مگر میں کیا جواب دیتا۔ آ جا کر ان لوگوں کو برا بھلا کہتا رہا جنہوں نے مرشدِ کریم سے بات تک نہ کرنے دی۔ میں اسی حالت میں گھر سے نکلا اور مرشدِ کریم کی تلاش میں ماڈل ٹاؤن کی سڑکوں پر گھومنا شروع کر دیا۔ قبلہ محترم چوہدری صاحب نے ہمدرد کی فیکٹری کے پاس اپنے گھر کا پتہ بتایا تھا۔ اسی کو اپنی منزل سمجھ کر چلنا شروع کر دیا۔ رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور کتے مجھے دیکھ کر بھونکنے شروع ہو گئے تھے۔ آخر کار میں نے چوہدری صاحب کا گھر پا لیا اور گھنٹی بجا دی کافی دیر کے بعد ایک آدمی آیا اور کہا کہ حضور مرشدِ کریم سو چکے ہیں آپ صبح تشریف لائیں آپ میری کیفیت کا اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ میں کیا آپ کو بتاؤں۔

دوسرے دن صبح گیارہ بجے دوبارہ چوہدری صاحب کے گھر گئے۔ بہت لوگ وہاں پر مرشدِ کریم سے ملنے آئے تھے میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ مرشدِ کریم تشریف لائے۔ ہم سب کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ میں دو جہانوں کی خوشیاں تھی۔ بے خودی اور کیف کا ایک جذبہ تھا۔ اور میں خود ہی ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ پھر مرشدِ کریم نے نام پوچھا اور کام کی نوعیت پوچھی اور گھر کا پتہ پوچھا۔ میں نے عرض کیا حضور اگر مناسب سمجھیں تو میرے غریب خانہ جو مزنگ میں ہے۔ تشریف لائیں آپ نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا اور قبلہ محترم چوہدری صاحب نے حکم دیا کہ بڑی گاڑی لانا اور کل پانچ بجے شام ہم آپ کے گھر آئیں گے۔

دوسرے دن میں نے دفتر سے بڑی گاڑی لی اور چوہدری صاحب کے گھر آ گیا۔ ملاقات کرنے والوں کا ابھی تک رش تھا۔ ایک گھنٹہ کے بعد مرشدِ کریم بمعہ اپنے چند رفقاء کے گاڑی میں بیٹھے اور مزنگ کی طرف چل دیئے۔ میں مرشدِ کریم کو دیکھ رہا تھا اور دل میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ آج اس قطرے کو سمندر مل گیا جو اس کو تلاش کر رہا تھا۔ گھر آ گیا اور مرشدِ کریم اور ان کے رفقاء کو لے کر ڈرائینگ روم میں بیٹھا کر میں چائے وغیرہ لینے کے لیے اوپر چلا گیا۔ جلد چائے آ گئی۔ مرشدِ کریم نے نوش فرمائی میں نے عرض کیا حضور کھانا تیار ہے اگر حکم دیں تو لے آئیں۔ چوہدری صاحب فوراً بول اُٹھے کہ نہیں ہم نے کھانا کہیں اور کھانا ہے۔ میں چوہدری صاحب کے جواب میں پرنم آنکھوں سے مرشدِ کریم کو دیکھ رہا تھا کہ حضور نے فرما دیا کہ نہیں چوہدری صاحب میاں صاحب کے گھر تھوڑا سا کھا لیتے ہیں۔ میری خوشی کا کوئی کنارہ نہیں تھا کہ میرے

مراد نے میری آرزو قبول کر لی ہے۔ میں نے کھانا پیش کیا اور حضور نے کھانے کی تعریف کی اور سلمیٰ (میری بیوی) بھی بہت خوش ہوئی۔ کھانے کے بعد حضور نے گھر کا ایک ایک حصہ دیکھا اور پھر حکم دیا کہ آئندہ سے اس گھر میں محفلِ مراقبہ ہوا کرے گی۔ چنانچہ اگلی ہی اتوار کو لاہور کے اس بڑے شہر میں میرا گھر سلسلۂ عظیمیہ کا پہلا مراقبہ ہال بن گیا جہاں پر محفل مراقبہ ہر اتوار کو شام کے وقت ہوتی رہی اور یہ سلسلہ ۱۵ سال تک محیط رہا۔

(ماخوذ از ''میں اور میرا مرشد'')

☆......☆......☆

مراقبہ ہال مزنگ کے افتتاح پر خطاب

مرشدِ کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے ۱۹۸۱ء کو لاہور شہر کے مرکز، مزنگ میں مراقبہ ہال کا باقاعدہ افتتاح فرمایا۔ ۱۵۸۔ مین بازار مزنگ لاہور میں نگران مراقبہ ہال کے فرائض میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب کو تفویض کئے گئے۔ مراقبہ ہال کے افتتاح پر مرشدِ کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے مراقبہ اور اس کی اہمیت پر بصیرت افروز خطاب کیا۔

آخر میں پروگرام کی انتظامیہ جن میں جناب مقصود اختر عظیمی صاحب، رشید شاہین عظیمی صاحب و دیگر سلسلے کے اراکین شامل تھے اُن کی خدمات کو مرشدِ کریم نے بہت سراہا اور اپنے تاثرات بھی نوٹ فرمائے۔ پروگرام کے اختتام پر میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ مرشدِ کریم کی دعا کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ آخر میں مہمانوں کی اچھے انداز سے تواضع کی گئی۔

مرشدِ کریم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا!

"میرے عزیز دوستو!...... ساتھیو!...... جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ میں گزشتہ کئی سالوں سے مخلوقِ خدا کی خدمت میں معروف ہوں۔ میرے پیشِ نظر یہ مقصد تھا کہ لوگوں کو روحانی علوم سے آشنا کیا جائے۔ اس سلسلے کو جب عوام میں پذیرائی حاصل ہوئی تو میں نے روحانی علم کے فروغ کو اپنا مشن بنا لیا۔ میرا مشن یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ آپ سب ماشاء اللہ کھلے ذہن کے لوگ ہیں، یہ بات تو ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ ہم پیدا ہوتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں...... کیا انسان کی زندگی کا مقصد بس اتنا ہی ہے کہ وہ پیدا ہو، کھائے پیئے، شادی کرے، اُس کے بچے ہوں، وہ بچوں کی پرورش کرے اور بالآخر اس دنیا سے چلا جائے ...... یہ سارے اعمال تو دنیا میں حیوانات بھی پورے کرتے ہیں!......

انسان کی دنیا میں پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ انسان اللہ کو پہچانے، اُسے یہ ادراک حاصل ہو کہ میرا اللہ کے ساتھ رشتہ کیا ہے؟...... اور اس رشتے کو میں کس طرح اتنا مستحکم اور مضبوط کر سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے قریب ہو جائے

اور میں اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہو جاؤں؟......

اس مقصد کو تمام پیغمبران کرام علیہم السلام اور پیغمبروں کے وارث اولیاء اللہ نے انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ہمارا یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جسم اور روح میں جو رشتہ ہے وہ لازمی ہے۔ اگر انسان میں روح موجود ہے تو وہ زندہ ہے اور اگر روح نکل جائے تو اُسے مردہ کہا جاتا ہے۔ سائنسدان اس زمین کی عمر ساڑھے تین ارب سال بتاتے ہیں۔ اگر آپ اِس طویل عرصے کو کھنگالیں تو آپ کو ساڑھے تین ارب سالوں کے دوران تلاش کے باوجود بھی ایسی کوئی بات نہیں مل سکے گی کہ کبھی کسی مردہ آدمی یا عورت نے حرکت کی ہو...... کسی ماں سے پیدائش اُسی وقت ہو سکتی ہے جب اُس کے اندر روح موجود ہو...... آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی مردہ انسان کے حلق میں پانی اُنڈیلا جائے تو پانی کبھی بھی حلق سے نیچے نہیں اُترے گا...... اگر زندہ انسان کے سوئی چُبھ جائے تو اُس کی تکلیف کو دماغ فوراً محسوس کر لے گا...... لیکن ایک مردہ انسان جس کے اندر سے روح نکل چکی ہو، اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو اُس کے اندر کوئی مدافعت پیدا نہیں ہوتی......

آپ سب حضرات غور فرمائیں!...... کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کبھی کسی مردہ انسان نے صحافت کی ہو، خبریں بنائی ہوں، سرخی لگائی ہو...... کسی مردے سے کیا آپ ایسی کوئی توقع قائم کر سکتے ہیں؟......

اس مختصری تمہید سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہماری اصل روح ہے...... اور ہمارا گوشت پوست کا جسم روح کا میڈیم ہے...... دراصل ہم سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ ہم نے جسم کو اصل سمجھ لیا ہے اور روح کو نظر انداز کر دیا ہے...... جتنی بھی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ سب کی سب روح کی مرہونِ منت ہے اور روح سے ہی یہ صلاحیتیں جسم کو منتقل ہوتی ہیں...... روح کی یہ صلاحیتیں اگر جسم کو پوری طرح منتقل نہ ہوں تو ہم ایسے بندے کو پاگل، بدحواس یا بے شعور کہتے ہیں...... اگر اُس کے اندر روح سے منتقل ہونے والی صلاحیتیں صحیح طریقے سے کام کر رہی ہیں تو ہم ایسے فرد کو سائنٹسٹ یا جینئس کہتے ہیں۔

آپ کسی بھی طریقے سے جانچ پڑتال کر لیں...... آپ کو اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں ملے گا کہ اگر روح ہے تو جہان ہے اور روح نہیں ہے تو کچھ نہیں ہے۔ یہی انبیاء علیہم السلام اور اولیاءُ اللہ کی تعلیمات ہیں۔

ہم انبیاءؑ اور اولیاءِ کی تعلیمات سے روگردانی کے اس طرح مرتکب ہوئے ہیں کہ ہم نے اصل جسم یعنی روح

کو نظر انداز کر کے مفروضہ جسم یعنی گوشت پوست کے مادّی جسم کو اصل سمجھ لیا ہے۔

جب تک آپ روح سے واقفیت حاصل نہیں کریں گے آپ کو کبھی سکون نہیں ملے گا ... آج کے دور کا المیہ یہ ہے کہ آج کے انسان نے مادّی جسم کو ہی سب کچھ سمجھ لیا ہے...... آج کے ترقی یافتہ انسان نے ایجادات تو کر لی ہیں لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ اُسے ایجاد کا خیال ہی نہ آتا تو اُس سے یہ ایجاد کس طرح ہوتی؟...... مثلاً اگر یہ خیال ہی نہ آتا کہ آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جائے تو گراہم بیل اس سلسلے میں کبھی کوئی کوشش ہی نہیں کرتا اور ٹیلی فون ہرگز ایجاد نہ ہوتا ...... اسی طرح ایٹم بم ہے!...... کمپیوٹر ہے!...... یہ سب چیزیں صرف اس لئے ایجاد ہوئیں کہ موجد کو اس کے ایجاد کرنے کا خیال آیا ......

میرے مشن کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ جس طرح مرد کے اندر روح کام کر رہی ہے اسی طرح عورت کے اندر بھی روح کام کر رہی ہے۔ روحانی صلاحیتوں کے حوالے سے عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

'' مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، قرآن پڑھنے والے اور قرآن پڑھنے والیاں اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور خیرات دینے والے اور خیرت دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اور نگہبانی کرنے والے اپنی عصمت کے اور نگہبانی کرنے والیاں، اور یاد کرنے والے اللہ کو بہت اور یاد کرنے والیاں، تیار کیا ہے اللہ نے واسطے ان کے بخشش اور اجر بڑا۔''

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ایک مرد اگر روزہ رکھے گا تو اس کو ثواب زیادہ ملے گا اور ایک عورت اگر روزہ رکھے گی تو اُسے ثواب کم ملے گا ... کیا ایک مرد Ph.D کرتا ہے تو وہ Ph.D ہے اور اگر عورت Ph.D کرے کیا وہ آدھی Ph.D ہوگی؟............

ظاہر ہے ایسا نہیں ہوگا!.......... اللہ کے نزدیک عورت اور مرد برابر ہیں، بس اُن کی ڈیوٹیاں الگ الگ ہیں۔

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جو قوانین ہمیں عطا کیے تھے، ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا...... اور عورت کی صلاحیتوں کو دبا دیا ... اس طرح معاشرے میں ابتری پھیل گئی...... اور یوں معاشرے کا ایک بڑا اور اہم طبقہ جو معاشرے میں نہایت اہم اور بنیادی کردار ادا کر سکتا تھا اُس کے کردار کو محدود کر دیا گیا، چنانچہ معاشرے میں خرابیاں پیدا ہوتی گئیں...... معاشرے کی خرابیوں کو دور کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ خصوصاً ہم مرد حضرات اللہ اور اللہ کے

رسول ﷺ کے عطا کردہ حقوق کے تحت خواتین کو معاشرے میں عملی کردار ادا کرنے کے لئے آگے لائیں تا کہ اُن میں حوصلہ پیدا ہو اور اس حوصلے کے ساتھ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کو سمجھ کر وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مردوں کے شانہ بشانہ خدمت کریں۔

آج صورتحال یہ ہے کہ دنیا کا کوئی ایسا بڑا ادارہ نہیں جہاں خواتین اپنا کردار اچھے طریقے سے ادا نہ کر رہی ہوں...... اگر ہم اسی طرح اپنی بچیوں کو تعلیم دلاتے رہے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے رہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی طاقت پیدا ہو جائے گی۔ اس طاقت سے ہمارے معاشرے کی بھی اصلاح ہوگی اور ملک بھی ترقی کرے گا۔

میں آپ سب حضرات سے ایک دوست کی حیثیت سے، برادری کے ایک فرد کی حیثیت سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ آپ حضرات کو جب بھی موقع ملے آپ یہ کوشش کریں کہ انسان کو اُس کی اصل یعنی روح سے متعارف کرایا جائے......

اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو صلاحیتیں عطا کی ہیں ان کے تحت جب بھی موقع ملے تو آپ یہ ضرور اُجاگر کریں کہ انسان کا ماڈی وجود فانی اور عارضی ہے، اسے چلانے والی اور اس کی اصل روح ہے۔ جب تک ہم اپنی اصل یعنی روح سے واقف نہیں ہوں گے سکون حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے کہ ہمارا ماڈی وجود مفروضہ Fiction ہے اور Fiction کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ جو چیز گھٹنے، بڑھنے اور فنا ہو جانے والی ہو وہ کسی کے کام نہیں آسکتی......

دوستو!.......... میں نے عمر کا اتنا بڑا عرصہ گزارا۔ میری سمجھ میں تو یہی آیا کہ یہاں جو بھی چیز ہے وہ موت کے انتظار میں ہے۔ ہر انسان یہاں جو بھی کچھ جمع کر رہا ہے وہ یہیں چھوڑ کر جانے کے لئے جمع کر رہا ہے۔ آپ یہاں کتنے ہی وسائل اکٹھا کر لیں، لیکن ایک مقررہ وقت پر جب ملک الموت آجائے گا تو انسان اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جا سکے گا۔ اس مشاہدے سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اگر کسی شخص کی عمر ساٹھ سال کی ہے تو اس سے مُراد ہرگز یہ نہیں لی جاتی کہ وہ شخص مزید ساٹھ سال زندہ رہے گا...... اُس کی تو زندگی کے چند سال ہی باقی رہ گئے ہیں...... جس روز بچہ اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، اگر اُس کی عمر ۱۰۰ سال متعین کر دی جائے تو اس کا مطلب کیا ہوا؟...... کیا اُس کی عمر بڑھ رہی ہے...... یا گھٹ رہی ہے؟...... درحقیقت جب بچہ ایک سال کا ہو گیا تو اُس کی عمر کے ۹۹ سال باقی رہ گئے...... جب بچہ بارہ سال کا ہوا تو اُس کی عمر کے ۸۸ سال باقی رہ گئے...... اور آج کل یہ

حال ہے کہ اوسط عمر کم ہوتے ہوتے پچپن ساٹھ ہی رہ گئی .. اس سے زیادہ کوئی جیتا ہی نہیں...... ہمیں اس مختصر سے عرصے میں جتنے بھی معاملات ہیں وہ پورے کرنے ہیں، ان میں ہمیں دلچسپی بھی لینی ہے، اس لئے کہ اگر ہم دلچسپی نہیں لیں گے تو معاشرے میں ہمارا کوئی مقام نہیں بن سکے گا ..... ایک آدمی اچھے گھر میں رہتا ہے...... اُس کے پاس بہترین گاڑی ہے۔ اُس کی اچھے خاندان میں شادی ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت بھی کرتا ہے اور اُس کے بچوں کو معاشرے میں اعلیٰ مقام بھی حاصل ہو جاتا ہے ..... ایک آدمی وہ ہے جو یہ سب کچھ نہیں کرتا... دونوں کے درمیان فرق ظاہر ہے...

لیکن کیا انسان دنیا میں جو کچھ کر رہا ہے وہی زندگی کا مقصد ہے؟

اگر غیر جانبدار ہو کر تفکر کیا جائے تو اس کا ایک ہی جواب ملے گا کہ یہ زندگی کا مقصد نہیں ہے..... اس لئے کہ دنیا مسافر خانہ ہے اس مسافر خانے میں آدمی بے وقوفی بھی کرتا ہے اور اسی مسافر خانے میں آدمی تین مرلے کے گھر میں بھی رہتا ہے .... اور جب مسافت ختم ہو جاتی ہے تو آدمی بے وقوف ہوں یا عقل مند!..... سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دنیا سے رُخصت ہو جاتے ہیں...

آپ بھرپور جدوجہد کے ساتھ بھرپور زندگی گزاریئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ ہم یہاں مسافر کی حیثیت سے آئے ہیں۔ یہ ہمارا مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ اس مسافر خانے میں بھوک و افلاس کے ساتھ زندگی گزارو اگر کوئی یہ کہتا ہے تو سراسر غلط کہتا ہے۔ اس لئے کہ اگر افلاس اور فقر کی زندگی گزارنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہوتا تو کیا دنیا میں اتنی ترقی ہوتی؟..

اگر ہم اچھے لباس زیب تن نہیں کریں اور درخت کے پتوں سے تن کو ڈھانپ لیں یا کھدر پہن لیں تو کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح تو بڑی بڑی فیکٹریاں بند ہو جائیں گی ہزاروں لوگ بے روزگار ہو جائیں گے......

آپ اچھے کپڑے اس لئے پہنیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُس لباس کو آپ کے لئے بنایا ہے .... اچھے اور خوبصورت لباس کو پہن کر آپ خوش ہوں اور اللہ کا شکر ادا کریں .. اچھا اور بہترین لباس اس لئے زیب تن کریں کہ اس طرح آپ کے بھائیوں کو روزی ملے گی۔

حضور پاک ﷺ کا ارشاد عالی ہے:

"اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتْ"

''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔''

اگر ہم اپنی طرزِ فکر اس بات پر مستحکم کر لیں کہ یہ دنیا مسافر خانہ ہے...... پھر اگر اللہ ہمیں فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرائے تو ہم وہاں خوش ہو کر ٹھہریں اور اگر اللہ میاں چارپائی ہوٹل میں ٹھہرائیں تو وہاں بھی ہم خوشی خوشی ٹھہریں...... لیکن ہماری بھرپور کوشش اور جدوجہد یہی ہونی چاہیئے کہ فائیو اسٹار ہوٹل میں ہمارا قیام زیادہ سے زیادہ رہے۔

لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں موجود رہے کہ بندہ فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے یا جھونپڑی ہوٹل میں!...... دونوں ہی مسافر خانہ ہیں...... مستقل جائے قیام نہیں...... اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے''کُل نفسٍ ذائقة الموت.'' جو اس دنیا میں پیدا ہوگیا ہے، اُسے اس دنیا سے جانا بھی ہے......

موت یعنی انتقال سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ..... یہ اسی طرح ہے جیسے روزانہ آپ صبح دفتر جاتے ہیں اور شام کو دفتر سے گھر واپس آتے ہیں..... یہ آنا جانا تو زندگی کا معمول ہے ... جس طرح گھر، دفتر، اسکول، کالج، یونیورسٹی آنا جانا لگا رہتا ہے...... اسی طرح آپ دیکھئے کہ آپ کی جوانی آتی ہے اور چلی جاتی ہے.... بڑھاپا آتا ہے اور چلا جاتا ہے..... یہ آنا جانا تو زندگی کا ایسا معمول ہے کہ اس کے بغیر زندگی کی تکمیل ہی نہیں ہو سکتی...... ہمیں صرف اتنا سوچنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں کیوں بھیجا ہے؟ ...... اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرما دیا کہ ہم نے انسانوں اور جنات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ہمیں پہچانے، ہمارا عرفان حاصل کرے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ اقدس ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، تو میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کو پیدا کیا۔''

قرآن پاک میں بھی اسی طرف نشاندہی کی گئی ہے کہ اللہ تمہاری رگِ جاں سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ جب ہم سے اس قدر قریب ہے تو پھر وہ نظر کیوں نہیں آتا؟ ...... قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے...... وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ...... میں تو تمہارے اندر ہوں تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں؟ ...... ہم اللہ کو اس لئے نہیں دیکھتے کہ ہم اپنی اصل روح اور اپنے مفروضہ جسم کی حقیقت سے واقف ہی نہیں ہیں ... ہمارا جسم روح کے تابع ہے، روح جسم کے تابع نہیں ہے...... جب ہم روح کو پہچان لیں گے تو روح کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روح امرِ ربی ہے...... یعنی روح کا رابطہ اللہ سے قائم ہے چنانچہ روح کی پہچان کے بعد ہمارا رابطہ بھی اللہ سے قائم ہو جائے گا اور ہم اللہ کو دیکھ

بھی لیں گے۔

بندہ اگر اللہ کو دیکھنے کے قاعدے اور ضابطے پورے کر دے تو بندہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک بشر اللہ کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟ ازل میں اللہ تعالیٰ نے کُن کہا اور ساری کائنات بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' کہ میں تمہارا رب ہوں۔ روحوں نے یہ آواز سُنی، روحیں آواز کی طرف متوجہ ہوئیں تو اللہ کو دیکھا اور روحوں نے کہا قَالُوْ بَلٰی جی ہاں آپ ہمارے ربّ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانوں کی ارواح ازل میں اللہ کو دیکھ چکی ہیں اور اللہ کو دیکھنے کے بعد اللہ کی ربوبیت کا اقرار کر چکی ہیں۔ اب اگر ہم اپنی اصل یعنی روح سے واقفیت حاصل کر لیں تو بڑی آسانی سے اللہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

اللہ کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس بات سے واقف ہوں کہ ہمارا یہ جسمانی وجود انڈی پینڈنٹ نہیں ہے۔ یہ جسمانی وجود ایک روحانی وجود کا محتاج ہے۔ اس روحانی وجود کو روح کہتے ہیں۔ روح ازل میں اللہ کو دیکھ چکی ہے۔ اگر بندہ چاہے تو اللہ کے لئے کوشش کر کے، اللہ کے بتائے ہوئے ضابطوں اور قواعد پر عمل کر کے، رسول اللہ ﷺ کی طرزِ فکر اپنا کر اللہ کو دیکھ سکتا ہے اللہ سے باتیں کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے اور بات کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایسے روحانی اسکول تلاش کریں جہاں اللہ کو دیکھنے کے لئے اسباق پڑھائے جاتے ہیں، ایسے روحانی استاد کو تلاش کریں جن پر اللہ کا فضل اور رسول اللہ ﷺ کی رحمت ہو اور وہ یہ بات بتا سکتے ہوں کہ اللہ کو دیکھنے کا راستہ یہ یہ ہے۔

یہ وہ تعلیمات ہیں جو اولیاء اللہ اور صوفیاء حضرات اپنے شاگردوں کو دیتے ہیں۔ اب آپ یہ سوال کر سکتے ہیں کہ ان تعلیمات کا فائدہ کیا ہے۔ روحانیت سیکھ کر کسی کو ملازمت نہیں ملتی!...... نہ پیسے ملتے ہیں، نہ کاروبار ملتا ہے......تو اس علم کو ہم کیوں سیکھیں؟...... آج کل وہ علم سیکھے جاتے ہیں جس سے کوئی فائدہ ہو۔ لیکن یہاں ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم ملازمت کیوں کرتے ہیں؟......

آپ کا جواب یہی ہوگا کہ ملازمت اس لئے کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کو آرام ملے۔ مستقبل کے جو خوف اور اندیشے ہیں ان سے حفاظت ہو جائے۔ اگر ملازمت کے بعد زندگی میں سکون نہ ملے تو اس ملازمت کا کوئی فائدہ نہیں۔ اچھی ملازمت کے حصول سے آدمی ڈپریشن سے بچ جاتا ہے۔ بیمار بہت کم ہوتا ہے اُس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ اس کے دوست بہت ہوتے ہیں......

آپ سب میرے دوست ہیں۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں...... میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ روحانیت سیکھنے کے لئے یعنی اللہ سے اور اپنی رُوح سے واقف ہونے کے لئے بہترین اورآسان عمل مراقبہ ہے۔ مراقبہ میں آدمی اس دنیا سے اپنا دماغ ہٹا کر غیب کی طرف توجہ کرتا ہے۔ جب آدمی مراقبہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ خوش رہتا ہے۔ اس کے اندر سے نفرت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ہر آدمی کو خواہ وہ کسی بھی ملک کا ہو اُسے اپنا دوست سمجھتا ہے۔ اس کو پتہ چل جاتا ہے کہ ہم سب ایک آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ ہم سب بہن بھائی ہیں، بڑے ہمارے ماں باپ ہیں۔ چھوٹے ہمارے بچے ہیں۔ جو ہمارا دُکھ ہے وہ اُن کا دُکھ ہے، جو ہمارا پیار ہے وہ اُن کا پیار ہے۔ جس طرح دوسرے علوم سیکھنے کے لئے اُستاد کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مراقبہ سیکھنے کے لئے بھی اُستاد کی ضرورت ہے۔ ہم نے یہ مراقبہ ہال قائم کیا ہے۔ آپ سب یہاں مراقبہ سیکھ سکتے ہیں۔ یہ سینٹر ہم نے اس لئے کھولا ہے کہ ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ خوشی کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ لوگ بھی خوشی حاصل کریں۔ جس طرح ایک باپ اپنے بچوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اسی طرح میں بھی آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اصل خوشی اس وقت حاصل ہوگی جب آپ اللہ کو دیکھ لیں گے۔ بندہ اللہ کو مراقبہ کے ذریعے جلد دیکھ سکتا ہے۔

مراقبہ درحقیقت ایسے عمل کا نام ہے جس میں کوئی بندہ بیداری کی حالت میں رہ کر بھی اس عالم میں سفر کرتا ہے جس کو روحانی دنیا کہتے ہیں۔ روحانی دنیا میں داخل ہونے کے بعد بندہ اُس خصوصی تعلق سے واقف ہو جاتا ہے جو اللہ اور بندہ کے درمیان بحیثیت خالق اور مخلوق ہر لمحہ اور ہر آن موجود ہے۔

مراقبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ پہلی سنت ہے جس کے نتیجے میں حضرت جبرائیلؑ سے رسول اللہ ﷺ کی گفتگو ہوئی اور فخرِ موجودات سرکارِ دو عالم سیدنا حضور ﷺ پر قرآن نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے ربط کے لئے یہ ضروری ہے کہ فرد ذہنی مرکزیت کے قانون سے اچھی طرح واقف ہو اور جب کوئی بندہ اپنا ذہن تمام طرف سے ہٹا کر کسی ایک نکتہ پر مرکوز کرتا ہے تو یہی ذہنی مرکزیت بندے اور اللہ کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اپنی روح سے متعارف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ دنیاوی دلچسپیاں کم کر کے زیادہ سے زیادہ وقت ذہن کو اللہ کی طرف متوجہ رکھے۔ روحانیت میں کسی نکتے پر ذہنی ارتکاز کو مراقبہ کا نام دیا گیا ہے اور مراقبہ خود آگاہی اور روح کے عرفان کے لئے از حد ضروری ہے۔ جب بندہ روح کا عرفان

حاصل کرتا ہے تو اُس کا ربط اللہ سے قائم ہو جاتا ہے اور اُس کے اوپر سے مفروضہ حواس کی گرفت عارضی طور پر ٹوٹ جاتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا ہر اُمتی یہ جانتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے غارِ حرا میں طویل عرصے تک عبادت وریاضت کی ہے۔ دنیاوی معاملات سے عارضی طور پر رشتہ منقطع کر کے یکسوئی کے ساتھ کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا مراقبہ ہے......

مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس میں روحانی اُستاد کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ سالک یا روحانی شاگرد کے اندر اگر تعمیل کا جذبہ نہیں ہے تو مراقبے کا عمل پورا نہیں ہوتا۔ مراقبہ میں کامیابی اور مراقبہ کا صحیح نتیجہ حاصل کرنے کے لئے خود سپردگی ضروری ہے۔ مراقبے کے ذریعے انسان عالمِ ظاہری کی طرح عالمِ باطن کی دنیا سے روشناس ہوتا ہے۔ جب سالک غیب کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ عالمِ ناسوت کی زندگی اور زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کی خاطر غیب کی دنیا میں نظامِ شمسی اور بے شمار افلاک کو دیکھتا ہے۔ صاحبِ مراقبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی ایسے گوشے میں بیٹھ جائے جہاں زیادہ شور وغل نہ ہو اندھیرا ہو، اور یہ تصور کیا جائے کہ مجھے اللہ دیکھ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ تصور اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ بندہ اپنی زندگی کے ہر عمل اور ہر حرکت میں یہ دیکھنے لگتا ہے کہ اُسے اللہ دیکھ رہا ہے۔ مراقبہ کی یہی کیفیت مرتبۂ احسان کا ایک درجہ ہے جب کوئی بندہ اس کیفیت کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے تو اُس کے اوپر غیب کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

چنانچہ آپ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کو جاننے کے لئے، اللہ تعالیٰ کی پہچان کرنے کے لئے، اللہ تعالیٰ کی صفات کو کائنات میں جاری وساری دیکھنے کے لئے اور سرورِ کائنات فخرِ موجودات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلبی و باطنی تعارف حاصل کرنے کے لئے، اپنی روح سے واقف ہوں، روح سے واقف ہونا مشکل نہیں ہے مگر اس کے لئے تھوڑی سی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ کچھ خرچ کریں گے تو کچھ حاصل ہوگا کے اصول کے مطابق روح سے واقفیت کے لئے تھوڑا سا وقت دیں۔ اور جتنا بھی وقت دیں پورے خلوص محنت اور یکسوئی سے دیں۔ انشاء اللہ آپ اپنی روح سے واقف ہو جائیں گے۔ روح سے واقفیت کا آسان طریقہ میں بتا چکا ہوں کہ مراقبہ ہے۔ مراقبہ کیجئے۔ جب بھی وقت ملے مراقبہ میں بیٹھ جائیں۔ سب سے پہلے آپ کو سکون حاصل ہوگا جو کہ سیڑھی با سیڑھی عرفانِ ذاتِ الٰہیہ پر ختم ہو جائے گا۔ یہی سلسلہ عظیمیہ کا پیغام ہے۔

میری آپ سب بہن بھائیوں، بزرگوں اور بچوں سے درخواست ہے کہ آپ سب لوگ مراقبہ ہال مزنگ تشریف لائیں اور اپنے ساتھ اپنے بیوی بچوں کو بھی لے کر آئیں۔ انشاء اللہ رسول اللہؐ کی طرزِ فکر اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کے لئے یہ جگہ آپ سب کے لئے بہترین معاون ثابت ہوگی۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے۔ میری دعا ہے کہ آپ اپنی روح سے واقف ہو کر اللہ تعالیٰ سے واقف ہوں اور دوسروں کو بھی ان تعلیمات سے آگاہ کرتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

السلام وعلیکم!

مرشد کریم کی مراقبہ ہال مزنگ لاہور میں پہلی آمد پر مرشد کریم، حکیم نورِ عجم عظیمی اور میاں مشتاق احمد عظیمی

مرشد کریم کی مراقبہ ہال مزنگ لاہور میں پہلی آمد پر مرشد کریم، حکیم نورِ عجم عظیمی اور میاں مشتاق احمد عظیمی

محمد حسین میموریل ہال مزنگ میں عظیمی صاحب کا خطاب

۱۳ مارچ ۱۹۸۲ء بروز اتوار مراقبہ ہال مزنگ لاہور کے ساتھ واقع محمد حسین میموریل ہال سے مرشدِ کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے خطاب کیا۔ اس ہال میں سلسلہ عظیمیہ کے اراکین اور شہر کے معززین کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مرشد کریم عظیمی صاحب کا ہال میں پرتپاک استقبال کیا گیا۔ میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے مقصود اختر عظیمی، محمد اسلم عظیمی، رشید شاہین عظیمی اور محترمہ سلمٰی مشتاق عظیمی صاحبہ کے ہمراہ ایک ٹیم ورک کے تحت پروگرام کو بہترین انداز سے پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مرشد کریم کے فکر انگیز خطاب کے بعد میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے تمام مہمان خواتین وحضرات اور انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔

مرشدِ کریم نے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد خطاب کا آغاز یوں کیا۔

''معزز حضرات وخواتین اور میرے عزیز فرزند میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب!

آپ سب حضرات بلاشبہ شکریے کے مستحق ہیں کہ آپ نے رسول اللہؐ کے مشن کی پیش رفت میں جدوجہد اور سعی کرنے کی سعادت حاصل کی۔''

سلسلے آج سے نہیں صدیوں سے قائم ہیں۔ مشہور سلاسل جو ہندوستان، پاکستان اور برصغیر میں پوری آب و تاب کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی مشن کو عام کرنے میں مصروف ہیں وہ سلسلۂ چشتیہ، سلسلہ نقشبندیہ، سہروردیہ اور قادریہ ہیں۔ یہ ایسے سلسلے ہیں کہ جن سے ہر آدمی جو ذرا سا بھی روح سے مانوس ہے ان کو جانتا ہے، پہچانتا ہے۔

دنیا میں روحانی علوم کو پھیلانے کیلئے اب تک جو سلسلے تواریخ میں ملتے ہیں ان کی تعداد تقریباً دوسو (۲۰۰) ہے۔

یہ دوسو (۲۰۰) سلاسل مختلف ممالک میں اپنے اپنے مرکز کے ساتھ قائم رہ کر رسول اللہؐ کے مشن کے لئے کوشش اور جدوجہد کر رہے ہیں۔

''سوال یہ ہے کہ جب ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے، شریعت کے تمام قوانین ہمارے پاس موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبیین کی ذاتِ اقدس ہمارے پاس موجود ہے پھر یہ تمام سلاسل کیوں وجود میں آئے، ان کی کیوں ضرورت پیش آئی؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صحابہ کرامؓ کی زندگی کے اوپر جب غور وفکر کیا جاتا ہے تو ایک بات پورے یقین کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ صحابہ کرامؓ کی زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے اس طرح وابستہ تھی کہ اُن کا جینا، اُن کا مرنا، اُن کا بیٹھنا، اُن کا اُٹھنا، ان کا کوئی بھی کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوتا تھا، حضور پاکؐ نے پانی کس طرح پیا، اخلاق کا مظاہرہ کس طرح فرمایا، مہمانوں کی میزبانی کس طرح کی، دوستوں کے ساتھ اُن کا رویہ کیسا رہا، دشمنوں نے جب دشمنی کی اور اذیت کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا کہ جس سے حضور پاکؐ دوچار نہ ہوئے ہوں، وہ اذیتیں، وہ تکلیفیں، وہ پریشانیاں برداشت کرکے دشمنوں کے ساتھ حضور پاکؐ کا کیسا سلوک رہا، کس طرح حضور پاکؐ نے لوگوں کو معاف کیا، لوگوں کو سینے سے لگایا، قتل جیسے جُرم کو معاف فرمایا۔

یہ سب چیزیں صحابہ کرامؓ کے سامنے تھیں۔ ان کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے الگ ہوکر کسی گوشے میں بیٹھ کر ریاضت اور مجاہدہ کریں اور رسول اللہؐ کی تعلیمات کو الگ سے سمجھیں۔ اُن کی ساری زندگی کا محور اور مرکز رسولِ پاکؐ تھے صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین کا دور آیا۔ تابعین کی زندگی پر جب ہم غور وفکر کرتے ہیں اور تاریخ پڑھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ تابعین نے رسولِ پاکؐ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ کی زندگی کا تجزیہ کرکے پوری کی پوری زندگی صحابہ کرامؓ کے مطابق گزار دی۔ تابعین میں وہ بات نہیں رہی جو بات صحابہ کرامؓ میں تھی۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی اگر سو فیصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز فکر کے مطابق تھی تو تابعین کی زندگی میں وہ (Percentage) کم ہوگیا۔ اس کی بہت ساری وجوہات بھی ہیں وہ یہ، ایک تو حضور پاکؐ کی جو حیاتِ مبارکہ کا زمانہ تھا اس میں دوری واقع ہوئی پھر صحابہ کرامؓ بہر حال کچھ بھی ہو وہ رسول اللہؐ کے قائم مقام تو تھے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہؐ کی زندگی اُن کے اندر اس طرح تھی کہ وہ حضورؐ ہی تھے۔ (نعوذ باللہ)''

تابعین کے بعد تبع تابعین آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرز فکر میں اور دوری واقع ہوئی اور اس کے بعد مسلمان امت مسلمہ یا عالم اسلام کے پاس جو مذہب یا اسلام رہا اس مذہب یا اسلام میں تو کوئی فرق نہیں پڑا،

قرآن بھی وہی رہا، قرآن کے الفاظ بھی وہی رہے، نماز بھی وہی رہی جو آج تک ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ کسی بھی چیز میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن تبع تابعین کے بعد جب آپ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرینگے تو یہ بات آپ کو نظر آئے گی کہ مسلمانوں میں ایسا انحطاط پیدا ہوگیا کہ اُن کی نظر روحانیت کے مقابلے میں مادیت میں زیادہ ہوگئی اور اسلامی ارکان کی جو حکمت تھی، اسلامی ارکان میں جو روح تھی اُس رُوح سے دوری واقع ہوگئی۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام جو ایک جسم تھا وہ جسم رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بتائی ہوئی تعلیمات کے مطابق رُوح سے دور ہوگیا اور اُس کے اوپر مادیت غالب آ گئی، بادشاہتیں آ گئیں، خُلفاء کا زمانہ آ گیا، غربت اور امیری کی دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ یعنی رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں جو اسلامی معاشرہ تھا وہ پوری طرح قائم نہیں رہا۔ پھر بادشاہوں کا زمانہ آ گیا۔ بادشاہوں نے اپنی مصلحتوں کے مطابق اپنی حکومت کو بچانے کیلئے ایسی ایسی اختراعات کیں کہ جس سے اسلام کی رُوح کے اوپر ایک پردہ آ گیا۔''

''ایک وقت ایسا آیا کہ انسان سب کچھ کرنے کے باوجود، مسلمان سب کچھ کرنے کے باوجود، جسمانی تقاضے تو اس نے پورے کئے لیکن رُوح کا تقاضا پورا نہیں ہوا، وہ آج بھی ہے۔ مثلاً ہم نماز قائم کرتے ہیں۔ عشاء کی نماز میں سترہ رکعتیں ہوتی ہیں اور چونتیس (۳۴) سجدے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو توفیق دی ہے نماز قائم کرنے کی وہ چونتیس (۳۴) سجدوں میں سے ایک سجدے میں بھی اُن کا ذہن اللہ کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ نماز میں کوئی تبدیلی ہوگئی یا نماز میں کوئی فرق واقع ہوگیا ہے۔ نماز تو وہی ہے لیکن مسلمان روح سے دور ہوگیا اس لئے اس کی ذہنی مرکزیت غیب کے اندر نہیں ہوتی۔

اِسی سے ملتی جلتی صورت جب تبع تابعین کے زمانے میں ہوئی اور بڑے پیر صاحب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے جب محسوس کیا کہ اگر انسانوں کے لئے خصوصاً مسلمانوں کیلئے روح سے واقف ہونے کے لئے، روح سے متعارف ہونے کے لئے قاعدے اور ضابطے مقرر نہیں کئے گئے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ مسلمان روح سے بالکل ہی دور ہو جائیں گے۔

لٰہذا انہوں نے اس صورتحال (Situation) کو سمجھتے ہوئے ایسے اسباق متعین کئے، ایسے قاعدے اور ضابطے بنائے کہ جن قاعدوں اور ضابطوں سے مسلمان مادی عبادت کے ساتھ ساتھ اپنی روحانیت سے بھی قریب ہو سکتا ہے۔ اس قربت کیلئے جو چیز بڑی اہم تھی ظاہر ہے کہ قرآن پاک تھا، حضور پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی تھی۔ تو وہاں یہ

دیکھا گیا کہ نبوت سے پہلے رسول اللہؐ نے کون سا ایسا عمل کیا، کون سی ایسی مثال چھوڑی اپنی اُمت کے لئے کہ جس کو بنیاد بنا کر روحانی اسباق تجویز کئے جائیں۔ تو سامنے یہ بات نظر آئی کہ رسول اللہؐ مکے میں رہتے ہوئے، بیت اللہ شریف کے ہوتے ہوئے سات آٹھ کلومیٹر دور پہاڑ پر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں اللہ کے اوپر، اللہ کی نشانیوں کے اوپر، کائنات کے اوپر غور وفکر کرتے تھے۔ یہ تفکّر جب بڑے پیر صاحب کے سامنے اور دوسرے بزرگوں کے سامنے پھیلا تو انہوں نے بنیاد ہی اس بات پر رکھی کہ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ قرآن پڑھنے کے ساتھ ساتھ غور وفکر کی بھی چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرماتے ہیں۔

تَفَكَّرُوْنَ، تَعْقِلُوْنَ ، تَعْلَمُوْنَ، يَعْلَمُوْنَ ، يَا اُولِي الْاَلْبَاب، فَبِاَيِّ اٰلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ

غور وفکر کرو، عقل سے کام لو، جو لوگ عقلمند ہیں وہ اللہ کی نشانیوں پر غور وفکر کرتے ہیں، قرآن کو سمجھ کر پڑھو، موت وحیات کے بارے میں غور وفکر کرو کہ جب تم پیدا نہیں ہوئے تھے تو کہاں تھے؟ کیوں پیدا ہوئے اس زمین کے اوپر؟ اور پیدا ہونے کے بعد تم مرنا نہیں چاہتے تو مر کیوں جاتے ہو؟ قرآن پاک میں بھی غور وفکر کا حکم ہے اور سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غارِ حرا میں جا کر انہی باتوں پر غور وفکر کیا۔ اسی غور وفکر کا نام مراقبہ ہے۔"

☆ مراقبہ کا مطلب ہے اللہ کی نشانیوں میں تفکر کرنا۔

☆ مراقبہ کا مطلب ہے مادی جزیات واحساسات سے نکل کر رُوح کا کھوج لگانا۔

☆ مراقبہ کا مطلب ہے ظاہری دنیا میں رہتے ہوئے غیب کی دنیا میں داخل ہونے کی جدوجہد اور کوشش کرنا۔

☆ مراقبہ کا مطلب ہے انسان اس زندگی سے واقفیت حاصل کرلے جہاں وہ پیدا ہونے سے پہلے تھا۔

☆ مراقبہ کا مطلب ہے انسان اُس زندگی سے واقف ہو جائے کہ جس زندگی میں اِس کو مرنے کے بعد دوبارہ واپس جانا ہے اور وہاں زندہ رہنا ہے۔

حضور پاک کا ارشاد ہے۔ "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْتَ مُوْتُو" ترجمہ: (مرجاؤ مرنے سے پہلے)

"مرجاؤ مرنے سے پہلے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ خودکشی کرلیں، خودکشی تو حرام ہے۔ "مرجاؤ مرنے سے پہلے" کا مطلب یہ ہے کہ مرنے سے پہلے اِس عالم میں مرنے کا بعد جہاں آپ کو رہنا ہے اس سے آپ واقفیت حاصل کرلیں۔

''اِن احادیث کی روشنی میں، قرآن پاک کے تدبّر و تفکر کے حکم کی روشنی میں اور سیّدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے غارِ حرا کے مراقبے کی روشنی میں ایسے اسباق تجویز کیے گئے کہ انسان بالعموم اور مسلمان بالخصوص اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا تعارف حاصل کرے، اپنا تعارف حاصل کرے جو کہ انسان کی پیدائش کا مقصد ہے۔''

''وَمَا خَلَقْنَا الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے جنات کو اور انسان کو اس لئے تخلیق کیا تاکہ وہ ہمیں پہچانیں۔ انسان اور جنات کی تخلیق کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ کو پہچانے۔

حدیث قدسی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میرا دل چاہا کہ مخلوق مجھ سے واقف ہو، مخلوق مجھے پہچانے، مخلوق میرے قریب آئے تو میں نے اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے محبت کے ساتھ مخلوق کو تخلیق کیا۔''

انسان کی زندگی کا مقصد اگر کھانا پینا، سونا جاگنا، بچوں کی پرورش کرنا، کاروبار کرنا ہی ہے تو یہ تو سب جانور بھی کرتے ہیں حیوانات بھی کرتے ہیں۔ کون سا ایسا جانور ہے جو اپنے بچوں کو پیدا کر کے ان کو غذا فراہم نہیں کرتا، ان کی تربیت نہیں کرتا۔ کون سا ایسا حیوان ہے۔ جو سوتا نہیں ہے۔ کون سا ایسا حیوان ہے جسے بھوک نہیں لگتی۔ گرمی سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ کون سا ایسا پرندہ ہے جو اپنا گھر نہیں بناتا۔ کون سی ایسی گائے، بھینس، بیل، بکری، بھیڑ ہے جس کو اپنے گھر کا پتہ نہیں ہوتا۔ بتایئے! سب کو اپنے گھر کا ٹھکانے کا پتہ ہوتا ہے۔ صبح کو آپ چھوڑتے ہیں شام کو خود بخود اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتے ہیں۔ تو انسان کی زندگی کا مقصد محض سونا جاگنا، کھانا پینا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ کو پہچاننا، بحیثیت مخلوق کے خالق کا تعارف حاصل کرنا ہے۔

جب یہ مقصد فوت ہوگیا تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بڑے پیر صاحب نے سلسلے کی بنیاد رکھی اور لوگوں کیلئے ریاضت کے، عرفان کے، روحانی علوم کو سیکھنے کے قاعدے اور ضابطے بنائے اور اسی طرح ہر ملک کے لحاظ سے، لوگوں کی ذہنی صلاحیت کے مطابق نئے نئے سلسلے قائم ہوتے رہے۔ لیکن! اِن سب سلسلوں کا محور قرآنی تعلیمات کے علاوہ کبھی اور کچھ نہیں رہا اور ان سلسلوں کا محور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ہٹ کر بھی کچھ نہیں رہا۔

دوسو(۲۰۰) سلسلے قائم ہونے کے بعد ایک وقت پھر ایسا آ گیا کہ امتِ مسلمہ مادیت کی دوڑ میں داخل ہوگئی۔ جیسے اب دیکھئے آج کا دور ہے۔ آج کا دور مادیت کا دور کہلاتا ہے۔ ترقی کا مطلب ہی یہ ہے کہ مادیت کا دور۔ یعنی مادے نے کتنی ترقی کی جب ہم یہ کہتے ہیں کہ آج کا دور ترقی کا دور ہے تو ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ مادے نے اتنی ترقی کر لی۔ لیکن جیسے جیسے مادی ترقی ہوئی اسی مناسبت سے انسان اپنی روح سے بھی دور ہوگیا، روحانی علوم سے بھی آشنا نہیں رہا، بے سکون ہوگیا، پریشان ہوگیا، عدم تحفظ اس کے اندر داخل ہوگیا۔

اگر ہم یہ غور کریں کہ انسان اور حیوان کی زندگی کیا ہے؟ اس کا تجزیہ کریں تو اِس مادی دور میں یہ بات بالکل واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ حیوانات کی زندگی آج کے دور کے انسان کی زندگی سے زیادہ افضل اور بہتر ہے۔ وہ بھی اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں اور انسان بھی اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا کہ کسی بھیڑ کو کینسر ہوگیا، کسی گائے کی آنکھ میں موتیا اُتر آیا، کسی جانور کوٹی بی ہوگئی۔ کبھی نہیں ایسا ہوا۔ اُن کو آپ پرسکون بھی دیکھتے ہیں۔ کبھی آپ نے انہیں دیکھا نہیں ہوگا کہ روزی کمانے کیلئے اتنے پریشان ہیں کہ راتوں کی نیند اُڑگئی، دن کا چین ختم ہوگیا۔

تو اس ترقی یافتہ دور میں انسان اس بری طرح دنیا میں غرق ہوگیا کہ ایسا لگتا ہے کہ کہیں روحانیت کا وجود ہی نہیں رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ذہنی ترقی ہوئی عقل وشعور میں اضافہ ہوا۔ آج کے آٹھ سال کا بچہ پہلے دور کے اٹھارہ سال کے نوجوانوں سے زیادہ ذہین اور ہوشیار ہے۔ نئی نئی چیزیں ایجاد ہوئی ہیں اور یہ ذہنی ترقی ہوئی ہے۔

تو بڑے پیر صاحب نے اپنے دور کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو، روحانی تعلیمات کو، اللہ سے قریب ہونے والی تعلیمات کو اس طرح مرتب کیا، اس طرح تدوین دیا کہ اس زمانے میں لوگ اللہ کے عارف ہوئے۔

اب اس زمانے میں جبکہ ذہن بہت ترقی یافتہ ہوگیا ہے پہلے جو چیزیں ہمارے لئے کرامت سمجھی جاتی تھیں اب عام ہوگئیں ہیں۔ تو زمانے کے مطابق، زمانے کی نشوونما کے مطابق، لوگوں کے شعور کے مطابق، اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق جس کے بارے میں ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اللہ نے جو ایک نظام مرتب کر دیا ہے، جو ایک سسٹم بنادیا ہے اس سسٹم میں تبدیلی نہیں ہوتی۔''

تو ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کا آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ایک سسٹم ہے۔ رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں تو کیا یہ سسٹم ختم ہوگیا نہیں یہ سسٹم ختم نہیں ہوا۔ رسول اللہؐ کے بعد رسول اللہؐ کے وارث علماء حق آتے رہے ہیں اور آتے رہیں گے۔

اس لئے اس مشن کو قائم رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ کو اس دنیا میں بھیجا اور انہوں نے معاشرے کی بدترین حالت کو سامنے رکھ کر مادی اعتبار سے دُنیا کو اسفل السافلین میں گرتے ہوئے دیکھ کر، زمانے کے حساب سے شعور کے اعتبار سے، ذہانت کے اعتبار سے، عقل وفہم کے اعتبار سے، جو شعور انسان کو اس وقت حاضر مل گیا اُس کے حساب سے سلسلۂ عظیمیہ کی بنیاد رکھی۔

سلسلہ عظیمیہ کوئی نیا سلسلہ نہیں ہے کہ یہ سلسلہ کوئی نئی بات کہتا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے بات وہی کہہ رہا ہے جو بڑے پیر صاحبؒ نے کہی، بات وہی کہہ رہا ہے جو شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے کہی۔ سلسلہ عظیمیہ بات وہی کہہ رہا ہے جو حضرت ممشاد دینوریؒ نے کہی۔ سلسلہ عظیمیہ بات وہی دہرا رہا ہے جو دوسو (۲۰۰) سلسلے اب تک دہراتے چلے آرہے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ ''انسان کا مقصد اس کے علاوہ ہرگز کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنے اللہ کا تعارف حاصل کرلے۔'' انسان کی زندگی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ غمگین رہے، پریشان رہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد جو ہے سکون سے رہنا ہے خوش رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ:

''اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ''O

ترجمہ: ''اللہ کے دوستوں کو غم اور خوف نہیں ہوتا۔''

اللہ کے دوستوں کو غم اور خوف نہیں ہوتا کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی میرا بندہ ناخوش نہ رہے۔ غمگین نہ رہے، پریشان نہ رہے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے سائنسی علوم کو سامنے رکھ کر سلسلہ عظیمیہ کی بنیاد رکھی کہ انسان کا ذہن چونکہ سائنسی علوم سے بہت زیادہ تیز ہوگیا ہے۔ وقت جو ہے بہت سمٹ گیا ہے، رفتار تیز ہوگئی ہے اس لئے اسی مناسبت سے سائنسی علوم کو سامنے رکھ کر سلسلہ عظیمیہ کے اسباق مرتب کئے گئے ہیں۔ لیکن اس ترتیب میں بنیادی بات وہی ہے غارِ حرا کا مراقبہ۔

ہر سلسلے میں کسی نہ کسی طرح آپ کو مراقبہ کا عنصر ضرور ملے گا۔ مراقبہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیاوی علائق

سے، دنیاوی معاملات سے، دنیاوی پریشانیوں سے اپنا ذہن ہٹا کر کچھ عرصہ کے لئے، ۱۰ منٹ کے لئے ۱۵ یا ۲۰ منٹ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے لیکن ہم یہ دیکھ نہیں رہے کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ بات اس میں کوئی زیادہ گہرائی کی نہیں ہے۔ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے، اللہ حاضر اور ناظر ہے۔ کیوں بھئی کسی آدمی کا یہ یقین ہے کہ اللہ ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ ہم اللہ کے دیکھنے کو نہیں دیکھ رہے۔ اللہ کے دیکھنے کو دیکھنے کے لئے جو بہت ہی آسان طریقہ ہے وہ مراقبہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا۔

یہ تو ہوئی ایک بات، اب دوسری بات جو ہے بہت زیادہ غور طلب ہے اور ہم سب کو اس پر بہت ہی زیادہ غور وفکر کرنا چاہیے اور وہ بات یہ ہے کہ ہمارا ایک جسمانی وجود ہے۔ اس جسمانی وجود کی مشینری پر اگر آپ غور کریں تو اس میں دل بھی ہے، پھیپھڑے بھی ہیں، گردے بھی ہیں، آنتیں بھی ہیں، دماغ بھی ہے، آنکھیں بھی ہیں اور کان بھی ہیں۔ یہ مشینری اُسی وقت تک چلتی ہے جب تک رُوح اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ لیکن اگر روح اس جسم سے اپنا رشتہ منقطع کرلے تو اس کے باوجود کہ دل بھی ہے، پھیپھڑے بھی ہیں، دماغ بھی ہے، کان بھی ہیں، آنکھ بھی ہے۔ اور آنتیں بھی ہیں جسم میں کوئی حرکت نہیں رہتی۔

آپ روز دیکھتے ہیں کوئی نہ کوئی تو مرتا ہی رہتا ہے۔ لاش پڑی ہوئی ہے اُس کے ہاتھ پیر، ناک، کان اور آنکھ سبھی کچھ ہے۔

اس کا پوسٹ مارٹم کریں دل بھی اُسی طرح موجود ہوگا۔ ایسے نہیں ہوگا کہ آدمی مرگیا تو دل غائب ہوگیا، آدمی مرے گا تو اُس کے اندر سے گردے ہی نہیں نکلے، آدمی مرگیا اس کی چیر پھاڑ کی پتہ چلا اس کے اندر تو آنتیں ہی نہیں تھیں۔ ہر چیز موجود ہے لیکن حرکت نہیں ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ وہ یہ کہ حرکت تابع ہے رُوح کے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسم اصل نہیں ہے اصل رُوح ہے۔ جب تک روح جسم کے اندر ہے حرکت ہے۔ جب تک روح جسم کے اندر ہے آپ کو بھوک بھی لگ رہی ہے آپ کو پیاس بھی لگ رہی ہے، آپ کے بچے بھی ہورہے ہیں، آپ بچوں کو دودھ بھی پلا رہے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے دیکھا ہے کہ کسی مُردہ ماں نے اپنے بچے کو دودھ پلایا ہو؟ کیا کبھی کسی نے دیکھا ہے کہ باپ مرگیا ہو اور اس نے بچے کی اُنگلی پکڑ کے بازار سے جا کر کوئی چیز دلائی ہو؟ کیا کبھی کسی مردہ آدمی کو آپ نے کھانا کھاتے، پانی پیتے، چائے پیتے، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے دیکھا ہے؟

ایک مُردہ جسم ہے، اگر آپ کسی مُردہ جسم اور زندہ جسم کا موازنہ کرنا چاہیں تو ایک زندہ آدمی کے پیر کے انگوٹھے میں سوئی چبھوئیں۔ کیا ہوگا؟ تکلیف ہوگی بھئی۔ وہ کہے گا بھئی کیوں میرے سوئی چبھوئی؟ اور ایک مردہ آدمی کی ٹانگ لے کر آپ اس کے گنڈاسے سے دس ٹکڑے کر دیں۔ کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں تو اصل چیز کیا ہوئی؟ اصل چیز جسم ہوا یا رُوح ہوئی؟ ''اصل چیز رُوح ہوئی۔'' تو اب جو اصل ہے وہ تو ہماری رُوح ہے اور ہم جسموں کو ہی سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے زیادہ بیوقوف، ہم سے زیادہ جاہل، ہم سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہے۔ آپ کسی بھی طرح زندگی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھیے اگر رُوح نے جسم کو سنبھالا ہوا ہے تو جسم کے اندر حرکت ہے اور اگر رُوح نے جسم کو نہیں سنبھالا ہوا ہے تو جسم کی کوئی حرکت نہیں ہے۔

ایک آدمی بہت جینئس ہے۔ نئی نئی اختراعات کرتا ہے لیکن اگر اُس کے اندر سے آپ رُوح نکال لیں۔ تو نہ کوئی اختراعات ہے نہ کوئی اس میں ایجاد ہے، نہ کوئی عقل ہے، نہ کوئی شعور ہے۔ ایک شاعر شعر کہتا ہے۔ کیا کبھی کسی مردہ آدمی سے آپ نے شعر سُنا ہے؟ ایک بڑھئی چارپائی بناتا ہے، کُرسی بناتا ہے، لوہار دروازہ بناتا ہے، کسان کھیتی باڑی کرتا ہے۔ کیا کبھی کسی مُردہ آدمی کو آپ نے چارپائی بناتے، دروازہ بناتے یا کھیتی باڑی کرتے دیکھا ہے؟

یعنی جس طرح بھی آپ زندگی کی چھان پھٹک کریں گے آپ کو ایک ہی بات نظر آئے گی کہ ''اگر رُوح ہے تو سب کچھ ہے اور اگر رُوح نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' لیکن اس وقت صورتحال یہ ہے کہ آدمی یہ کہتا ہے کہ جسم ہے تو سب کچھ ہے رُوح کا کسی کو پتہ ہی نہیں ہے۔ جو سراسر دھوکا ہے، فریب ہے، غلطی ہے، جہالت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''انسان ظالم، جاہل اور جلد باز ہے۔''

''جتنے بھی سلاسل ہیں، ان سلاسل کی تعلیمات کا محور، ان تمام سلاسل کی تعلیمات کا مرکز، ان تمام سلاسل کی تعلیمات کی بنیاد صرف یہ ہے کہ ''انسان روح کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ جب تک روح ہے انسان ہے اور جب رُوح نہیں ہے تو اُس کا نام انسان نہیں ہوتا اُس کا نام لاش ہوتا ہے، اُس کا نام (Dead Body) ہوتا ہے۔ اُس کا نام مُردہ جسم ہوتا ہے۔'' یہ جو تعلیم ہے کہ انسان رُوح کے علاوہ کچھ نہیں ہے یہ انسانوں کے لئے مخصوص ہے۔ حیوانات اس تعریف میں نہیں آتے۔ جب انسان اور حیوان کا آپ تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ یہ چلتا ہے کہ بکری کے اندر بھی روح ہے اور جب تک بکری کے اندر رُوح ہے بکری بھی کھاتی ہے،

پیتی ہے، سوتی ہے، جاگتی ہے، اس کے بچے ہوتے ہیں، بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔ لیکن جب بکری کے اندر سے رُوح نکل جاتی ہے تو ایک مُردہ انسان اور ایک مردہ بکری دونوں برابر ہیں۔ اس کے اندر بھی رُوح کے بغیر حرکت نہیں ہوتی۔ اب فرق کیا ہوا بکری اور انسان میں؟ کھانے پینے میں دونوں مشترک ہیں، بیماری میں، دکھ درد میں دونوں مشترک ہیں، اولاد کی تربیت کرنے میں انسان اور حیوان دونوں مشترک ہیں، سونے جاگنے میں انسان اور حیوان دونوں مشترک ہیں اور اس بات میں بھی مشترک ہیں کہ جب تک روح حیوان کے اندر یا بکری کے اندر موجود ہے اُس وقت تک اس کے اندر بھی حرکت ہے اور بکری کے اندر سے جب رُوح نکل جائے گی تو بکری کے اندر کوئی حرکت نہیں رہے گی۔

''انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ اِس قانون کو، اِس علم کو صرف انسان جانتا ہے کہ ''روح ہے تو حرکت ہے اور روح نہیں ہے تو حرکت نہیں ہے۔''

اور یہی وہ بنیادی فلسفہ ہے، یہی وہ بنیادی نقطہ ہے اور یہی وہ بنیادی بات ہے کہ جس کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کے تجربے میں یہ بات آتی ہے کہ رُوح انسان میں بھی ہے اور رُوح حیوان میں بھی ہے لیکن اگر انسان اپنی رُوح سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے جدوجہد اور کوشش نہیں کرتا تو انسان اور حیوان دونوں برابر ہیں۔ انسان کا اعزاز ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ''وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا '' کہہ کر علم الاسماء کا علم سکھا کر یہ بتا دیا ہے کہ مادی جسم، گوشت پوست کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ یہ ایک عارضی چیز ہے ایک (Fiction) چیز ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک سال گزرنے کے بعد ہم خوش ہو رہے ہیں کہ ہمارا بچہ ایک سال کا ہوا ہم سالگرہ منا رہے ہیں۔ دس سال کا ہوا ہم اور زیادہ خوش ہو رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ غور و فکر کریں کہ جو بچہ آج پیدا ہوا اُس بچے کی عمر اگر ۷۰ سال ہے۔ دس سال جب اُس کی عمر کے گزر گئے تو اس کی ۷۰ سال کی عمر میں سے دس سال گھٹ گئے اور اب وہ تو بیچارہ ۶۰ سال کا رہ گیا اور آپ اُس کی خوشی منا رہے ہیں بھئی ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' بھئی بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے بچے کے دس سال گھٹ گئے۔ یعنی ہر چیز اُلٹ ہے۔ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اگر بچے کا پہلا دن مر نہیں جاتا بچہ دوسرے دن میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر بچے کا ایک سال فنا نہیں ہو جاتا تو کوئی بچہ دو سال کا نہیں ہو سکتا تھا۔ تو جب ہم مادی گوشت پوست کے جسم کا تذکرہ کرتے ہیں یا مادی زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہاں اگر غور و فکر کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم بالکل جاہلانہ، بیوقوفانہ باتیں کرتے ہیں۔ اس کے پیچھے نہ کوئی (Logic) ہے، اس کے پیچھے نہ تو کوئی علم ہے، اس کے پیچھے نہ کوئی حقیقت ہے۔ یہ تو ایک (Fiction) ہے

عارضی چیز ہے جس کے پیچھے آپ بھاگ رہے ہیں۔

سادھو کبیر داس نے ایک دفعہ ایک دوھا کہا تھا۔

''رنگی کو کہیں نارنگی تنت مال کو کھویا

چلتی کو کہیں گاڑی دیکھ کبیرا رویا۔

نارنگی کینو کو بھی کہتے ہیں اور سنگترے کو بھی۔ سادھو صاحب کہتے ہیں کہ کینو ہو یا سنگترہ اس کی کوئی چیز بھی بے رنگ ہے ہی نہیں۔ اوپر سے چھلکا بھی رنگین ہے اندر سے کھولو تو سفیدہ وہ بھی رنگ ہے پھر اس کی قاش کھولو تو وہ بھی رنگین ہے پھر اس کا بیج وہ بھی رنگین ہے۔ بیج کو بیچ میں سے توڑو وہ بھی رنگین ہے اس کا نام رکھا ہے نارنگی یعنی جس کا کوئی رنگ نہیں یعنی رنگی کو کہیں نارنگی۔

تنت مال کو کھویا۔ سیروں دودھ پکا کے، پانچ سیر چھ سیر دودھ پکا کے آپ ایک پاؤ کھویا نکالتے ہیں ''جوہر'' یعنی دودھ کو جلا کے پکا کے، پانچ چھ سیر دودھ آپ نے پکایا حاصل آپ کو کیا ہوا؟ اس کا نام لکھا ہے کھویا یعنی کھو دیا۔ یعنی جو چیز حاصل ہے اس کا نام رکھ دیتے ہیں کھو دیا، کھویا۔

جو چیز رنگین ہے اس کا نام رکھ رہے ہیں نارنگی جس کا کوئی رنگ نہیں اور جو چیز حاصل ہے اُس کا نام رکھ دیتے ہیں کھو دیا۔ چلتی کو کہیں گاڑی۔ جو چیز چلنے والی ہے وہ ریڑھا ہو، چھکڑا ہو، کار ہو، سائیکل ہو، موٹر سائیکل ہو اس کا نام رکھ دیا ہے گاڑی یعنی گاڑ دی ''چلتی کو کہیں گاڑی دیکھ کبیرا رویا۔ کہ یہ دنیا جو ہے یہ ہر چیز کی اُلٹ ہے اور اس اُلٹ پھیر کے چکر میں سوائے رونے کے اور کوئی چیز انسان کو حاصل نہیں۔

آپ یہاں کچھ بھی کر لیں، کتنی بھی جائیدادیں بنا لیں، کتنی بھی زمینیں خرید لیں نتیجہ اُس کا یہ ہے کہ آپ کو یہاں سب کچھ چھوڑ کے جانا ہے۔ آپ کا کچھ نہیں ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ زمین نہ خریدیں، مکان نہ بنائیں، کھیتی باڑی نہ کریں، فیکٹری نہ لگائیں۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہوگا تو دنیا کی رونق ختم ہو جائے گی۔ یہ سب کچھ کریں۔ اچھے سے اچھا مکان بنائیں۔ اچھے سے اچھا آرام و آسائش کا اہتمام کریں۔ لیکن جو آپ کا اصل ہے اُس سے آپ ضرور واقف ہوں اور آپ کو معلوم ہو کہ ہم یہاں ایک تھوڑے سے وقفے کے لئے آئے ہیں۔ یہ ایک مسافر خانہ ہے۔ مسافر خانے میں آپ کھلی چارپائی پر بھی سو سکتے ہیں، مسافر خانے میں آپ (BED) پر بھی سو سکتے ہیں۔ مسافر خانے میں آپ (A.C) بھی لگا سکتے ہیں لیکن وہ مسافر خانہ ہی رہے گا۔ ایک کسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلّہ اُگائے۔ اگر وہ غلّا نہیں اگائے گا، اناج پیدا نہیں کرے گا تو قحط پڑ جائے گا۔ ایک بڑھئی

کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے لئے اپنے بھائیوں کے لئے دروازہ بنائے تاکہ گرمی سردی سے اُس کے بھائی محفوظ رہ سکیں۔

آپ کے پاس چار پیسے ہیں۔ چار پیسے آپ کے پاس اس لئے ہونے چاہئیں کہ آپ اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائیں۔ چار پیسے آپ کے پاس اس لئے ہونے چاہئیں کہ آپ غریبوں کی مدد کریں۔ چار پیسے آپ کے پاس اس لئے ہونے چاہئیں کہ دکھ درد میں آپ کے کام آئیں۔ آپ دوسروں کے کام آئیں دوسرے آپ کے کام آئیں۔ لیکن پیسہ کرنا اگر زندگی کا مقصد بن گیا تو آپ نے اپنی پیدائش کا مقصد کھودیا۔

تو یہ جتنے بھی اولیاء اللہ آئے ہیں کیا آپ نے کبھی یہ دیکھا ہے کہ ولی اللہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کپڑے نہیں پہنتا۔ ولی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ ولی اللہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس کے بچے نہیں ہوتے کیا کسی ولی اللہ نے اپنے بچوں کو جنگلوں میں بھیج دیا؟ کیا ان کی تعلیم و تربیت نہیں کی؟

مقصد یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز کو آپ خوش ہو کر استعمال کریں اس لیئے استعمال کریں کہ اللہ چاہتا ہے کہ آپ زمین پر رہیں۔ زمین کی رونق آپ کے دم قدم سے بحال رہے لیکن مقصد آپ کا یہ ہونا چاہیے کہ ''ہمیں اللہ نے یہاں بھیجا ہے اور ہماری زندگی کا مقصد ہے کہ اللہ ہمیں جانتا ہو اور ہم اللہ کو جانتے ہوں۔''

''حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھ سے فرمایا کہ جب حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ حضور پاک کا جبہ مبارک لے کر حضرت اویس قرنیؓ کے پاس گئے تو اُنہیں ڈھونڈا وہ مل گئے۔ اُنہیں سلام کیا اور کہا کہ حضور پاکؐ نے فرمایا کہ جب تم اویسؓ کو پاؤ تو میری امانت وہاں تک پہنچا دینا اور میری امت کے لئے اُن سے دعا کرانا۔ تو انہوں نے دعا کی۔ پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ مجھے کچھ نصیحت کریں حضرت علیؓ تو ادب کی وجہ سے خاموش رہے۔ حضرت اویس قرنیؓ نے فرمایا کہ اے عمرؓ! تم اللہ کو جانتے ہو؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اللہ کو جانتا ہوں پھر حضرت اویسؓ نے فرمایا اے عمرؓ! اللہ بھی تمہیں جانتا ہے؟ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اللہ بھی مجھے جانتا ہے حضرت اویسؓ نے فرمایا اب تمہیں کسی نصیحت کی ضرورت نہیں۔''

مقصد یہ ہے کہ ایک آدمی جب اس دنیا میں پیدا ہو گیا اگر اس کو اِس بات کا علم نہیں ہے کہ اس کی ماں کون ہے اس کا باپ کون ہے کیا اس کی زندگی پرسکون گزر سکتی ہے تو جب آپ کو یہ پتہ نہیں ہے کہ آپ کا خالق کون ہے

تو کیسے آپ کی زندگی پُرسکون گزر سکتی ہے۔ مقصد دنیا کا یہی ہے کہ دنیا میں رہیں، اخلاق کی حدود میں رہتے ہوئے سب کچھ کریں، لیکن آپ کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیئے کہ اللہ آپ کو جانتا ہو اور آپ اللہ کو جانتے ہوں۔ یہ اللہ کو جاننا اس کے بغیر ممکن نہیں ہے جب تک آپ اپنی ذات سے، اپنی اصل سے، اپنی رُوح سے واقف نہیں ہو جاتے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ.

ترجمہ: وہ بندہ جو اپنے آپ سے واقف نہیں ہوتا وہ اللہ کو نہیں پہچان سکتا۔

آپ کی اصل کیا ہے؟ ہماری اصل رُوح ہے۔ اگر آپ رُوح کو نہیں جانتے تو آپ اصل سے واقف نہیں ہیں۔ تو جب اصل سے ہی واقف نہیں ہیں تو آپ تو کسی چیز سے بھی واقف نہیں ہیں۔ اس اصل سے واقفیت کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح آپ دنیاوی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں جیسے ایک بچہ ہے آپ اُسے تعلیم دلانا چاہتے ہیں تو دس سال تک تو آپ اُسے سکول میں بھیجتے ہیں۔ دس سال میں میٹرک کا (Subject) کلیئر (Clear) ہوتا ہے۔ اور میٹرک کوئی تعلیم نہیں ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد تو تعلیم کے دروازے کھلتے ہیں کہ بچہ کس طرف کو جائے گا تو بچے کے آپ دس سال صرف اس بات میں صَرف کر دیتے ہیں کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ تو اِسی طرح آپ اللہ کے لئے بھی کچھ وقت صرف کریں۔ اگر آپ اللہ کے لئے روزانہ دس منٹ بھی نہیں دے سکتے تو یہ تو سراسر ناشکری ہے۔

جیسے اللہ نے آپ کو پیدا کیا ہے میں جب لندن گیا تو مجھے یہ شوق ہوا کہ معلوم کروں کہ سائنٹسٹوں نے یہ جو جسم کی تمام ہڈیاں بنائی ہیں، تمام اعضاء بنا لئے ہیں اِن کی کیا قیمت ہے؟ تو میں نے ایک چارٹ لیا اور جہاں جہاں یہ بکتی تھیں وہاں پہنچ گیا۔ کئی ہسپتالوں میں گیا، کئی اداروں میں گیا کہ بھئی اِس ہڈی کی کیا قیمت ہے؟ گھٹنے کی ھڈی کی کیا قیمت ہے؟ کندھے کے مہرے کی کیا قیمت ہے؟ یہ جو کمر کے مہرے ہیں ان کی کیا قیمت ہے؟ تو وہ سارا حساب کتاب پاکستانی روپوں کے مطابق ڈھائی کروڑ روپے کا بنا۔ یعنی انسان جس (Structure) پر جس ہڈیوں کے ڈھانچے پر کھڑا ہوا ہے اُن ہڈیوں کی قیمت جو سائنس نے پلاسٹک اور دوسرے مصالحے سے بنائی ہیں ڈھائی کروڑ روپے ہے۔

پھر میں آپریشن کی طرف گیا کہ بھئی دماغ کے آپریشن کے کتنے پیسے ہوئے؟ دل کے آپریشن کے کتنے پیسے ہوئے؟ وہ بانوے لاکھ روپے بنے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر انسان جو یہاں بیٹھا ہوا ہے اور ہر وہ انسان جو دنیا

میں آباد ہے ہر روز اللہ تعالیٰ کے تین کروڑ روپے خرچ کرتا ہے۔ یہ جو آپ بیٹھے ہوئے ہیں یہ اللہ کی تین کروڑ روپے کی مشینری ہے۔ یعنی آپ اللہ کی دی ہوئی تین کروڑ یا ساڑھے تین کروڑ روپے کی مشین کو روز استعمال کر رہے ہیں اور اللہ کے لئے آپ کے پاس شکر ادا کرنے کے لئے ۱۰ منٹ کا وقت بھی نہیں ہے۔

اس سے زیادہ بے حسی کیا ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ کفرانِ نعمت کیا ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ ناشکری کیا ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے مذاق اُڑانا کیا ہو سکتا ہے۔

آپ دماغ کو دیکھئے ، دماغ فیل (Fail) ہو جائے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ نے وہ ذہنی معذور بچے نہیں دیکھے۔ ساری دنیا میں اُن کا علاج ہی نہیں ہو سکتا۔ تو اگر آپ کا کوئی بچہ تعلیم حاصل کر کے کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے تو وہ اس لئے ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا دماغ اُس کے اندر کام کر رہا ہے اگر اللہ کا دیا ہوا دماغ انسان کے اندر کام نہ کرے، آدمی پاگل ہو جائے تو کیا کوئی ایسا آدمی تعلیم حاصل کر سکتا ہے؟ اچھا صاحب اللہ میاں بھوک نہ لگائے ہم روٹی کھا سکتے ہیں۔ پھر اگر بھوک لگ گئی اور آپ کا ہاضمہ خراب ہو جائے کیا آپ دوبارہ روٹی کھا سکتے ہیں؟

مجھے ایک قصہ یاد آیا وہ یہ تھا کہ ایک بادشاہ تھا۔ اس کو پیشاب کی تکلیف ہو گئی۔ ان کا پیشاب بند ہو گیا۔ بڑا علاج کیا ہر قسم کی تدبیر کی لیکن کوئی علاج بھی کارگر نہ ہوا۔ تو لوگوں کو تلاش ہوئی کہ اللہ کا کوئی ایسا بندہ ملے جو علاج کر دے۔ جب آدمی دنیا سے مایوس ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں کہ ''جب بندہ دنیا سے مایوس ہو جاتا ہے تو ہماری طرف آتا ہے۔ پھر جب ہم آسانیاں فراہم کر دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میں نے کیا ہے۔'' تو کوئی فقیر آدمی مل گیا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے بھئی صورت یہ ہے کہ اگر بادشاہ ہمارے پاس خود چل کر آئے تو ہم علاج کرتے ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بادشاہ وہاں پہنچ گیا تو انہوں نے کہا کہ بھئی تمہاری پیشاب کی تکلیف ختم ہو جائے گی لیکن ہماری شرط یہ ہے کہ تم اپنی آدھی سلطنت ہمیں دے دو۔ تو بادشاہ نے وہ آدھی سلطنت اُس فقیر کے نام لکھ دی۔ پیشاب کا رستہ کھل گیا۔ لیکن اب وہ اس طرح کھلا کہ بند نہیں ہوتا تھا۔ یہ ایک نئی بیماری شروع ہو گئی۔ بتایا گیا کہ اُس شہر میں جتنے کپڑے کے تھان تھے وہ سارے ہی خراب ہو گئے۔ یہ کیا مصیبت آ گئی بھئی بادشاہ نے سوچا۔ انہوں نے کہا کہ بھئی پھر وہیں چلتے ہیں فقیر کے پاس۔ وہ پھر وہاں فقیر کے پاس پہنچ گئے تو فقیر نے کہا کہ بھئی اب تمہارا پیشاب نارمل (Normal) ہو جائے گا لیکن یہ جو مزید آدھی سلطنت ہے وہ بھی لکھ دو۔ بادشاہ نے وہ بھی لکھ دی۔ اب بادشاہ گھر جا کر بالکل ٹھیک ہو گیا۔

جب وہ ٹھیک ہو گیا تو وہ تلوار اور تاج لیکر فقیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ صاحب میرا تو کچھ ہے ہی نہیں، میں تو سب کچھ لکھ چکا ہوں اب میرے لئے کیا حکم ہے۔

اُس فقیر نے وہ کاغذات جو بادشاہ نے لکھ کر دیئے تھے اُس کو واپس کئے اور کہا کہ میاں ہمیں سلطنت سے کیا سرکار۔ ہم تو تمہیں دکھانا چاہتے تھے کہ ''تمہاری اس سلطنت کی قیمت ایک پیشاب جتنی بھی نہیں ہے'' تم نے پیشاب کے لئے پوری سلطنت لکھ دی۔ جاؤ! اللہ کی مخلوق کی خدمت کرو اور اُنہیں دُکھ درد اور تکلیف نہ دو۔

سیدھی سی بات ہے کہ ہم میں سے اگر کسی کا اللہ تعالیٰ پیشاب بند کر دیں تو ہم ہر چیز لکھ دیں گے پھر زیادہ کھل جائے تو ہم پھر ہر چیز لکھ دیں گے۔ اس دنیا کی قیمت کیا ہوئی بھئی؟

یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس لئے دی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کھائیں، پئیں، پہنیں، اوڑھیں لیکن خوش رہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ دنیا میں ہمارا اتنا زیادہ انہماک ہو گیا ہے کہ ہم اللہ ہی کو بھول گئے ہیں۔ کھانا پینا تو ہمیں یاد ہے، کپڑے پہننا بھی ہمیں یاد ہے، پیسہ جمع کرنا بھی ہمیں یاد ہے لیکن اگر کوئی چیز یاد نہیں تو اللہ تعالیٰ یاد نہیں۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے کہ جس کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک مربوط شکل میں پیش کیا اور اس کا نام سلسلہ رکھا۔

سلسلہ کا مطلب ہے، ایک طریقہ کار۔ سلسلہ کا مطلب ہے راستہ ایک متعین کردہ راستہ۔''

''تو یہ جتنے بھی سلاسل ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غارِ حرا میں مراقبہ کیا ہے۔''

مراقبہ کا مطلب پہلے ہی بیان ہو چکا ہے۔ مراقبہ کا مطلب آنکھیں بند کر کے بیٹھ جانا نہیں ہے۔ مراقبہ کا مطلب ہے غور و فکر کرنا کہ میں کون ہوں؟ مجھے کیوں پیدا کیا گیا؟ میرا پیدا کرنے والا کون ہے؟ مجھے اتنے سارے وسائل جو اللہ نے دیے ہیں وہ کیا ہیں؟ اور یہ وسائل کیوں دیے ہیں؟

مثلاً دھوپ نکل رہی ہے اب بتایئے اگر اس دھوپ کی قیمت اللہ تعالیٰ لگا دے تو آپ کیا کر سکتے ہیں؟ پانی پیتے ہیں، کتنا پانی پیتے ہیں کنوؤں کے حساب سے پانی پیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر کہے کہ تم جب تک تین دفعہ اللہ اللہ نہیں کہو گے پانی نہیں دوں گا تو ہر آدمی اللہ ہی اللہ کرتا رہے گا کوئی کام اس کو ہو گا ہی نہیں۔ یہ زمین ہے اس میں ہوا ہے وہ بھی مفت، آکسیجن ہے وہ بھی مفت یہ زمین جس کی قیمت آپ ایک ایک لاکھ روپے مرلہ دیتے ہیں۔ اللہ کو آپ نے اس زمین کے کتنے پیسے دیئے۔ بتائیں! یہ زمین آپ کی ہے یا اللہ کی ہے۔ اچھا آپ کہتے ہیں میری ہے۔

پھر قبر میں کیوں نہیں ساتھ لے کر جاتے اگر آپ کی ہے تو۔ الغرض اللہ کے بیشمار انعامات ہیں آپ کے اوپر۔ جیسے ساڑھے تین کروڑ روپے کی تو مشینری ہے بتاؤ اللہ کو آپ نے کتنے پیسے دیے۔ زمین آپ کو مفت ملی، پانی آپ کو مفت ہے، ہوا آپ کو مفت ہے، دھوپ آپ کو مفت ملی ہے۔ چاند ہے جب تک چاند نہ نکلے ساری کھیتی باڑی خراب ہو جائے گی۔ ہر چیز کڑوی ہو جائے گی۔ چاند ہوگا تو آپ کے جو میں، باجرہ میں، مکئی میں، سبزیوں میں، پھلوں میں مٹھاس پڑے گی اور اگر چاند نہیں ہوگا تو ہر چیز کڑوی ہو جائے گی۔ اگر دھوپ نہیں نکلے گی تو گندم کچی ہو کے خراب ہو جائے گی، سڑ جائے گی۔ آپ کی گندم پک کے گیلی ہوگئی تو اس کا آٹا نہیں بن سکتا۔ کیا آپ نے کبھی اس دھوپ کا اللہ تعالیٰ کو پیسہ دیا ہے؟ آپ چکیوں میں آٹا پیستے ہیں اللہ تعالیٰ پتھر نہ بنائے آپ آٹا پیس سکتے ہیں؟ آپ روٹی کھاتے ہیں اللہ میاں اگر لوہا نہ بنائے توا بن سکتا ہے آپ کی روٹی پک سکتی ہے؟

جتنا بھی غور کریں وہاں یہی بات آپ کو نظر آئے گی کہ اللہ تعالیٰ اتنا بڑا رحیم وکریم خالق ہے کہ ہر چیز جو آپ کی زندگی میں کسی بھی طرح دخیل ہے وہ آپ کو مفت مل رہی ہے۔ اور اس کے باوجود بھی آپ اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے کہ اس خالق کو مالک کو خودمختار کو جس نے آپ کو ہر چیز مفت دی ہوئی ہے آپ پہچاننے کی کوشش کریں جدوجہد کریں۔

یہی وہ عمل ہے کفرانِ نعمت کا جس کی وجہ سے پورے انسان دردناک عذاب میں مبتلا ہیں۔ کوئی گھر ایسا نہیں ہے جہاں ۔بے سکونی نہ ہو کوئی گھر ایسا نہیں ہے کہ جہاں بیماریاں نہ ہوں کوئی گھر ایسا نہیں ہے جہاں نفرت نہ ہو۔ کوئی گھر ایسا نہیں ہے کہ جہاں آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرتے ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کی پیرہن نہ کھینچتے ہوں۔

وجہ کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی نعمتیں تو استعمال کرتے ہیں لیکن نعمت دینے والے کو یاد نہیں کرتے، نعمت دینے والے سے اپنا تعلق قائم نہیں کرنا چاہتے نتیجہ میں پریشانی تو ہوگی ہی۔ اور اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ بھی بہت آسان ہے۔ وہ یہی ہے کہ آپ جب پانی پئیں تو اللہ کو یاد کریں کہ ایسا اچھا اللہ ہے جس نے ٹھنڈا میٹھا پانی فراہم کیا۔ یہ آپ کی جو زمین ہیں اگر اس میں سارا پانی کھارا ہو جائے تو پوری پوری آبادیاں وہاں چلی جائیں گی جہاں ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہوگا۔ اب جن زمینوں میں پانی میٹھا نہیں ہوتا وہاں آبادی ہوتی ہی نہیں۔ کیوں نہیں ہوتی آبادی اس لئے کہ اللہ نے وہاں پانی میٹھا نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ زمین میں جہاں میٹھا پانی ہے وہاں کھارا پانی بھی ہے تو یہ پانی جو اللہ میٹھا پانی پیدا کرتا ہے کھارا پانی بھی پیدا کرسکتا ہے۔ وہ چاہے تو ساری زمین کا پانی

کھارا کرسکتا ہے۔ کیا آپ کچھ کر سکتے ہیں؟ کھیتی اُگ سکتی ہے؟ آپ زندہ رہ سکتے ہیں؟ آپ کے جانور زندہ رہ سکتے ہیں؟ درخت قائم رہ سکتے ہیں؟۔

ہر چیز آپ کو اللہ کی طرف سے مفت مل رہی ہے اور وہ اس لئے کہ ''اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے کہ میں نے مخلوق کو محبت کے ساتھ تخلیق کیا اور اس لئے تخلیق کیا کہ مخلوق مجھے پہچانے، میرا عرفان حاصل کرے، مجھ سے عرض و معروضات پیش کرے۔''

''اُدْعُوْنِی اَسْتَجِبْلَکُمْ'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مخلوق جب مجھ سے مانگتی ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں، اسے دیتا ہوں۔

سلسلہ عظیمیہ کا مختصر سا تعارف یہ ہے کہ سلسلہ عظیمیہ نے رسول اللہ ﷺ کے مشن کی ترویج کے لئے ایسے اسباق مرتب کئے ہیں کہ جن اسباق کو پڑھ کر آدمی اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے اور جب ان تعلیمات پر عمل کر کے آدمی غور وفکر کرتا ہے، اپنے آپ کو ڈھونڈتا ہے، اللہ تعالیٰ کو ڈھونڈتا ہے یعنی مراقبہ کرتا ہے تو اس مراقبے کے نتیجے میں انسان کی زندگی کا جو مقصد ہے وہ اِسے حاصل ہو جاتا ہے یعنی وہ اللہ کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔

ماشاء اللہ، آپ کے شہر میں بچوں نے کوشش کر کے مراقبہ ہال کے نام سے یہ مزنگ میں جگہ بنا لی ہے۔ یہ ایک روحانی درسگاہ ہے۔ یہ ایک مدرسہ ہے۔ یہ ایک اسکول ہے۔ دنیاوی علوم کے لئے تو آپ اپنے بچوں کو سکول میں بھیجتے ہیں، فیسیں بھی بھرتے ہیں، یونیفارمز بھی بناتے ہیں اور پتہ نہیں کیا کچھ کرتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا اسکول ہے کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں، اپنے بچوں کو بھیجیں تو یہاں آپ کو ایسی تعلیمات ملیں گی کہ جس سے آپ کو پتہ چل جائے گا کہ آپ اللہ کو کس طرح ڈھونڈ سکتے ہیں، اپنے آپ سے کس طرح واقف ہو سکتے ہیں۔

حضور پاک کا ارشاد ہے: ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ'' جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس حدیث مبارکہ کی عملی تفسیر آپ کے سامنے آسکتی ہے اس سکول میں اس مدرسے میں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اپنی زندگی کا جو مقصد ہے یعنی اللہ کا عرفان، اللہ کے رسول کا عرفان، اللہ کے پیغمبروں کا عرفان، نیک رُوحوں کا عرفان حاصل کرنے کے لئے جدوجہد اور کوشش کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے'' جو لوگ میرے لئے جدوجہد کرتے ہیں یعنی مجھے جاننے کی کوشش کرتے ہیں، مجھے پہچاننے کے لئے عملی اقدامات کرتے ہیں میں ان کو ضرور اپنے راستے کی طرف روشنی دکھاتا ہوں۔''

یہ وعدہ ہے اللہ تعالیٰ کا۔ اللہ تعالیٰ دور نہیں ہے، اللہ تو بہت قریب ہے۔ قرآن شریف میں ہے، اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ ''میں تمہاری رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہوں۔'' یعنی جتنی آپ کی جان ہے اس سے بھی زیادہ قریب اللہ تعالیٰ ہیں۔

''اَلَا اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیءٍ مُّحِیط'' اللہ ایک ایسا دائرہ ہے جس دائرے کی اندر انسان اور ہر چیز موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جہاں تم ایک ہو وہاں میں دوسرا ہوں، جہاں تم دو ہو وہاں میں تیسرا ہوں۔ جو تم چھپاتے ہو وہ میں جانتا ہوں۔ جو تم کرتے ہو وہ میں دیکھتا ہوں اور اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کیا فرمائیں گے۔

''وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْن'' میں تمہارے اندر ہوں تم مجھے دیکھتے نہیں ہو۔

اللہ تعالیٰ سے قریب کوئی چیز نہیں ہے اور اگر کوئی چیز قریب ہے تو وہ انسان ہے جو اللہ سے قریب ہے باقی ہر چیز دور ہے۔''ماں'' کتنی بھی بچے سے قریب ہو لیکن ماں کو ایک دن مر جانا ہے۔ بچہ کتنا بھی قریب ہو ماں سے بچہ کو ایک دن مر جانا ہے۔ باپ اور اولاد کا رشتہ اُسی وقت تک قائم ہے جب تک موت نہیں آ جاتی۔ اور موت لازم آنی ہے۔

بھئی میرے باپ کے باپ مر گئے پھر میرے ابا جی مر گئے اب میں عمر کے اُس حصے میں ہوں میں بھی جہاں آ کے مر جاؤں گا۔

میری اولاد آگے آئے گی وہ ماں باپ دادا دادی بنے گی وہ بھی مر جائے گی۔

یہ کیسا رشتہ ہے کہ ہر آدمی مر رہا ہے اور اپنے پیچھے لوگوں کو چھوڑ کر جا رہا ہے نہ وہ خود یہاں رہ سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے لوگ کسی اور کو روک سکتے ہیں۔ یہ زندگی ہے۔ اس زندگی کا کوئی اعتبار ہے؟

آپ آدمؑ سے لے کر اب تک دیکھیں۔ ہر بچہ جو پیدا ہوا تھا بڑا ہو کے مر گیا۔ ہر وہ ماں جو ماں بنی وہ نانی دادی ہو کے مر گئی۔ یہ کیسے رشتے ہیں؟ یہ عارضی رشتے ہیں۔ ان رشتوں کا اعتبار صرف یہ ہے کہ:

آپ کو اللہ تعالیٰ نے ماں بنایا، باپ بنایا، اولاد بنائی اور اللہ تعالیٰ نے ماں باپ اور اولاد کے حقوق متعین کر دیئے۔ اگر آپ نے وہ حقوق پورے کر دیے تو منشاء پورا ہو گیا لیکن۔

آپ کی ذات کا منشاء اُسی وقت پورا ہو گا جب آپ اللہ تعالیٰ کو جان لیں گے اور پہچان لیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کو پہچاننے اور جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ خود کو پہچانیں۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ یعنی جس نے اپنی رُوح کو پہچان لیا فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ پس اس نے اللہ کو پہچان لیا۔

رُوح کو پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ روح تو اندر ہے تو آپ باہر دیکھنے کی بجائے اندر دیکھنے کی کوشش

کریں تو جب آپ اندر دیکھنے کی کوشش کریں گے تو اس کوشش میں آپ کو کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے تو جب آپ اپنی روح کو دیکھ لیں گے، رُوح سے واقف ہو جائیں گے تو آپ اللہ تعالیٰ سے بھی واقف ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ:

ہم دنیاوی زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی اصل سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ ہمارا خالق و مالک اللہ جس نے ہمیں ہر قسم کے آرام و آسائش عطا فرمائے ہیں اس کو جاننے اور پہچاننے کی جدوجہد اور کوشش کریں اور اس میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ (آمین)

السلام علیکم!

☆......☆......☆

جامعہ عظیمیہ کاہنہ نو کے افتتاح سے خطاب

مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۸۷ء کو بروز جمعۃ المبارک ۱۱ بج کر ۱۱ منٹ پر سلسلہ عظیمیہ اور قلندر شعور فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام لاہور میں آہلو روڈ کاہنہ نو کے دور افتادہ حصہ پر اللہ تعالیٰ کے پیغام کو عام کرنے کے لئے مرشدِ کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے زیر سرپرستی جامعہ عظیمیہ کا افتتاح کیا گیا۔

جامعہ عظیمیہ کاہنہ نو لاہور کے افتتاح کے موقع پر پاکستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں سے مندوبین کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی۔ تمام مہمانانِ گرامی نے اہل لاہور کی مہمان نوازی کو بہت سراہا۔

جامعہ عظیمیہ کے افتتاح سے مرشدِ کریم نے باقاعدہ خطاب کیا۔ اور اس سرزمین کو مستقبل میں سلسلہ عظیمیہ کے مشن کی ترقی کے لئے انتہائی اہم قرار دیا۔ مرشد کریم کے خطاب کے بعد نگران جامعہ عظیمیہ، لاہور میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے تمام حاضرینِ مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے اختتام پر مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔

مرشدِ کریم نے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا!

''ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کا بندہ جب کہیں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے اردگرد بہت سارے لوگ جمع ہو جاتے ہیں، وہ لوگوں سے بھاگتا ہے لیکن ہجوم عاشقاں اس کو ہمہ وقت گھیرے رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا نہ ہی اپنا کوئی وقت ہوتا ہے نہ ہی اسے آرام کا موقع ملتا ہے۔

اس کے برعکس کچھ لوگ بچارے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگوں کا ہجوم ان کے اردگرد جمع ہو، لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگ ان کے پاس نہیں جاتے یعنی ان کے اندر اتنی کشش نہیں ہوتی کہ عوام وخواص جوق در جوق اس کے گرد جمع ہو جائیں۔ جبکہ اللہ والوں کی تو بات ہی نرالی ہوتی ہے۔ میں نے تو عجیب ہی نظارہ دیکھا ہے کہ اللہ والوں کے گرد جمع ہونے والے ہجوم عاشقاں میں انسانوں کی بہ نسبت جنات اور فرشتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ غور وفکر کا مقام ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اللہ کے اس بندے میں آخر

ایسا کون سا وصف اور خوبی ہے۔

اس کے اندر کیا ماورائیت ہے؟

کیا اس کے خورد و نوش، سونا جاگنا اور دیگر معمولاتِ زندگی عام انسانوں سے مختلف ہیں۔ لیکن جب ہم اللہ والوں کے معمولات زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں بلکہ اللہ والوں کا کھانا پینا، سونا جاگنا غرض تمام معمولاتِ زندگی وہی کچھ ہیں جو دیگر انسانوں کا ہے۔

آخر اللہ والوں میں ایسا کون سا وصف یا کشش ہے کہ انسانوں کی بڑی تعداد اس سے محبت و عشق کرتی ہے، اس کے پس پردہ اس کی تعریف بھی کرتی ہے، لوگ اس کے فراق میں آہ و بکا بھی کرتے ہیں۔

ایک عام آدمی جب اس دنیا سے پردہ کرتا ہے تو زیادہ سے زیادہ سال بھر میں ہی لوگ اس کا تذکرہ بھول جاتے ہیں لیکن اللہ والوں کے وصال کو جیسے جیسے زیادہ وقت گزرتا ہے اسی مناسبت سے لوگوں کے دل ان کی طرف زیادہ مائل ہونے لگتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کے وصال کو ایک ہزار سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ آپ اگر کبھی ان کے مزار پر حاضری کے لئے گئے ہوں تو یقیناً آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں عام دنوں میں بھی کس قدر ہجوم ہوتا ہے۔ ہر وقت لنگر تقسیم ہوتا رہتا ہے۔ قرآن خوانی، درود اور فاتحہ خوانی کا سلسلہ بھی ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ لوگوں کو بڑی تعداد کو وہاں جا کر سکون ملتا ہے۔ لوگوں کی دعائیں داتا صاحبؒ کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔

آیئے تلاش کریں کہ ان اللہ والوں میں آخر کون سی خوبی ہے جو چھ ارب انسانوں میں نہیں پائی جاتی۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت لعل شہباز قلندرؒ، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور حضور قلندر بابا اولیاءؒ ان تمام بزرگوں کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ مر گئے ہیں، میرے خیال میں دنیا بھر میں اس سے بڑی کوئی جہالت نہیں ہوسکتی ہے۔ اللہ والوں کی تو شان ہی نرالی ہے۔ ایک عامی آدمی کے متعلق ہی یہ کہنا کہ مرنے کے بعد وہ نیست و نابود ہوگیا، لاعلمی اور جہالت کے سوا کچھ نہیں۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک آدمی افریقہ میں مقیم ہے اور اس کا یہاں تذکرہ کیا جا رہا ہے تو کیا اس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ مر گیا۔ جب وہ شخص افریقہ میں زندہ ہے تو یہاں کے لئے بھی زندہ ہے۔ اسی طرح ایک اللہ کا بندہ اس دنیا سے جانے کے بعد عالم اعراف میں زندہ ہے تو افریقہ میں کسی شخص کا زندہ ہونا اور عالم اعراف میں زندہ ہونے میں کیا فرق ہوگا؟ یہ فرق ضرور ہے کہ افریقہ اسی عالم ناسوت میں موجود ہے جبکہ عالم

اعراف اس مادی دنیا سے اوپر کا ایک عالم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں شہداء کے بارے میں فرمایا ہے کہ ''یہ مرتے نہیں ہیں بلکہ یہ ایسے زندہ ہیں کہ انہیں تو رزق دیا جاتا ہے۔تم لوگوں کو ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔'' اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ عالی مقام ہے کہ ''جب تم قبرستان میں جاؤ تو کہو السلام علیکم یا اهل القبور ۔'' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ''یہ اہلِ قبور تمہارے سلام کا جواب دیتے ہیں لیکن تم سنتے نہیں ہو۔''

اہلِ قبور یعنی اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہو جانے والے لوگ تمہاری آواز سنتے ہیں، تمہارے سلام کا جواب دیتے ہیں، تمہیں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن تم نہ سنتے ہو نہ دیکھتے ہو اور نہ شعور رکھتے ہو۔ ایسا کیوں ہے؟

آپ اس لئے نہیں سنتے کہ آپ نے اس آواز کو سننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مثلاً آپ کے پاس بہترین قلم موجود ہے اور آپ اس قلم کو کبھی استعمال ہی نہ کریں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ قلم بے کار ہے یا قلم کا لکھنا ساقط ہو گیا ہے۔ جب بھی کوئی شخص اس قلم سے کام لے گا قلم لکھنا شروع کر دے گا۔

اب فرض کریں ایک شخص افریقہ چلا گیا اور برسوں گزر گئے وہ پاکستان واپس نہیں لوٹا۔ لیکن وہ افریقہ میں خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے۔ بس صرف اتنا ہے کہ آپ سے اس کا میل جول قائم نہیں رہ سکا تو کیا آپ اسے زندہ کہیں گے یا مُردہ؟ ظاہر ہے آپ اسے زندہ ہی کہیں گے۔ اسی طرح ایک شخص اس دنیا سے چلا گیا۔ جہاں گیا اس جگہ کا نام عالم اعراف ہے، عالمِ اعراف میں وہ زندگی کے تمام معمولات پورے کر رہا ہے تو اسے آپ اپنی دنیا میں مُردہ نہیں کہہ سکتے۔ ایک آدمی ساری دنیا میں ساٹھ سال کی زندگی گزارنے کے بعد دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے تو اسے ہم ہرگز مُردہ نہیں کہہ سکتے۔ منتقل ہونے والے انسانوں کو اگر ہم مردہ جان رہے ہیں تو ہماری سوچ، طرزِ فکر اور زاویۂ نظر غلط ہے۔ ''انتقال'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی مطلب ہے منتقل ہونا اور ''مرنا'' ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں امر ہو جانا۔ یعنی مرنے والا شخص ایسی دنیا میں چلا گیا جہاں سے اب کبھی بھی واپس نہیں آئے گا۔ اب آپ مرنے جینے سے متعلق اپنے معاشرے میں رائج طرزِ فکر کا تجزیہ کریں۔ مرنے کے متعلق ہمارے ہاں جو تصورات ہیں کیا وہ درست ہیں؟

ایک مثال اور ہے کہ ایک آدمی ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہو جاتا ہے جہاں اس جیسے ہی انسان آباد ہیں، جہاں زندگی کی سہولتیں اس کے اپنے ملک سے کہیں زیادہ ہیں پابندیاں کم ہیں۔ جس طرح ہمارے بہت سے پاکستانی بھائی ملک چھوڑ کر دیگر ممالک منتقل ہو جاتے ہیں جہاں وہ محنت و مشقت بھی اپنے ملک سے کہیں زیادہ

کرتے ہیں لیکن وہاں سے وطن واپس نہیں آتے اور کہتے ہیں کہ یہاں زیادہ سکون ہے۔

اسی طرح مرنے کا مطلب نیست و نابود ہو جانا نہیں بلکہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہو جانا ہے۔ جیسے یہاں سرجانی ٹاؤن سے آپ لانڈھی منتقل ہو گئے، لانڈھی سے کلفٹن منتقل ہو گئے اور کلفٹن سے پھر آپ کسی دوسرے علاقے میں منتقل Shift ہو گئے۔ اس مثال کو آپ سٹی وائز بھی کر سکتے ہیں کہ کراچی سے لاہور پھر لاہور سے پشاور منتقل ہو جائیں۔ اب چاہے آپ اس سلسلے کو کتنا ہی پھیلا دیں اور چاہے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتنا ہی مختصر کیوں نہ کر دیں زندگی محض ردّ و بدل کا ہی نام ہے جب تک ردّ و بدل نہ ہو زندگی آگے ہی نہیں بڑھے گی۔ یہ تغیر ہی ہماری زندگی کو قائم رکھتا ہے۔ آپ اپنی پیدائش پر ہی غور کر لیں جسے اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

''اور ہم نے بنایا آدمی کو بجتی مٹی سے، پھر ہم نے رکھا اس نطفہ کو قرار مکین (رحمِ مادر) میں پھر بنایا نطفہ سے علقہ پھر بنایا اس علقہ سے مضغہ، پھر بنایا مضغہ سے عظما اور پھر چڑھایا عظما پر لحما پھر اُٹھا کر کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں۔ سو بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر تخلیق کرنے والا ہے۔''

جب اللہ تعالیٰ انسان کو پیدائش کے تمام تغیرات سے گزار کر دنیا میں لے آتے ہیں تو یہاں بھی تغیرات ہی اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ تغیرات سے مراد یہ ہے کہ رات گزر گئی دن گزر گیا، گھنٹے، منٹ، سیکنڈ لمحات سب گزر گئے۔ آپ کے سامنے ایک بچہ ایک سال کا ہو، دوسرا دس سال کا لڑکا ہو، تیسرا بیس سال کا نوجوان ہو اور چوتھا تیس سال کا جوان ...... اور آپ سے پوچھا جائے کہ ان چاروں میں کیا فرق ہے تو آپ یہی کہیں گے کہ عمر کا فرق ہے..... سوال یہ ہے کہ عمر کیسے بڑھ گئی......؟ دراصل جو دس سال کے تغیرات سے گزر گیا وہ دس سال کا ہو گیا اور جو بیس سال کے تغیرات سے گزر گیا وہ بیس سال کا ہو گیا اسی طرح تیس سال کے تغیرات سے گزر جانے والا فرد تیس سال کا کہلائے گا۔ زندگی کے نشیب و فراز اور شب و روز تغیر کے سوا کچھ نہیں۔ اٹھارہ سال کے تغیرات کی چکی نے کچھ اس طرح آپ کو پیسا کہ جو کچھ حاصل ہوا اس کا نام جوانی رکھ دیا گیا۔ پچاس سال کے تغیرات کا حاصل بڑھاپا ہے۔ ساٹھ سال میں جسم پے در پے تغیرات کی بناء پر اس قدر کمزور ہو گیا اور اس قابل نہیں رہا کہ وہ زمانے کے نشیب و فراز کو برداشت کر سکے۔ دنیا کی فضا میں موجود غم اور پریشانیوں کو برداشت کرتے کرتے وہ اتنا عاجز آ گیا اور پکار اٹھا کہ اب مزید گنجائش نہیں ہے تو وہ اس تغیر سے نکل کر ایک مختلف قسم کے تغیر میں داخل ہو گیا۔

اولیاء اللہ اور عام انسانوں میں بنیادی فرق یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے علوم کے وارثین میں سے کسی کو

بھی جب شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ یہ زندگی کیا ہے؟ اس سوال کا جواب انہیں یہ ملتا ہے کہ یہ زندگی کچھ بھی نہیں۔ زندگی اس تغیر کا نام ہے جس میں کسی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اللہ کے دوستوں کے یقین میں یہ بات شامل ہو جاتی ہے کہ یہاں تغیر کے علاوہ کچھ نہیں اور اس تغیر پر کسی کو کوئی دسترس بھی حاصل نہیں ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ذہنی معذور بچوں کے جسم کی نشوونما اسی طرح ہوتی ہے جس طرح صحت مند بچوں کی ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ بھی جوان ہو جاتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی عقل مندی سے جوان ہوا ہے۔ ایک پاگل شخص جسے کسی بات کا ہوش نہیں وہ پھر کیسے جوان ہوگیا۔ اسی طرح بوڑھے ہونے پر آپ کا کوئی اختیار نہیں۔ آپ کو اپنی پیدائش پر ہی کیا اختیار ہے، اللہ کے حکم کے مطابق جہاں اور جس وقت اس نے چاہا آپ کو پیدا کر دیا۔ دنیا کا ایک فرد بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق پیدا ہوا ہے۔ دنیا سے کوئی جانا بھی نہیں چاہتا لیکن اس کے باوجود بھی کوئی موت سے رستگاری حاصل نہیں کر سکا۔

اولیاء اللہ اس حقیقت کو جاننے کے بعد کہ یہاں جو کچھ ہے وہ سب کا سب تغیر ہے تو وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہر چیز تغیر پذیر ہے اور کسی چیز پر ہمارا اختیار بھی نہیں ہے تو ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم یہاں دل لگائیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ہر شئے میں کام کرنے والی معین مقداروں کے قانون سے واقف ہو جاتے ہیں اور معین مقداروں کے قانون کے ذریعے ہی ہر شئے اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ اپنے ہاتھ ملائیے۔ آپ کے ہاتھ ایک دوسرے سے اس قدر جڑ گئے ہیں کہ بظاہر درمیان میں کوئی خلاء باقی نہیں رہا لیکن آپ یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں۔ ہاتھ آپ کو الگ الگ ہی محسوس ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معین مقداریں ہر صورت برقرار رہتی ہیں۔ جہاں کشش ہے وہاں گریز بھی موجود ہے۔ اب وہ آدمی دنیا کی طرف جیسے جیسے بڑھتا ہے دنیا اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے پیچھے ہٹتی ہے اس کے برعکس جب آپ دنیا سے گریز کریں گے دنیا آپ کی کشش میں اور آپ کے بعد اپنے درمیان معین مقداروں کو قائم رکھنے کے لئے آگے بڑھے گی۔ ایک انسان دوسرے انسان میں اپنے ارادے اور اختیار سے جذب ہو جاتا ہے لیکن سینٹی میٹر کے ہزارویں حصے کے برابر خلاء نہ ہونے کے باوجود دونوں انسان الگ الگ رہتے ہیں، خود کو الگ الگ محسوس کرتے ہیں۔ قانون یہ بنا کہ مقداروں میں تعین ہی انفرادیت قائم کرتا ہے۔ کوئی انسان اس تخلیقی قانون کو توڑ نہیں سکتا۔ جس طرح ایک انسان ادراک رکھتا ہے اسی طرح مال و زر اور دولت بھی ادراک رکھتی ہے جب کوئی انسان دولت کے تشخص سے فرار اختیار کرتا ہے تو مقداروں کے قانون کے مطابق توازن برقرار رکھنے کے لئے دولت اس کے پیچھے بھاگتی ہے اور

جب کوئی انسان دولت کے پیچھے بھاگتا ہے تو دولت اس کے ساتھ بے وفائی کرتی ہے اور عذاب بن کر اس کے اوپر مسلط ہو جاتی ہے۔ اللہ والوں نے دنیا سے لاتعلقی اختیار نہیں کی بلکہ دنیا کے تمام معمولات پورے کئے لیکن دنیا کو بھی تغیرات کا شکار ہوتا دیکھ کر اس کو مجبورِ محض سمجھا اور اپنا رشتہ اس ہستی سے قائم کر لیا جو تمام تغیرات سے ماوراء ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے سلاطین اور بڑے بڑے بادشاہ ننگے پیر اور ننگے سر میلوں پیدل چل کر ان کے درباروں میں ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔ دراصل تغیر پذیر دنیا سے انہوں نے اتنا ہی رشتہ قائم رکھا جتنا ضروری ہے۔ اس لئے لوگ ان کے پاس بھی جاتے ہیں ان کی باتیں بھی سنتے ہیں، ان سے کشش بھی محسوس کرتے ہیں اور اپنے دکھ درد کا ان سے مداوا بھی کراتے ہیں۔ اللہ کے یہ برگزیدہ بندے ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ان تمام روحانی بزرگوں کی تعلیمات یہی ہیں کہ انسان تغیرات سے واقف ہو کر اس سے خود کو اتنا آزاد کر لے کہ یہ تغیر بھی خود اس کے پیچھے آ جائے۔

میرے عزیز دوستو! حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی ذاتِ گرامی ہم سب کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ہمیں ان کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہئے۔ بابا صاحبؒ کی تعلیمات جس قدر لطیف اور روشن ہیں اسی قدر پُر استدلال اور (Logic) سے بھرپور بھی ہیں۔ حضور بابا صاحبؒ کی تعلیمات میں سائنس بھی ہے اور مثالیں بھی ہیں۔ اگر آپ نے حضور بابا صاحبؒ کی تعلیمات پر عمل کر لیا تو آپ کی زندگی بڑی پرسکون گزر جائے گی۔

اس دنیا کے بعد جو دنیا درپیش ہے، تغیر وہاں بھی ہے لیکن وہاں کا تغیر مادی دنیا کے تغیر سے بہت مختلف ہے۔ مثلاً یہاں انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر ۱۰۰ سال ہے تو وہاں ممکن ہے انسان کی عمر ایک لاکھ سال سے بھی کہیں زیادہ ہو۔ مرنے کے بعد کی دنیا میں بھی آدمی مستقل نہیں رہ سکے گا، اس دنیا کے بعد عالم حشر و نشر ہے پھر جنت ہے پھر ابد اور پھر ابد الآباد کی دنیائیں درپیش ہوں گی۔ یعنی ہر دنیا میں ایک تغیر ہے اور باقی قائم و دائم رہنے والی بس ایک ذات ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کا تعلق جس قدر مضبوط ہوتا جائے گا اسی قدر آپ اس تغیراتی جھمیلے میں خوش اور آزاد رہیں گے۔ اگر خدانخواستہ تغیر ہی میں آپ دفن ہو گئے تو خسر الدنیا ولآخرۃ کے مصداق اس دنیا میں بھی گھاٹا ہے اور آخرت میں بھی گھاٹا ہی ملے گا۔''

قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ:

''جو لوگ اللہ کا قرب اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے جدوجہد اور کوشش کرتے ہیں ہم اُن کو اپنے راستوں کی ہدایت بخشتے ہیں۔''

حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ جب آپ دنیا کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، دنیا کہتی ہے! آؤ لبیک اور جب آپ اللہ کے لئے جدوجہد کرتے ہیں تو اللہ کہتا ہے! یا عبدی لبیک!......... آ میرے بندے، آ، میں تجھے نوازوں گا، تجھے اپنی قربت عطا کر دوں گا......

اللہ تعالیٰ ہم سے دور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بارہا یہ فرمایا ہے کہ انسان کو سب سے زیادہ قربت اللہ تعالیٰ سے حاصل ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ عَلَیْهِ مِنْ حَبْلَ الْوَرِیْد ○ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں...... جس قدر تم اپنی جان، اپنی زندگی، اپنی لائف یا اپنے حواس سے قریب ہو، اُس سے کہیں زیادہ میں تم سے قریب ہوں۔

اگر کوئی کہے کہ صاحب اللہ تعالیٰ اس قدر قریب ہے تو نظر کیوں نہیں آتا؟............ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ آپ کو اپنا دل بھی تو نظر نہیں آتا، جس کے اُوپر آپ کے پورے جسم کا دار و مدار ہے۔ لیکن اگر آپ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو آپ کو اپنا ظاہر بھی نظر آ جاتا ہے، اسی طرح جدوجہد اور کوشش کرنے سے اور دیکھنے سے باطن بھی نظر آ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لیے نظر نہیں آتے کہ آپ نے اللہ کو دیکھنے کی ایسی جدوجہد نہیں کی جیسی کہ آپ دنیا کے لئے کرتے ہیں۔ اللہ تو ہمہ وقت ہمارے قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَفِي اَنْفُسِكُمْ اَفَلا تُبْصِرُوْنَ ○ میں تمہارے اندر ہوں، تمہارے نفسوں میں ہوں لیکن بڑے تعجب کی بات ہے تم مجھے دیکھتے ہی نہیں ہو...... یعنی اگر انسان سے قریب ترین کوئی ہستی ہے... تو وہ اللہ ہے...... اَللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ○ اللہ زمین آسمان کی روشنی ہے۔ اب سائنس نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ انسان کے اُوپر ایک Aura ہوتا ہے یعنی انسان روشنیوں کا بنا ہوا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ تاروں میں بجلی دوڑتی رہتی ہے لیکن جب تک آپ سوئچ آن نہیں کرتے اُس وقت تک بلب روشن نہیں ہوتا۔ بلب روشن نہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تاروں میں سے بجلی ختم ہوگئی ہے۔ اِسی طرح ہر انسان کے اندر اللہ کا نور دوڑ رہا ہے...... دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی روشنیاں دوڑ رہی ہیں۔ لیکن اگر آپ اُن روشنیوں سے استفادہ ہی نہیں کرنا چاہتے، یعنی سوئچ ہی آن نہیں کرنا چاہتے تو آپ کے گھر میں اندھیرا رہے گا۔

تمام روحانی سلاسل اور بالخصوص سلسلہ عظیمیہ کی جدوجہد کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسان سے اگر کوئی ہستی قریب ترین ہے تو وہ اللہ ہے اور جب کوئی بندہ اللہ سے دور ہو جاتا ہے تو وہ شیطان سے قریب ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کی تخلیق اس لئے کی ہے کہ وہ ہمیں پہچانے اور ہمیں پہچان کر ہمارا قرب حاصل کرے..... اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی نشانیوں میں ریسرچ کی جائے اور ایک

طریقہ یہ ہے کہ عبادات کے ذریعے، مراقبہ اور مجاہدہ کے ذریعے اپنے اندر تفکر کیا جائے اور اس تغیر وتبدل پر غور کیا جائے جس تغیر وتبدل کی بیلٹ پر ہماری زندگی گزر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے کچھ بندے ایسے ہیں کہ وہ نوافل کے ذریعے میرے اتنے قریب ہو جاتے ہیں کہ میں اُن کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتے ہیں، میں اُن کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتے ہیں، میں اُن کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتے ہیں ..... یعنی ان کے ایسے بندے اپنی مرضی کو اللہ کی رضا کے اس حد تک تابع کر دیتے ہیں کہ اُن کی اپنی مرضی ختم ہو جاتی ہے اور اللہ کی مرضی غالب آ جاتی ہے۔"

کہاوت ہے کہ........ "چراغ سے چراغ جلتا ہے" ......

دوسو (۲۰۰) سال پہلے چراغ کی روشنی ..... پہلے چھت کو روشن کرتی تھی ... پھر چراغ کی لو سے سمتیں روشن ہوتی تھیں...... پرانے زمانے میں چنگاری سے چراغ روشن ہوتا تھا ...اور اب سوئچ سے جلتا ہے ...

طریقہ کار کچھ بھی ہو بہر حال روشنی سے روشنی ہوتی ہے ... اور بڑی خبر Big News یہ ہے کہ روشنی خرچ بھی ہوتی ہے.... جس طرح دیئے میں تیل خرچ ہوتا تھا اب بلب میں بجلی خرچ ہوتی ہے۔ دُکان سے ہمارے بزرگ تیل خریدتے تھے اور ہم بجلی خریدتے ہیں...... اور اس لئے خریدتے ہیں کہ تیل بھی خرچ ہوتا ہے اور بجلی بھی خرچ ہوتی ہے۔

مدعا یہ ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے.....

اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے، اپنی حکمت و مشیت سے کائنات بنائی ..... کائنات کو روشن اور منور رکھنے کے لئے چاند سورج تخلیق کئے...... رات کے اندھیروں میں مسافروں کو سفر میں سہولت فراہم کرنے کے لئے آسمان پر قندیلیں روشن کیں...... کاروبارِ حیات چلانے اور ایک دوسرے کی خدمت گزاری، غم خواری اور احسان و مروّت قائم رکھنے کے لئے ..... دن بنایا...... تاکہ لوگ متحرک رہیں...... اُن کے اعصاب مفلوج نہ ہو جائیں ... یہ سب کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو شعور بخشنے کے لئے پیغمبروں کا سلسلہ قائم کیا اور شعور کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے اپنے محبوب بندے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتخاب کیا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ..... پیغمبر تسلسل کے ساتھ تشریف لاتے رہے۔ سب نے ایک بات کا اعادہ کیا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے...... وہی معبود ہے...... وہی حاکم ہے...... اور وہی تمام مخلوقات کو عدم سے وجود میں لانے والا خالق ہے.... اس ایک اعلان کے ساتھ ساتھ ہر نبی نے یہ بھی فرمایا کہ

اللہ کے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئیں گے......

آسمان سے نازل ہونے والے صحائف تورات، بائبل، وید اور دوسری تمام الہامی کتابوں میں اس بات کا اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی شعور اور دین کی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمائیں گے.....اللہ کا وعدہ برحق ہے اور پیغمبروں کا ارشاد سچ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور اُن کے اوپر دین کی تکمیل ہوگئی......محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تکمیل شدہ دین کی تبلیغ اور رشد و ہدایت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ صراطِ مستقیم پر قائم رہے......

دین کی تکمیل کا ایک روشن باب یہ ہے کہ دینِ حنیف پر قائم رہنے والے تمام حضرات و خواتین قرآنی احکامات پر عمل کرتے ہیں......

قرآن فرماتا ہے:

اور جو لوگ صاحبِ علم ہیں اور علمِ یقین اُنہیں حاصل ہوگیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارا جینا، ہمارا مرنا سب اللہ کے لئے ہے۔ اور وہ اپنے یقین اور مشاہدے کی بناء پر یہ بھی کہتے ہیں کہ کائنات کی حرکت، کائنات کی ہر کروٹ، کائنات میں موجود ہر گلیکسی (Galaxy)، سات آسمان، آسمانوں میں ان دیکھی مخلوق، اربوں دنیائیں، کروڑوں سورج اور چاند۔ ان سب کا منزلوں میں سفر کرنا اور ایک دوسرے سے تعرض نہ کرنا یہ سب اللہ کی طرف سے ہے......
قرآن نے یہ فرمایا: ''آسمانوں کو بروج سے زینت بخشی دیکھنے والوں کے لئے۔ اور اس زینت کو چھپا لیا شیطان مردود سے۔''

قرآن یہ بھی کہتا ہے:

''اللہ انسان کی جان سے اقرب ہے۔''

اقرب سے مراد اتنی قربت کہ جس کو ملی میٹر Millemeter میں بھی بیان نہیں کیا جا سکتا......

قرآن کہتا ہے............

''اللہ تمہارے اندر ہے۔ تم اللہ کو دیکھتے کیوں نہیں''

یہ مقدس آیتیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ علم دو ہیں......

ایک علم وہ ہے جو ہمیں آنکھوں سے نظر آتا ہے ......

اور ایک باطنی علم ہے جو ہمیں روح کی آنکھ سے نظر آتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مخصوص شاگردوں کو ظاہری اور باطنی دونوں علوم منتقل فرمائے......

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ارشاد ہے "تم پر ابوبکر کو نماز روزے کی کثرت کی وجہ سے فضیلت نہیں بلکہ اُس علم کی وجہ سے ہے جو اُن کے سینے میں ہے۔۔"

حضرت عمرؓ کے بارے میں فرمایا "میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔"

ہوا اور دریائے نیل پر حضرت عمرؓ کا تصرف اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ روحانی علوم سے آراستہ تھے .....

حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد ہے "میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔"

اس ارشاد میں اس بات کی وضاحت ہے کہ حضرت علیؓ علوم باطنیہ کا سرچشمہ ہیں۔۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں "مجھے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو قسم کے علوم ملے۔

ایک علم تو میں نے ظاہر کردیا اور دوسرے کو چھپ لیا۔"

اصحابِ صفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق میں دنیا کی ہر شئے کی نفی کردی تھی... سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سرپرستی میں یہ جماعت عبادت وریاضت اور مجاہدۂ نفس میں مشغول رہتی تھی...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ ان کو درس دیتے تھے۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے اور لوگوں کو اصحاب صفہ کا خیال رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔...

صحابہ کرامؓ اور صحابہ کرامؓ کی طرز فکر کو اپنانے والوں میں یہ خوبیاں موجود تھیں کہ اُن کے قلوب اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق میں سرشار رہتے تھے اور انوار وتجلیات کا ان کے اوپر نزول ہوتا رہتا تھا..... روحانی علوم کے ماہرین حضرت علیؓ، امام زین العابدینؒ، امام باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ نے روحانی ادراک کے ذریعے وارد ہونے والے کشف والہام، مشاہداتِ غیبی اور وجد وکیفیات کی تشریح کر کے لوگوں کو صحابۂ کرامؓ کی فضیلت سے آگاہ کیا......

جب خلافت بادشاہت میں تبدیل ہوگئی .... عیش وعشرت اور جاہ طلبی حکمرانوں کا مقصدِ حیات بن گیا اور خلفاء نے علمائے سوء کو زرخرید جنس بنا دیا تو علمائے باطن سر جوڑ کر بیٹھے اور اُنہوں نے باطنی علوم کی درجہ بندی کی..... موجود دور کے مطابق ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اُنہوں نے علوم باطنی کے لئے سلیبس Syllabus بنایا......

کیوں کہ خلفاء نے بصرہ، کوفہ میں ظلم وستم کی انتہا کردی تھی اور زندگی کا مقصد جائز وناجائز دنیا کمانے اور

عیش وعشرت کے حصول کے علاوہ کچھ نہیں رہا تھا...... محض دنیا طلبی (ضروریات زندگی کا حصول نہیں) عیش و عشرت، تشدد و بربریت، غرور و برتری، نظامِ کائنات میں دخل اندازی، خود غرضی، عیاری، چالاکی، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ (جو کسی بھی قسم کے زہر سے کم نہیں ہے)...... اسلام کے بالکل منافی اعمال ان کا مقصد بن گئے تھے۔ تب...... علمائے باطن نے لوگوں کو تبلیغ کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرز فکر کے مطابق زندگی گزاریں......

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غریب نہیں تھے...... اُس زمانے میں روایت کے مطابق پانچ اونٹنیاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھیں جو اِس دور کی پانچ مرسڈیز کاروں کے برابر ہیں...... اگر ایک مرسڈیز کی قیمت ۸۰ لاکھ روپے تسلیم کرلیں جو اس سے کہیں زیادہ ہے تو پانچ کی قیمت چار کروڑ روپے ہوئی......

حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھجوروں کے باغات تھے...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دس ازواج مطہرات تھیں اور سب کے الگ الگ گھر تھے...... دس ازواج مطہرات کے دس گھروں کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس چولہوں کے اخراجات پورے فرماتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصحابہ صفہ کی خورد ونوش، لباس، رہائش، دکھ درد، بیماری اور سفر کے اخراجات برداشت فرماتے تھے ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہترین خوشبو ''عود'' شوق سے استعمال فرماتے تھے...... جو مہنگی ترین خوشبو ہے ...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرز زندگی اپنانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو بھرپور طریقے سے استعمال کرو...... خود فائدہ اُٹھاؤ اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاؤ...... اور اس نعمت کے بارے میں یہ یقین رکھو کہ یہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے......

جن حضرات نے علمائے باطن کے سلسلے کے مطابق باطنی علوم سیکھے، اُنہوں نے اُن تمام چیزوں سے کنارہ کرلیا جو اس راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھیں...... اس طرح اُن کا ذہنی، قلبی اور روحانی رابطہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قائم رہا......

قرآن کہتا ہے:

''جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں۔ ہم اُن پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔''

جب ان لوگوں پر عرفانِ نفس اور معرفت الٰہی کے دروازے کھل گئے تو اُنہیں روحانی ادراک اور مشاہدات

کی نعمتیں میسر آئیں۔

صحابہ کرامؓ سے تابعین تک، تابعین سے تبع تابعین تک...... اور تبع تابعین کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرزِ فکر کے حامل علمائے باطن حضرات نے عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی کو مقصد زندگی بنانے کے لئے مجوزہ سلیبس میں قرآنی احکامات کی روشنی میں اضافے کئے......

اور تقریباً دو سو پچاس ہجری تک انبیاءؑ کے وارث علمائے باطن روحانی تصرف اور وجدانی کلام کے ذریعے لوگوں میں روحانی شعور بیدار کرتے رہے...... بتایا جاتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور میں کم وبیش پچیس فیصد لوگوں میں روحانی شعور بیدار تھا اور وہ مشاہدات کی دنیا سے واقف تھے۔

اس طرح تمام سلاسل کی بنیاد پڑی۔ سلاسل تو تقریباً دو سو ہیں۔ لیکن برصغیر پاک و ہند میں چار سلاسل کو خصوصی طور پر جانا جاتا ہے۔ اس میں سلسلہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ سلاسل کا نام زبان زدِ عام ہے۔ جبکہ درحقیقت سلاسل تو بہت سارے ہیں۔ لیکن ان تمام سلاسل کی تعلیمات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہمیں صرف ایک ہی بات نظر آتی ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہے، انسان فانی ہے، اصل انسان وہ ہے جو اپنی روح سے واقفیت حاصل کرے اور روح چونکہ اللہ کو ازل میں دیکھ چکی ہے اس لئے روح سے واقف ہونے کے بعد بندہ اللہ کو جان لے، پہچان لے اور دیکھ کر اس کی ربوبیت کا اقرار کر لے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی رحمت و نسبت سے اب سلسلہ عظیمیہ کی بنیاد پڑی ہے۔ سلسلہ عظیمیہ کی تعلیمات بھی وہی تعلیمات ہیں جو تمام سلاسل کی تعلیمات ہیں جو تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیمات ہیں اور جو تعلیمات سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات ہیں۔ یہ وہی تعلیمات ہیں جو کہ قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔ انہی تعلیمات کی اشاعت کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم کرتے ہوئے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصی رحمت و نسبت سے یہ جگہ کاہنہ میں جامعہ عظیمیہ کے لئے عطا کر دی ہے۔ انشاء اللہ یہ جگہ نوعِ انسانی کے لئے ایسا مرکز ثابت ہوگی جہاں سے لوگ عرفانِ خداوندی کے علوم سیکھ کر جائیں گے۔

میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے بلاشبہ ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ میاں صاحب ہیں تو ایک سنگل پسلی کے انسان مگر کام بڑے بڑے کر جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس کام کا کریڈٹ بھی میاں صاحب ہی کو جاتا ہے جنہوں نے ایک ایسا سنٹر بنانے کی کوشش کی ہے جہاں سے نوعِ انسانی کو اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی پہچان ملے گی اور نوعِ انسانی

اپنے مسائل سے نجات حاصل کرے گی۔

اس کے لئے میں میاں صاحب اور ان کے ساتھیوں کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ میاں صاحب اوران کی ٹیم کی اس پرخلوص کاوش کو قبول فرمائیں۔(آمین)

آپ سب حضرات کا بہت بہت شکریہ کہ آپ سب لوگ سخت سردی میں اتنی دور دراز سے سفر کر کے اس دور افتادہ جگہ پر صرف اللہ کے نام پر، اللہ کے لئے اور اللہ کی پہچان کی خاطر اکٹھا ہوئے۔

آپ سب حضرات کا بہت بہت شکریہ! اللہ آپ کو خوش رکھے۔(آمین)

السلام علیکم!

☆......☆......☆

جامعہ عظیمیہ کے سنگ بنیاد کے موقع پر حضرت عظیمی دعا کرتے ہوئے

مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی مراقبہ ہال لاہور کی جگہ کا معائنہ کررہے ہیں

دوسری بین الاقوامی روحانی کانفرنس سے خطاب

۱۱ جنوری ۱۹۹۱ء بروز جمعۃ المبارک صبح ۱۰ بجے سلسلہ عظیمیہ اور قلندر شعور فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی دوسری بین الاقوامی روحانی کانفرنس مراقبہ ہال جامعہ عظیمیہ کاہنہ نو، لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس روحانی کانفرنس میں لاہور شہر کے علاوہ کراچی شہر سے مرشدِ کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے ہمراہ معزز مہمانانِ گرامی اور بڑی تعداد میں برادرانِ سلسلہ عظیمیہ تشریف لائے جنہوں نے اہل لاہور کی اخوت کے دلی جذبات کو بہت پسند فرمایا۔ لندن سے سلسلہ عظیمیہ کی انچارج باجی سیّدہ سعیدہ خاتون عظیمی صاحبہ اور ان کے شوہر عبد الحفیظ عظیمی صاحب اور ڈاکٹر ممتاز عظیمی صاحب بھی تشریف لائے۔ اس کے علاوہ سعودی عرب، ابوظہبی سے بھی مہمان تشریف لائے۔ نیز اندرون ملک سے کراچی کے علاوہ، پشاور، آزاد کشمیر، راولپنڈی، جہلم، فیصل آباد، گوجرانوالہ، اوکاڑہ، ساہیوال، چنیوٹ، سیالکوٹ، نواب شاہ، حیدر آباد اور پھالیہ سے کثیر تعداد میں خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ روحانی کانفرنس کے موقع پر ایک سووینیئر بھی شائع کیا گیا جس میں سلسلہ کی خدمات کا بتایا گیا تھا۔ کانفرنس کے اختتام پر لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کا انتظام بھی کیا گیا تھا جس کو بہت سراہا گیا، اس کانفرنس میں جن حضرات نے مقالے پڑھے ان میں طاہر جلیل عظیمی صاحب قاضی مقصود احمد عظیمی صاحب، محمد ادریس عظیمی صاحب، ڈاکٹر ممتاز ظفر عظیمی صاحب، ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی صاحب اور محترمہ سیدہ سعیدہ خاتون عظیمی صاحبہ شامل ہیں۔ اس موقع پر مرشدِ کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی ایک کتاب ''کشکول'' اور میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب کی کتاب ''یارانِ طریقت'' کی رونمائی بھی کی گئی۔ آخر میں میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے تمام مہمانانِ گرامی اور انتظامی امور کی کمیٹیوں کا شکریہ ادا کیا۔ جن کے توسط سے یہ پروگرام کامیاب ہوا۔

مرشدِ کریم نے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

میری روحانی اولاد بزرگو دوستو میں آپ کا انتہائی شکرگزار ہوں کہ آپ حضرات اس سردی میں اپنے گرم گرم کمروں کو چھوڑ کر اس کھلے میدان میں تشریف لائے۔ بلاشبہ میری سعادت کے ساتھ ساتھ آپ کی بھی سعادت ہے اس لئے کہ اس بیابان میں آپ کی تشریف آوری کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ آپ کے دلوں میں اللہ کے رسول محمد ﷺ کی محبت ہے۔ اور اللہ کی ذات ہے اور آپ کے دِل یہ ڈھونڈنا چاہتے ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے ماننے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ اور اُن کی قربت سے ہمیں جو سکون حاصل ہوتا ہے وہ کیوں حاصل ہوتا ہے۔

آج کی نشست میں ماشاء اللہ اتنے سارے حضرات تشریف فرما ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابھی زمین بنجر نہیں ہوئی۔ زمین اچھی ہے صرف اس میں آبیاری کی ضرورت ہے۔ اگر زمین میں صحیح معنوں میں آبیاری کی جائے تو یہ زمین جو بنجر کہلاتی ہے بنجر نہیں رہتی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان قوم تو قوم ہی نہیں رہی، بات یہ نہیں ہے مسلمان قوم تو قوم ہے۔ مسلمان قوم کو راستہ دکھانے والے وہ نہیں رہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے۔ جیسے جیسے نبوت کا زمانہ دُور ہوتا چلا گیا۔ ہمارے یہاں مذہب میں مصلحتیں شامل ہوتی رہیں اور مصلحتوں کی بنیاد پر مسلمان اپنے اسلاف کے ورثے سے محروم ہوتا چلا گیا۔ بہرحال آپ حضرات تشریف لائے آپ کا بہت بہت شکریہ۔

میرے بچوں نے ابھی جو آپ کے سامنے مکالے پڑھے اور تقریریں کیں۔ ان تقاریر کو سُن کر مجھے خوشی ہوئی اور آپ نے بھی یہ اندازہ کرلیا ہے اچھی طرح کہ اگر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے اعلان پر کوئی بندہ کتنا بھی تہی دامن ہو کتنا بھی کم علم ہو کتنا بھی کوتاہ عقل ہو اگر خلوصِ نیت کے ساتھ راستے پر چل کھڑا ہو تو شروع شروع میں اس کے ساتھ دشواریاں پیش آتی ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے ارادے کا اور عزم کا پکا ہے تو پھر اُس کے ساتھ ایک قافلہ لگ جاتا ہے۔

اور آج آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ دس سال کی جدوجہد اور کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ اس قافلے میں اللہ تعالیٰ نے ایسے جواہرات پیدا کردیے ہیں کہ وہ خود آگہی سے بھی آشنا ہوگئے ہیں اور خود آگہی کا دوسروں کو درس بھی دے سکتے ہیں۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب نبوت کا اعلان فرمایا تو کتنے لوگ تھے جو اُن کو ماننے والے تھے۔ چُھپ چُھپ کر تبلیغ کی جاتی تھی۔ پھر ایک، ایک سے دو، دو سے تین، تین سے چار ہوئے۔ حضور پاک ﷺ کی اس دعوت کے اوپر کہ وہ اللہ کی مخلوق کو، قریش مکہ کو، اہل مکہ کو عذاب ناک زندگی سے

محفوظ کرنے کے بعد پُرسکون زندگی میں داخل کرنا چاہتے تھے۔ حضور ﷺ کا صرف یہی قصور تھا حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی یہ جو تمہاری زندگی ہے بُت پرستی کی زندگی یہ عذاب ناک زندگی ہے۔ یہاں بھی عذاب ناک اور آخرت میں بھی عذاب ناک۔ زندگی میں اللہ نے جو راستہ بتا دیا ہے حکم دیا ہے کہ میں نے جو تمہیں راستہ دیا ہے یہ راستہ عذاب ناک نہیں ہے، سکون کا راستہ ہے۔ اُنہوں نے وہ بات سُنی اور سننے کے بعد کسی نے مجنوں کہا کسی نے دیوانہ کہا کسی نے جادوگر کہا۔ آپ یہ غور فرمائیں اُنہیں کس بات کی سزا دی جا رہی تھی۔ سزا اِس بات کی دی جا رہی تھی۔ کہ ایک خدا کا بندہ اُٹھتا ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ بھائی جس راستے پر تم چل رہے ہو یہ راستہ عذاب کا راستہ ہے اس راستے کو چھوڑ دو۔ میں جس راستے کی نشاندہی کر رہا ہوں وہ مجھے اللہ نے بتایا ہے۔ اُس راستے پر اگر تم آ جاؤ گے تو عذاب ناک زندگی سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ لوگوں کی عقل کا یہ عالم ہے، لوگوں کے اوپر شعور کا اتنا زیادہ غلبہ ہے کہ لوگوں نے کہا کہ اچھا ایک آدمی اُٹھا اور ہمیں سکون کے راستے پر ڈالنا چاہتا ہے۔ اُنہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ بندہ مخلص ہے، یہ بندہ محبت کرنے والا ہے، یہ بندہ مشفق ہے، یہ بندہ ہم سے کوئی غرض اور لالچ بھی نہیں رکھتا۔ ہم سے کسی مالی منفعت کا بھی طلبگار نہیں۔ کسی چودھراہٹ کا بھی خواہش مند نہیں۔ لیکن اُنہوں نے حضور پاک ﷺ کو اس دعوت کے نتیجے میں اتنی سزا دی اور اتنا پریشان کیا کہ اُن کا بائیکاٹ کر دیا۔ کھانا پینا اُن کے اوپر بند کر دیا۔ اور انتہا یہ کہ اذیت ناک پہلو کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ یہ کس بات کی سزا ہے۔ یہ اس بات کی سزا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کی مخلوق کو عذاب سے بچانے کی دعوت دیتے تھے۔ اب غور فرمائیں کہ نوعِ انسانی کا شعور کتنا تاریک ہے کتنا کم ہے کہ اُس کو یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ ایک مخلص بندہ میرے لئے خلوصِ نیت کے ساتھ مجھے سیدھے راستے پر ڈالنا چاہ رہا ہے مجھے اُس کی بات سُننی چاہیئے۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا اثر ہُوا لیکن بہت کم ہوا۔ چند آدمی حضور پاک ﷺ سے مل گئے۔ گنے چُنے تاریخ سبھی نے پڑھی ہے۔

اب اُن بندوں کا رسول اللہ ﷺ کی قربت میں ایک ایسا مزاج بنا ایک ایسی اُن کے اندر طرزِ فکر پیدا ہوئی کہ اُنہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی طرزِ فکر پر دعوت دینا شروع کر دی۔ اُن کے راستے پر بھی لوگ حائل ہوئے۔ حضرت بلالؓ کی ہستی آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ اُن لوگوں کو بھی مارا پیٹا گیا، اُن لوگوں کو بھی ریت پر ڈال کر گھسیٹا گیا۔ اتنا مارا گیا کہ کھال پھٹ گئی اور جسم سے لہو اور چربی بہنے لگی۔ لیکن اُن بندوں نے بھی اللہ کی دعوت کو نہیں چھوڑا۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ اور اللہ کے پیغام کو عام کرتے رہے۔ اس لئے کہ اُن کے اندر رسول اللہ ﷺ کی طرزِ فکر جانگزیں ہوگئی تھی۔ اس طرزِ فکر کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی دعوت دی، اللہ کی وحدانیت کی

دعوت دی، اللہ کی وحدانیت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پُرسکون رہنے کی دعوت، اس دنیا میں بھی پُرسکون رہنے کی دعوت اور مرنے کے بعد آخرت میں بھی پُرسکون رہنے کی دعوت۔ پھر ایسا ہوا کہ لوگوں کا اژدہام ہوگیا۔ بہت سارے لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے رسول اللہ ﷺ کو ایسے مل گئے کہ اُنہوں نے عجیب وغریب جانثاری کا ثبوت پیش کیا۔ اور پھر اسلام پھیلتا چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد، پردہ فرمانے کے بعد اُن کے دوست اُٹھے اُنہوں نے اس مشن کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ اور اُنہوں نے بھی اُنہی طرزوں میں کوششیں شروع کر دیں۔ جن طرزوں میں رسول اللہ ﷺ نے کوشش فرمائی تھی۔ یہ بھی دیکھیں اسلام کا غلبہ ہوا، فتوحات زیادہ ہوئیں۔ جیسے جیسے مسلمان دنیاوی غرض میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ اسی مناسبت سے لوگوں کو اسلام میں ایسی ایسی چیزیں داخل کرنے کا موقع ملا کہ اسلام کا جو اصل چہرہ تھا وہ مصلحتوں کی نظر ہوگیا۔ اسلام میں بادشاہت آئی اگر بادشاہت اسلام میں جائز ہوتی تو قریش مکہ تو حضور پاک ﷺ سے خود ہی کہتے تھے کہ آپ یہ دعوتِ دین چھوڑ دیں ہم آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں گے۔ لیکن بادشاہت اسلام میں داخل نہیں ہوئی۔ جب بادشاہت اسلام میں داخل ہوگئی۔ تو بادشاہت کے تقاضے بھی جو بادشاہت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھے۔ وہ بھی اسلام میں داخل ہوگئے۔ اور پھر ایسا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ اسلام کی جو بنیاد تھی وہ کدھر چلی گئی۔ اسلام کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا کہ اسلام کی روح پردے میں چلی گئی اور اسلام کو ظاہر کھا گیا۔

آج کے دور میں مسلمانوں کا جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ مسلمان عبادت کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، حج کرتے ہیں، لیکن وہ نمازیں مسلمان نہیں قائم کرتے ہیں جو ہمارے اسلاف قائم کرتے تھے، حج کرتے ہیں اُن حجوں کا ہمیں وہ فائدہ نہیں پہنچتا جو ہمارے اسلاف کو فائدہ پہنچتا تھا۔ اور جہاد تو اسلام میں سے نکل ہی گیا۔ جہاد کا تو کوئی تذکرہ ہی نہیں رہا۔ تو بات یہ ہوئی کہ اسلام میں بادشاہت آنے کے بعد اسلام کی روح جو ہے وہ پردے میں چلی گئی اور اسلام کا جو ظاہری رُخ ہے وہ سامنے آ گیا۔ تو اس وقت ہماری جو پوزیشن ہے وہ یہ ہے کہ اسلام تو ہمارے پاس ہے وہی اسلام، اسلام میں کوئی فرق نہیں پڑا جو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی بنیاد ڈالی تھی اسلام وہی ہے اگر حضور پاک ﷺ نے وحدانیت کی دعوت دی تھی تو وحدانیت کی دعوت آج بھی ہے

حضور پاک ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ گورے کو کالے پر فضیلت نہیں ہے اور کالے کو گورے پر فضیلت نہیں ہے۔ اللہ کے ہاں افضل وہ ہے جو متقی ہے۔ یہ بات آج بھی ہم زبان سے کہتے ہیں۔ اگر حضور پاک ﷺ کے زمانے میں پانچ وقت مسجد میں اذان ہو کر نماز ادا ہوتی تھی تو آج بھی تمام مساجد میں اذان بھی ہوتی ہے اور نماز بھی

لوگ پڑھتے ہیں۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دور میں پانچ سو آدمی حج کو آتے تھے تو آج کے دور میں بیس بائیس لاکھ لوگ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ وہ پانچ سو آدمیوں کا طواف ساری دنیا کو لرزا دیتا تھا۔ اب بائیس لاکھ آدمیوں کا طواف جو ہے وہ غیر مسلموں کے اوپر اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا ایک مچھر کے کاٹنے کا ہوتا ہے۔ اگر وہاں ایک آدمی اللہ اکبر کہتا تھا تو جواب میں لوگ اللہ اکبر کے جواب میں نعرہ لگاتے تھے تو دشمنوں کے دل دہل جاتے تھے عورتوں کا حمل ساقط ہو جاتا ہے۔ اور آج کتنا ہی آپ اللہ اکبر تکبیر کے نعرے لگاتے رہیں وہ بالکل ایک آواز ہے آواز جیسے فضا میں گم ہوگئی اُس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کیا وجہ ہے اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حضور پاک ﷺ نے جو اسلام پیش کیا اُس میں ظاہر اور باطن دونوں رُخ تھے۔ جسمانی تقاضوں کے ساتھ ساتھ روحانی تقاضے بھی موجود تھے اور روحانی تقاضوں کے ساتھ ساتھ جسمانی تقاضے بھی موجود تھے۔ اگر مادیت کی ضرورت تھی تو مادیت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ مسلمان یہ بھی جانتا تھا کہ میری ایک بنیادی ضرورت اللہ کا نُور بھی ہے، اللہ کی تجلی بھی ہے۔ ''اَللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضُ''

آج صورت یہ ہے کہ ہم اپنے جسمانی تقاضوں سے تو واقف ہیں۔ لیکن جس روح نے جس تجلی نے ''اول ما خلق اللہ نوری'' کے تحت حضور پاک ﷺ کے جس نور سے ہماری زندگی بخشی ہوئی ہے۔ جس نور سے ہمارے اندر حرارت پیدا ہوتی ہے جس نور سے ہماری زندگی میں حرکت ہے ہم اُس سے واقف نہیں ہیں۔

ہم واقف ہیں صرف مادیت سے۔ ہم واقف ہیں صرف ظاہر سے۔ باطن سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ ظاہر سے ہمارا رشتہ اِس طرح جُڑ گیا ہے کہ اگر کوئی آدمی اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ مسلمان تیرا کوئی باطن بھی ہے تو لوگ اُس کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ کیا بات ہوئی باطن سے کیسے رشتہ ہوگیا۔ اگر تمہارا باطن سے رشتہ نہیں ہے تو جب تم مر جاتے ہو اور تمہارا جسم ایک لاش کی مانند ہو جاتا ہے تو تمہارے اندر کوئی حرکت کیوں نہیں ہوتی۔ آپ نے کبھی کسی لاش کے اندر کسی مردہ آدمی کے اندر حرکت دیکھی ہے۔ کیا اس سے بڑی کوئی مثال ہوسکتی ہے دنیا میں جب ایک آدمی مر جاتا ہے تو اُس کی تمام حرکات و سکنات ساقط ہوجاتی ہیں۔ وہ آدمی جو سُوئی کے چبھنے سے چیخ اُٹھتا ہے اُس کے ایک ایک عضو کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں تو وہ سسکاری بھی نہیں بھرتا کیوں؟ اس لیے کہ مادیت کو جس نور نے، جس روشنی نے، جس روح نے سنبھالا ہوا تھا اُس نور نے، اُس روشنی نے اُس مادی جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔ یہی صورت حال اسلام کی ہے۔ اسلام الگ چیز ہے ایمان الگ چیز ہے۔ اسلام ظاہری رُخ ہے ظاہری جسم ہے ایمان باطنی رُخ ہے باطنی جسم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ ہم

مسلمان ہیں۔ ہاں تم مسلمان تو ہو"ولما یدخل ایمان فی قلوب کم" ابھی تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔ اس کا مطلب ہے اسلام الگ چیز ہے ایمان الگ چیز ہے۔ ہماری یہ جو عبادتیں ہیں ہماری یہ جو نمازیں ہیں ہمارا یہ جو حج ہے یہ اسلامی تقاضوں کے تحت تو پورے ہو رہے ہیں لیکن اس کے اندر ایمان داخل نہیں ہوا۔ یعنی اس میں روح شامل نہیں۔ جب تک مسلمان کے اندر اُس کا باطن بیدار نہیں ہو جائے گا۔ جب تک مسلمان کے اندر اُس کی روح متحرک اور بیدار ہو کر آنکھوں کے سامنے نہیں آ جائے گی۔ اُس وقت تک رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا تقاضا پورا نہیں ہوگا۔

- اگر آپ کو رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا تقاضا پورا کرنا ہے اور واقعتاً اگر آپ اس قول میں سچے ہیں کہ آپ نبیء برحقؑ سے محبت اور عشق کرتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ کے پیش کردہ اسلام کے دونوں رُخوں پر عمل کریں۔ اگر آپ نماز میں کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہتے ہیں تو آپ کا یہ یقین ہونا چاہیئے کہ اب دنیا میں اللہ سے بڑا کوئی معبود نہیں ہے۔ لیکن ہماری صورت یہ ہے کہ ہم نماز میں پچاس مرتبہ اللہ اکبر کہتے ہیں اور ہمارا ذہن اللہ کی طرف نہیں رُکتا دنیا کی طرف خوب دوڑتا ہے۔ ہم نے مادیت کو اپنی زندگی کی معراج بنا لیا ہے۔ جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا یہ جسم، گوشت پوست کا جسم، مادیت کا جسم ایک دن فنا ہو جاتا ہے۔ جتنے بھی یہاں حضرات تشریف فرما ہیں سب کو یہ پتا ہے کسی کے دادا کا انتقال ہوگیا کسی کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ کسی کی ماں کا انتقال ہوگیا اور جس طرح اُن کا انتقال ہوگیا اسی طرح ایک دن ہم نے بھی مر جانا ہے۔ یہ مادی جسم فنا ہو جائے گا۔ لیکن روح فنا نہیں ہوگی۔ تو اگر مسلمان اپنی روح کا عرفان حاصل نہیں کرے گا۔ مسلمان سے مراد مرد نہیں مسلمان سے مراد مرد، عورت دونوں ہیں۔ اگر خواتین وحضرات اپنی روح کا عرفان حاصل نہیں کریں گے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر صحیح معنوں میں لبیک نہیں کہا۔

تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا آدھا حصہ قبول کر لیا اور آدھے حصے کو رد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ "الم ذالک الکتاب لا ریب فیہ" یہ کتاب ذالک یہ کتاب لا ریب فیہ اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے۔ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کیا کہہ رہے ہیں۔ ذالک الکتاب یہ کتاب اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہے۔ یعنی یہ کتاب اُن لوگوں کو فائدہ پہنچا سکتی ہے جو شک وشبہ سے بالاتر ہیں۔ اگر آپ کے اندر شک ہے شبہ ہے وسوسہ ہے یہ کتاب آپ کے لیے نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ کتاب شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں رکھتی ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ھدً للمتقین یہ کتاب اُن لوگوں کو

ہدایت بخشتی ہے جو متقی ہیں۔ دیکھئے ھد اللمسلمین نہیں فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ بہت غور طلب بات ہے ھد اللعالمین نہیں فرمایا، ھد اللمتقین، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کتاب اُن لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے جن لوگوں کے اندر شک اور شبہ نہیں ہے۔ شک اور شبہ کن لوگوں کے اندر نہیں ہوتا۔ شک و شبہ اُن لوگوں کے اندر نہیں ہوتا۔ جو لوگ کسی چیز کو دیکھ لیتے سمجھ لیتے ہیں۔ یعنی اُن کے اندر یقین کا پیٹرن ہوتا ہے مثلاً ایک آدمی کہتا ہے میں نے فرشتہ دیکھا کسی نے پوچھا بھائی فرشتہ کیسا ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ایسا ہوتا ہے، کوئی کہتا ایسا ہوتا ہے، کوئی کہتا ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ایک بندہ ایسا ہے جس نے فرشتہ کو دیکھا ہے آپ پوچھیں فرشتہ کیسا ہوتا ہے وہ بتا دے گا فرشتہ ایسا ہوتا ہے آپ نے بکری کو دیکھا ہے اس لیے آپ سے بکری کے بارے میں پوچھا جائے گا تو آپ بکری کی تعریف بتا دیں گے۔ لیکن اگر آپ نے بکری کو نہیں دیکھا تو کبھی آپ بکری کی تعریف گھوڑے کے روپ میں کریں گے، گائے کے روپ میں کریں گے، بھیڑ کے روپ میں کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کا یہ نظام ہے کہ اس نظام میں اگر شک و شبہ اور وسوسہ ہے وہ سب ضائع ہے۔ اگر نظام میں شک و شبہ اور وسوسہ نہیں ہے یقین ہے وہ سب کا سب باطن اور اجر ہے۔ جب تک بندہ اپنی روح سے دور رہتا ہے وہ شک و شبہ میں مبتلا رہتا ہے اور جب کوئی بندہ اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے اُس کے اندر یقین کے علاوہ کوئی چیز دوسری ملتی ہی نہیں ہے۔

حضور پاک ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ نے لا اِلٰہ اللہ محمد الرسول اللہ زبان سے کلمہ پڑھ لیا۔ اب اُن کو ساتھ لالچ بھی دیا جا رہا ہے۔ اُنہیں مارا پیٹا بھی جا رہا ہے اُن کا جسم بھی پھاڑا جا رہا ہے۔ لیکن وہ ٹس سے مَس نہیں ہوتے وہ کہتے ہیں نہیں، لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب اُنہوں نے یہ کہا لا الٰہ لا الٰہ کا مطلب یہ کہ اُنہوں نے یہ کہہ دیا کہ کوئی معبود نہیں۔ جتنے باطل معبود تھے اُن کی نظروں سے سب الگ ہو گئے۔ الا اللہ ایک بس معبود، اللہ ہے بس، تین سو ساٹھ بُت نہیں ہیں صرف ایک اللہ ہے۔ جب تین سو ساٹھ بتوں کی نفی ہو گئی اور ایک اللہ اُن کی نظروں کے سامنے آ گیا اور محمد الرسول اللہ کہہ کر انہوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ یہ اللہ یہ ایک اللہ جو ہے اس اللہ کا قاصد محمد الرسول اللہ ہے۔ تو ان کے اندر یقین کا پیٹرن بن گیا۔ اور یقین کے پیٹرن کی بنیاد پر اُن کی روح نے اللہ کو بھی دیکھ لیا اور رسول اللہ ﷺ کو قاصد کی حیثیت سے بھی دیکھ لیا۔

آج صورت یہ ہے کہ ہم کلمہ پڑھتے ہیں۔ ہمارا سارا زور زبانی الفاظ پر ہے۔ یقین ہمارے اندر نہیں ہے تو اس یقین کے نہ ہونے کی وجہ سے جس طریقے سے یقین ہمارا ٹوٹتا چلا گیا۔ اس مناسبت سے ہم ایمان سے دور ہوتے چلے گئے۔ مسلمان تو ہیں۔ لیکن ایمان سے دور ہوتے چلے گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ”ذالک الکتاب یہ

کتاب اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے شک وشبہ والا آدمی اسے نہیں سمجھ پاتا۔

وہ الگ بات ہے کہ یہ کتاب ہے کیا؟ ساری کائنات کی تسخیر کے سارے فارمولے موجود ہیں اس کتاب میں، یہ کتاب شک وشبہ سے بالا ہے اس لئے شک وشبہ والا آدمی اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ دوسری بات اللہ تعالٰی نے فرمائی ''ھُدًا لِلمُتَّقِین'' اور ساری دنیا جانتی ہے کہ یقین کی Definition یہ ہے کہ اُس کا آپ مشاہدہ کرتے ہیں جب تک آپ مشاہدہ نہیں کریں گے یقین جو ہے وہ نہیں بنے گا۔ تکمیل نہیں ہوگی۔

میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ صاحب آپ کسی عدالت میں جائیں وہاں کسی صاحب کی آپ نے گواہی دی، تو جج نے پوچھا کہ صاحب یہ جو آپ گواہی دے رہے ہیں۔ کیا آپ اس واقع کے عینی شاہد ہیں گواہ نے کہا میں عینی شاہد تو نہیں ہوں میرے بہت بڑے کرم فرما ہیں بڑے اچھے بزرگ ہیں دوست ہیں نمازی ہیں پرہیزگار ہیں انہوں نے مجھ سے کہا ہے۔ تو کیا عدالت آپ کی گواہی کو تسلیم کرلے گی۔ کیوں بھائی؟ کیوں؟ عدالت آپ کی گواہی کو اس لیے تسلیم نہیں کرے گی کہ واقعہ جو ہے آپ نے نہیں دیکھا۔ آپ اُس کے عینی شاہد نہیں ہیں۔ اور جب آپ عینی شاہد ہیں تو آپ کہیں گے کہ صاحب یہ واقع میرے سامنے ہوا اور میں نے اس کو دیکھا آپ میری گواہی کو تسلیم کریں عدالت آپ کی گواہی کی تسلیم کرے گی۔

کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ روح مرگئی۔ کیا کوئی آدمی روح کے بارے میں محدود ہونا تسلیم کرسکتا ہے۔ کیونکہ روح محدود نہیں ہے اللہ بھی محدود نہیں ہے اگر آپ اپنی روح سے اللہ کو پکاریں گے اللہ کے اُوپر لازم ہے کہ اللہ آپ کی بات کا جواب دے گا اور اگر آپ اپنی روح کے ادراک کے بغیر اس جسمانی تقاضوں کے تحت لفظوں کی شکل میں اللہ کو پکارتے رہیں گے تو کچھ نہیں ہوگا۔

یہ حضور پاک ﷺ کے زمانے کے اسلام میں اور آج کے اسلام میں فرق ہے۔ حضور پاک ﷺ کے زمانے میں جو مسلمان تھے وہ اپنے مادی وجود سے بھی باخبر تھے مادی تقاضوں سے بھی باخبر تھے اُنہیں یہ علم بھی حاصل تھا کہ ہمیں اپنے مادی وجود کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں اپنے مادی وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا تقاضے پورے کرنے ہیں کس قسم کی غذا کھانی ہے اور اُنہیں یہ بھی علم تھا کہ ہمیں اپنی روح کو متحرک اور بیدار کرنے کے لیے کیا اعمال کرنے ہیں۔ جس طرح حضور پاک ﷺ مادی دنیا میں بھی رہتے تھے یہ نہیں تھا حضور پاک ﷺ یہاں کی روٹی نہیں کھاتے تھے آسمان سے کھانا نازل ہوتا تھا یہ ہی روٹی کھاتے تھے جو ہم کھاتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ حضور پاک ﷺ مادی وجود کے ساتھ روحانی وجود کو بھی برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اور یہ تعلیم رسول پاک ﷺ کی ہے کہ

مسلمان مادی وجود کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے روحانی تقاضوں کو بھی پورا کریں۔ آپ مادی وجود کے تقاضوں کے ساتھ روح کے تقاضوں کو بھی پورا کرو یہ ایمان ہے۔ اور جب تک ہم اپنے مادی وجود کو تو سب سمجھتے رہیں گے اور روحانی وجود کی طرف بھی نہیں دیکھیں گے تو ہماری جو حالت آج جتنی خراب ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آئندہ اور کتنی خراب ہوگی۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں جس طرح مادی وجود کو زندہ رکھنے کے لیے غذائی ضرورت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اس جسم کو نشوونما کے لیے غذا کھائیں اس طرح روحانی وجود کو بھی غذا ضروری ہے اور روحانی وجود کی جو غذا ہے وہ یہ ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تو ہم اپنے روحانی وجود کو تو غذا فراہم کر رہے ہیں۔ نماز بھی پڑھ رہے ہیں روزہ بھی رکھ رہے ہیں حج بھی کر رہے ہیں لیکن ہمیں یہ علم ہی نہیں ہے کہ ہمارا روحانی وجود ہے بھی یا نہیں۔ تو ایسے علم کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ یہ جو عظیمیہ سلسلہ کا مشن ہے یہ جو آپ نے اتنے سارے مکالے سُنے یہ مشن صرف ایک ہے اُس میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں، کشیدگی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو اسلام چھوڑا اُس اسلام کے ساتھ ساتھ اگر ایمان ہے تو مشن کی تکمیل ہوگی اور اگر اسلام کے ساتھ ساتھ ایمان نہیں ہے خالی اسلام ہے تو رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل نہیں ہوگی۔ تو ہمارا مشن حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا مشن رسول اللہ ﷺ کا مشن جس کی ہم نشر و اشاعت کر رہے ہیں تربیت کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی تلاش کریں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اپنا گھر بار چھوڑ دیں، شادیاں نہ کریں، بچوں کو اچھی تعلیمات نہ دلائیں، اچھا کاروبار نہ کریں، اچھا گھر نہ بنائیں، اچھا گھر تو آپ بنائیں اس لیے کہ جب ماں باپ بچوں کی اچھی زندگی سے خوش ہوتے ہیں تو مخلوق کی اچھی زندگی سے اللہ بھی خوش ہوتا ہے۔ مادی وجود کے تقاضے پورے کرتے ہوئے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے آپ اپنی روح کو تلاش کریں۔ اگر آپ اپنی روح کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر رسول اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل ہوگئی۔ اور ایک بار پھر واپس ایسا دور آ جائے گا جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا اور اگر ہم نے مادی وجود کو ہی سب کچھ سمجھ لیا جیسا کہ آج مادیت کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے اور روح کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو پھر رسول اللہ ﷺ سے قربت حاصل نہیں ہوسکتی دوریاں حاصل ہوسکتی ہیں۔

اتنے سارے لوگ یہاں تشریف لائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پروانے کے اندر ابھی طلب باقی ہے کہ وہ مادی وجود کے ساتھ ساتھ اپنے روحانی وجود کو بھی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ آپ کی یہ حاضری اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے اندر تڑپ بھی ہے، آپ کے اندر طلب بھی ہے، آپ کے اندر ذوق بھی ہے اور

آپ کے اندر سردی کو برداشت کرنے کی برداشت بھی ہے تو پھر آپ ایک اور قدم بھی بڑھائیں جہاں آپ ہزاروں قدم بڑھا کر یہاں رسول اللہ ﷺ کی محبت میں سرشار حضورؐ کی باتیں سننے کے لیے تشریف لائے تو وہاں ایک کام اور بھی کریں کہ ایک قدم اور بڑھا کر آپ یہ طے کر کے اُٹھیں کہ جس طرح ہم اپنے مادی وجود سے باخبر ہیں اسی طرح آج کے بعد کوشش کریں گے کہ اپنے روحانی وجود سے بھی باخبر ہوں۔ اور جب روحانی وجود سے باخبر ہو جائیں گے تو قرآن بھی آپ کے اوپر کھل کر سامنے آ جائے گا آپ متقی کے دائرے میں آ جائیں گے قرآن بھی آپ کو ہدایت دے گا فرشتے بھی آپ کے سامنے آ جائیں گے آپ کی اصلاح کے لیے اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا اس لیے کہ روح کے لیے کوئی پردہ نہیں ہوتا پردہ ہے مادی جسم کے لیے جب آپ اپنی روح سے واقف ہوگئے تو روح کے سامنے کوئی پردہ ہے ہی نہیں بھائی تو جب روح آپ کی بیدار ہوگئی روح کی آنکھ کھلے گی آپ کے سامنے آسمان بھی ہوگا آپ کے سامنے زمین بھی ہوگی آپ کے سامنے یہ بات بھی آ جائے گی زمین کے اندر کتنے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی تربیت اُن کے پیرو مرشد حضرت عثمان ہارونیؒ نے کی اور جب اُنہیں خلافت دینے لگے تو انہوں نے دو انگلیاں کھول کر ایسے فرمایا معین الدین کیا دیکھتا ہے معین الدین چشتی اجمیریؒ نے ہاتھ جوڑ کر کہا حضور دو اُنگلیوں میں اٹھارہ ہزار عالمین کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ یہ اٹھارہ ہزار عالمین کس طرح دیکھ لیے کیا مادی آنکھ نے دیکھ لیے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے مادی وجود کو فنا نہیں کر دیا، ختم نہیں کر دیا بلکہ مادی وجود کے رہتے ہوئے اُنہوں نے اپنی روح کو تلاش کیا اور اُنہیں جب اچھے استاد کی راہنمائی میں اس روح کا عرفان حاصل ہوگیا تو اتنی سی جگہ میں اٹھارہ ہزار عالمین کا مشاہدہ کر لیا۔ تو چلئے ہم خواجہ معین الدین چشتیؒ تو نہیں بن سکتے وہ تو بہت بڑے ہیں اگر ہم اٹھارہ ہزار عالمین کا مشاہدہ نہیں کر سکتے تو اٹھارہ عالمین کا تو مشاہدہ کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے بھی غیب کی دنیا کے اٹھارہ عالمین بھی بہت ہیں۔ ہمیں موقع ملا ہم گئے تو سہی۔ متقین کی صف میں ہمارا نام تو لکھا گیا۔ ''یومنون بالغیب'' کا جو گروہ ہے اس قافلے میں شامل تو ہوئے۔

میری آپ حضرات سے تمام خواتین سے تمام دوستوں سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ یہ بات تو ثابت ہوگئی یہاں آپ کا تشریف لانا اس سردی میں بیٹھنا یہ مجھے پتا ہے بہت دور دراز علاقوں سے بڑی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں سب کے پاس سواری تو ہے نہیں۔ اتنی صعوبت اُٹھا کر یہاں تشریف لائے اس کے پیچھے یہ بات تو ضرور ہے کہ آپ کو تلاش ہے اور تلاش مادیت کی نہیں ہے۔ مادیت کی اگر تلاش ہوتی تو شہر چھوڑ کر آپ اس بیابان میں نہیں

آتے۔ اس کھلے آسمان کے نیچے نہیں بیٹھتے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابھی بارش ہو جائے تو آپ سوچ رہے ہوں کہ ٹھنڈ ہو جائے گی، بارش ہو جائے گی، نمونیہ ہو جائے گا۔ نہ آپ کو تلاش ہے مادیت کی۔ یہاں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ جتنے لوگ یہاں تشریف فرما ہیں جتنی میری مائیں، بیٹیاں ہیں اور بھائی اُن کو تلاش مادیت سے ہٹ کر روحانیت کی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا آپ کے اوپر کرم ہے اس کا مطلب ابھی آپ کے اندر اللہ تعالیٰ کا جنون ہے وہ کروٹیں بدل رہا ہے اور آپ کو بے چین کیے ہوئے ہے کہ آپ حضورؐ کی جھلک دیکھ لیں تو جب آپ کے اندر جذبہ بھی ہے آپ کے اندر اللہ تعالیٰ کی عنائیت اور توفیق بھی ہے تو آپ اس وقت ایک قدم بڑھائیں اور اپنی روح کو تلاش کریں اور اپنی روح کو تلاش کرنے کا جو مؤثر ذریعہ ہے جو ہمارے نبیء برحق خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے نبوت سے پہلے وہ اُن کی غارِ حرا کی سنت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے غارِ حرا تشریف لے جاتے تھے یہ سب جانتے ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں اس وقت تشریف لے جاتے تھے جب نماز فرض نہیں ہوئی تھی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں کیا کر رہے تھے اچھا آپ یہ کہیں گے کہ کوئی جگہ نہیں تھی کیا کرتے خانہ کعبہ میں بت تھے۔ ٹھیک ہے وہاں بت رکھے تھے لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ بھئی بتوں کی پوجا کی جائے خانہ کعبہ کا گوشہ بھی تھا سارے خانہ کعبہ میں تو بت نہیں رکھے ہوئے تھے۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کو چھوڑ کر غارِ حرا مراقبہ کرنے جاتے تھے۔ جسمانی تقاضوں کے ساتھ ساتھ ستو باندھ کے لے جاتے تھے، تھوڑا پانی لے لیا تھوڑا ستو لے لیا تا کہ جب بھوک لگے تو ستو کھا لیں یعنی جسمانی تقاضہ موجود تھا اس کی حفاظت بھی موجود تھی اس کو پورا کرنا بھی موجود تھا اس کے باوجود غارِ حرا مین وہ اللہ تعالیٰ کو تلاش کرنے کے لئے اور اپنی روح کو تلاش کرنے کے لئے تفکر فرمایا کرتے تھے۔ تفکر کا مطلب یہ ہے کہ مراقبہ، مراقبہ کا مطلب یہ ہے کہ مراقبہ میں آپ اپنے ذہن کو دنیاوی معاملات سے، دنیاوی آلائش سے دنیاوی دلچسپیوں سے عارضی طور پر الگ کر لیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیاوی معاملات سے الگ ہو کر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے تھے۔ اب غارِ حرا تو آپ کو نصیب نہیں ہے پاکستان میں اللہ کرے آپ وہاں جائیں۔ کم از کم آپ اپنے گھر کے ایک کونے کو ہی غارِ حرا تصور کر کے مراقبہ تو کریں۔ وہ گھر کا کونا ہی آپ کے لیے غارِ حرا بن جائے گا اس لیے کہ آپ جب روح کی طرف متوجہ ہوں گے تو روح آپ کی طرف متوجہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو بندہ میری طرف ایک قدم بڑھاتا ہے میں اس کی طرف دو قدم بڑھاتا ہوں جو

بندہ میری طرف لپک کے آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ عجیب اللہ کی مخلوق ہے۔ مسلمان عجیب ہیں۔ اللہ آوازیں لگا رہا ہے میرے بندو آ جاؤ میں تمہارے قریب ہوں بندہ آتا ہی نہیں بندہ جو ہے دنیا کی طرف بھاگے چلا جا رہا ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا ابھی ایک مثال دی گئی تھی تقریر میں داتا گنج بخش ہجویریؒ کی اور جہانگیر کے مقبرے کی کہ ایک اللہ کا بندہ ہے وہ آپ کے سامنے ہے اور ایک جہانگیر کا مقبرہ ہے بادشاہ وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ اس بندے نے مادی وجود کو کھو نہیں دیا کھانا نہیں چھوڑا کپڑے نہیں اُتار دیے ایسا نہیں ہوا کہ اس نے گھر کی دیواریں توڑ کے آسمان پر بیٹھ گیا ہو سب کچھ کیا۔ مادی تقاضے کو ساتھ ساتھ پورا کرتے ہوئے اس نے اپنی روح کو بھی تلاش کیا اور جب روح کو تلاش کر لیا تو داتا گنج بخش ہجویریؒ بن گئے۔ اور جب ایک بندے نے روح سے رشتہ توڑ لیا صرف مادیت کو ظاہر کو تلاش کیا تو ظاہر ہی بنا۔

سلسلہ عظیمیہ کا یہ مشن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صلاحیت بھی دی ہے اور توفیق بھی دی ہے صلاحیت اور توفیق کے ساتھ ساتھ روح کو تلاش کریں مراقبہ کریں انشاء اللہ ایک دن ایسا آئے گا کہ آپ کے اوپر غیب کا دروازہ کھل جائے گا روح سامنے آ جائے گی اور جب روح سامنے آ جائے گی تو اللہ سامنے آ جائے گا اور جب اللہ سامنے آ جائے گا تو ساری کائنات سامنے آ جائے گی۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

السلام علیکم!

☆......☆......☆

دوسری بین الاقوامی کانفرنس کے دوران مرشد کریم خطاب فرما رہے ہیں
ساتھ امی حضور اور باجی سعیدہ عظیمی بھی ہیں

دوسری بین الاقوامی کانفرنس خواتین شریک محفل

دوسری بین الاقوامی کانفرنس پر باجی سعیدہ عظیمی خطاب فرما رہی ہیں

دوسری بین الاقوامی کانفرنس میں مرد و حضرات شریک محفل

جامعہ مسجد عظیمیہؒ کے افتتاح سے خطاب

مورخہ ۲ مئی ۱۹۹۳ء کو جامعہ عظیمیہؒ کاہنہ نو لاہور میں جامعہ مسجد عظیمیہؒ کا افتتاح بدست مرشدِ کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے ہوا۔ بوقت افتتاح میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے جامعہ مسجد عظیمیہ کی جگہ اور اس کے نقشے پر مرشدِ کریم کو بریفنگ دی۔

سلسلہ عظیمیہ کے اراکین کی ایک کثیر تعداد اس پروگرام میں شامل تھی۔ مرشدِ کریم نے افتتاح کرنے کے بعد اجتماعی دعا کرائی اور پھر ایک چھوٹا سا بصیرت افروز خطاب فرمایا۔خطاب کے بعد میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے مراقبہ ہال کی ٹیم اور معزز مہمانانِ گرامی اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے آخر میں مہمانوں کی تواضع کا اہتمام کیا گیا تھا۔

مرشدِ کریم الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

اولیاء اللہ کی گفتگو اسرار و رموز اور علم و عرفان سے پُر ہوتی ہے اور ان کی زبان سے نکلا ہوا کوئی لفظ معرفت و حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ ان کے ملفوظات اور واردات روحانیت کے راستے پر چلنے والے سالکین کے لئے مشعلِ راہ ہوتے ہیں۔ اُن کی گفتگو اور ان کے الفاظ پر ذہنی مرکزیت کے ساتھ تفکر کیا جائے تو کائنات کی ایسی مخفی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں جن کا انکشاف اور مشاہدہ انسان کو اس امانت سے روشناس کر دیتا ہے جس کو سماوات، ارض و جبال نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم اس امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم نے یہ امانت اپنے کندھوں پر اٹھالی تو ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔

امانت کا تذکرہ آتا ہے تو انسان کی ایک منفرد حیثیت قائم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ کریم نے بتایا ہے کہ میں کون ہوں اور اس کائنات کی تخلیق میں میری صناعی کس طرح عمل کر رہی ہے اور کائنات کا قیام کن ضابطوں، قاعدوں، فارمولوں اور معین مقداروں پر قائم ہے۔ یہ علم کی وہ طرز ہے جو یقین بن کر مشاہدہ بن جاتی ہے۔ اللہ کریم نے قرآن پاک میں سورۃ بقرہ کی پہلی آیتوں میں فرمایا ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے

جو متقی ہیں اور متقی وہ لوگ ہیں جو غیب کا یقین رکھتے ہیں۔غیب کا یقین رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشاہداتی نظر کے حامل ہوں ان کے اندر وہ نظر کام کرتی ہو جو غیب بین ہے۔ جب تک انسان کے اندر مشاہداتی نظر کام نہیں کرے گی اس کے لئے کائنات تسخیر نہیں ہوگی۔

مسخر ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ زمین ایک قاعدے ضابطے کے تحت رزق فراہم کر رہی ہے۔ ہم زمین پر مکان بناتے ہیں تو زمین مکان بنانے میں حارج نہیں ہوتی۔ زمین اتنی سنگلاخ اور سخت جان نہیں بن جاتی کہ ہم اس کے اوپر چلیں تو گرنے لگیں۔ اتنی نرم نہیں بن جاتی کہ ہم زمین کے اوپر چلیں تو ہمارے پیر دھنس جائیں۔ سورج اور چاند ہماری خدمت گزاری میں مصروف ہیں ایک قاعدے اور ضابطے میں اپنی ڈیوٹی کو انجام دے رہے ہیں جو ان کے اوپر فرض کر دی گئی ہے اور اس عمل سے ہمیں اختیاری یا غیر اختیاری فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ایک تسخیر یہ ہے کہ آپ اپنے اختیار کے تحت زمین سے، سمندر سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے، چاند سے سورج سے کام لے سکیں تسخیر یہ بھی ہے کہ چاند کی چاندنی سے پھلوں میں مٹھاس پیدا ہو۔ اور اعلیٰ تسخیر یہ ہے کہ سیدنا حضور علیہ الصلوۃ والسلام انگلی سے اشارہ کر دیں تو چاند دو ٹکڑے ہو جائے۔ حضرت عمر فاروقؓ دریائے نیل کو پیغام بھیج دیں۔ ''اگر تو اللہ کے حکم سے چل رہا ہے تو سرکشی سے باز آ جا ورنہ عمرؓ کا کوڑا تیرے لئے کافی ہے۔ ایک صاحب نے خود عمرؓ سے شکایت کی یا امیر المؤمنینؓ! میں زمین پر محنت کرتا ہوں دانہ ڈالتا ہوں اور جو کچھ زمین کی ضروریات ہیں انہیں پورا کرتا ہوں لیکن بیج سوکھ جاتا ہے۔ بہت پریشان ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جب میرا اس طرف سے گزر ہو تو بتانا۔ حضرت عمر فاروقؓ جب اس طرف سے گزرے تو ان صاحب نے زمین کی نشاندہی کی۔ حضرت عمرؓ تشریف لے گئے اور زمین پر کوڑا مار کر فرمایا کہ تو اللہ کے بندے کی محنت کو ضائع کرتی ہے جبکہ وہ تیری ساری ضروریات پوری کرتا ہے اور اس کے بعد زمین لہلہاتے کھیت میں تبدیل ہوگئی۔''

زندگی کے دو رخ ہیں جس میں سے ایک رخ بیداری ہے جب انسان بیدار ہوتا ہے تو لوحِ محفوظ سے آنے والی لہروں میں جو مقداروں کی صورت میں ہیں اور لطیف ہونے کی بنا پر نیند لاتی ہیں۔ ان میں ہم اپنے علم کے مطابق بھاری پن اور کثافت شامل کر لیتے ہیں۔ ان میں کثافت ہوتی نہیں ہے۔ ہم ان کے اندر کثافت محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے اس طرح کے محسوسات سے ان

مقداروں میں بوجھل پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بوجھل پن کا نام شعور ہے اس کا مطلب ہے جب احساس کے اندر بوجھل پن پیدا ہو جائے تو ساری کی ساری زندگی بوجھل ہو جاتی ہے پہلی بوجھل زندگی شعور ہے۔ یہی بوجھل زندگی کشش ثقل ہے۔ اور جب کیفیات کے اندر لطافت ہو چونکہ کیفیات سے مراد مقداریں ہیں تو گویا جب مقداروں میں لطافت ہو تو مقداروں (کیفیات) میں کثافت اور بوجھل پن نہیں ہوگا۔ اور جب کثافت اور بوجھل پن کا احساس نہ ہو تو انسان لطیف ہو جاتا ہے ہلکا پھلکا ہوتا ہے اور جہاں شعور کے اندر ہلکا پن لطافت اور آزادی ہو وہ سب کا سب رات کے حواس سے متعلق ہونے کے سبب رات ہوئے اور اس کے برعکس جب شعور میں بوجھل پن اور کثافت چھا جاتی ہے تو سب کا سب دن ہوا۔

یا یوں کہہ لیں کہ مقداروں کے دو رُخ مرتب فرما دیے ہیں۔ ایک رخ لطیف اور دوسرا کثیف۔ کثیف رخ سارا کا سارا دن ہے اور لطیف رُخ سارا کا سارا رات ہے۔ پہلے میں صحت کے مقابلے میں بیماری، آزادی کی بجائے پابندی، سکون کی بجائے پریشانی، وسوسہ، بدحالی، لالچ، حسد اور نفرت ہے۔ اب آواز کو ہی لے لیں۔ آواز کیا ہے؟ مختلف لہروں کا، مقداروں کا کمبی نیشن (Combination) ہے۔ آپ کسی کو آواز دیں آواز میں مٹھاس ہو، حلاوت ہو، محبت ہو تو وہ آواز آپ کو خود بھی اچھی لگے گی اور جس کو آپ نے آواز دی اس کو بھی اچھی لگے گی۔ لیکن اب اگر اسی آواز میں نفرت ہو تو اس بات کا ہمیں علم ہے کہ وہ آواز خود آپ کو بھی بُری لگے گی سننے والوں کو بھی بُری لگے گی۔ یعنی نفرت کا مطلب یہ ہوا کہ آواز میں نفرت کے جذبات نے بوجھل پن اور کثافت پیدا کر دی۔ یعنی آواز نفرت کی مقداروں سے بوجھل اور کثیف ہوگئی اور جب آپ نے محبت اور اخلاص سے بات کی تو اس کا مطلب ہوا۔ آپ نے آواز کی لطافت میں اضافہ کر دیا۔ آواز تو آواز ہے۔ آواز ایک مقدار ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ نے اس میں کتنی کثافت شامل کی یا کتنی لطافت ڈال دی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ لطافت ہی لطافت ہیں اور ان کا کثافت سے کوئی تعلق نہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں صاف کہہ دیا ہے۔ ''جو لوگ غصے سے بچتے ہیں غصے کی کیفیات میں داخل نہیں ہوتے اور اگر اس کیفیت میں داخل ہوتے ہیں تو اس سے فوراً نکل آتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے بات کرتے ہیں لوگوں کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے۔'' آواز کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''آواز تو گدھے کی بھی

ہے۔'' گدھے کی آواز میں ایک خاص قسم کی کراہت محسوس ہوتی ہے دماغ کے اندر خاص قسم کی خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس ساری بات کا مطلب یہ ہوا کہ آواز ہو، کھانا پینا ہو، سوچنا ہو یا احساس کسی بھی درجے میں ہو اس کی حیثیت مقداروں جیسی ہے۔ مقداروں میں پورے کا پورا کائناتی سسٹم، کائنات کے تمام افراد یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ قانون یہ بنا کہ زندگی کا ہر تقاضا معین مقداروں سے مرکب ہے اور یہ مقداریں ہی تقاضے تخلیق کرتی ہیں۔ زندگی کا کوئی تقاضہ بھی ان فارمولوں اور ان مقداروں کے بغیر قائم نہیں ہے۔ اللہ کریم نے چونکہ ہماری اور کائنات کی تخلیق فارمولوں سے کی ہے اس لئے تسخیر کائنات کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں تخلیق کے وہ فارمولے معلوم ہوں جن کے اوپر یہ تخلیق قائم اور متحرک ہے باحواس باشعور ہے۔ اللہ کریم کا قانون جاری و ساری ہے۔ قرآن پاک میں اللہ کریم نے فرمایا کہ یہ کتاب ان لوگوں کے اوپر ہدایت کے دروازے کھولتی ہے جو تفکر کرتے ہیں تحقیق و تلاش کرتے ہیں ریسرچ کرتے ہیں گہرائی میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور جو تلاش کرتا ہے وہ پالیتا ہے اور جو کفران کرتا ہے محروم رہ جاتا ہے۔

تخلیقی فارمولوں کے یہی علوم انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ورثہ ہیں جس سے انہوں نے نوع انسانی کو متعارف کرایا۔ حتیٰ کہ حضورؐ پر یہ علوم مکمل ہو گئے۔ ان علوم سے متعارف ہونے کے لئے صحابہ کرامؓ کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور اہل بیتؓ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو ذہنی شغف تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نشست و برخاست کو جس سے انداز سے دیکھتے تھے اس پر عمل کرتے تھے صحابہ کرامؓ اور اہل بیت دراصل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار و تجلیات کے امین تھے جو انوار قریب رہنے والوں کو منتقل ہوتے تھے۔ ان کو حضورؐ کی ذات سے عشق اتنا زیادہ تھا کہ ان کے ذہن از خود حضورؐ کی طرف لگے رہتے تھے۔ وہ حضورؐ کے اٹھنے بیٹھنے پر، اخلاق پر، ادب کے معیار پر، جھوٹ اور غصہ پر اور معافی وغیرہ پر تفکر کرتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ حضورؐ ناراض نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ بھی ان باتوں پر پورا پورا عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ یہ چیزیں حضورؐ کے اندر نہیں ہیں اس لئے ہمارے اندر بھی نہیں ہونی چاہئیں۔ وہ حضورؐ کی پوری پوری نقالی کرنے کی کوشش کرتے تھے جیسے بچے والدین کی نقل کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا بھی ہوگا اور آج کل یہ مثالیں بھی اکثر دیکھنے میں آتی ہیں جیسے نماز پڑھتے وقت بچے آ کر مصلّے پر بیٹھ جاتے ہیں بچے ایسا

اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اپنے والدین کے معمول ہوتے ہیں اور یہ قانون ہے کہ ''معمول وہی کچھ کرتا ہے جو عامل کرتا ہے۔''

اسی قانون کے تحت صحابہ کرامؓ بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معمول بن کر آپؐ کی نقالی کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ میں سے جس کو جتنی قربت تھی اسی مناسبت سے ان کو حضورؐ کے انور منتقل ہوتے تھے اور اُسی قدر طرزِ فکر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرزِ فکر سے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ کو تصوّف کی مشقوں کی ضرورت نہ پڑی۔ ان کا تزکیۂ نفس صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صرف تکتے رہنے سے ہی ہو جاتا تھا۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''بندہ اگر مرشد کو صرف تکتا ہی رہے تو یہ بھی تصورِ شیخ میں آجاتا ہے کیونکہ اس کا ذہن اپنے مرشد کی طرف لگا رہتا ہے۔''

جس مناسبت سے حضورؐ کی طرز فکر سے دوری ہوئی اسی نسبت سے مرتبۂ احسان کے انوار سے بھی دوری ہوگئی۔ چنانچہ لوگ اُسی قدر تصوف یا روحانیت سے بھی دور ہوتے چلے گئے کیونکہ تصوف یا روحانیت مرتبۂ احسان کے ان انوار کے حصول کا نام ہے جن انوار سے مذہب کی اندرونی کیفیات و واردات کا حصول ہوتا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کے بعد تابعین پھر تبع تابعین کا دور آیا۔ تبع تابعین کے دور کے بعد، مذہب کی اندرونی واردات و کیفیات کے اصل حصول کے لئے خانقاہوں کی ضرورت پڑی۔

پھر بادشاہت آگئی۔ بادشاہت کی، اندرونی واردات و کیفیات رکھنے والوں نے مخالفت کی جس کے نتیجے میں بادشاہت، اندرونی واردات و کیفیات والوں کے خلاف ہوگئی، سلاطین کے زمانے میں بہت زیادہ سازشیں ہوئیں، لڑائیاں لڑی گئیں شہادتِ امام حسینؓ کا واقعہ پیش آیا۔ اہل بیت کو چُن چُن کر مار دیا گیا۔ جب حضرت حسن بصریؒ نے احتجاج کیا تو کہا گیا کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے کیا گیا ہے۔ فقراء کہتے تھے کہ اندرونی واردات و کیفیات کو قائم کرکے مذہب کو روحانیت کے ساتھ جوڑ دیا جائے جبکہ سلاطین نے ان اندرونی واردات و کیفیات کو ختم کیا ان کو ختم کرنے کے لئے لوگ خریدے گئے لیکن جو فقیر ہوگیا وہ بکا نہیں۔ جس کی اندرونی واردات و کیفیات قائم ہوگئیں وہ بکا نہیں۔ فقیر بکتا نہیں ہے اور جب وہ بکتا نہیں ہے تو وہ حق بات کہے گا اور جب حق بات کہے گا تو سلاطین کو تو نقصان ہوگا۔ اس لئے ان کو ختم کرنے کے لئے بہت کچھ کیا گیا، پھر ایک

سازش کے تحت یہ بات داخل کی گئی کہ یہ لوگ دنیا بیزار ہیں جبکہ صرف اُن کی دنیاوی دلچسپیاں کم ہو جاتی ہیں۔ اور کچھ نہیں ہوتا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے سلاسل کا پروگرام شروع کیا۔ روحانیت کے لئے اسباق تجویز کئے گئے۔ یہ جو نسبتِ اویسیہ ہے یہ بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے قائم کی۔ جس کے تحت علوم کو انبیائے کرامؑ، صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ کی ارواح سے روح میں براہِ راست منتقل کیا جاتا ہے۔ روح سے روح کے اندر علوم کی منتقلی اسی نسبت کے تحت ہوتی ہے۔ ایک روح استاد یا مرشد ہوتی ہے اور ایک روح شاگرد یا مرید۔ نام سے کچھ نہیں ہوتا اصل تو مفہوم ہوتا ہے۔ اگر مذاہب کا بغور جائزہ لیا جائے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ عیسائیت اس لئے ختم ہوگی کہ اس کے پیروکاروں نے اس کے اندر سے روحانی واردات و کیفیات کو نکال دیا۔ یہی حال اس وقت مذہب اسلام کا ہوا ہے۔ لوگ نہ تو اس طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے اگر کچھ لوگ متوجہ ہو ہی جاتے ہیں تو انہیں بھی ڈرا دھمکا کر، خوفزدہ کر کے دور کر دیا جاتا ہے۔ سلاطین کے دور میں تو مذہب سے اتنی بیزاری اور دوری پیدا کر دی گئی کہ گانا بجا کر جسے آپ لوگ قوالی کہتے ہیں سے لوگوں کو اس طرف بلایا جانے لگا۔ کتنی بدبختی اور بے حسی ہے یہ۔ عیسائیت ہو یا اسلام، جب لوگوں کے یقین کو توڑ کر، ڈر خوف پیدا کر دیا گیا تو لوگ اللہ سے بیزار ہو گئے اور مذہب سے دور ہو گئے۔ یہ جو بت پرستی ہے اس کی بنیاد بھی ڈر اور خوف ہے۔ جبکہ متقی کا مطلب ہے بالیقین۔

دراصل مذہب ایسا متعین راستہ ہے جس راستے پر چل کر آدمی کو اللہ کی قربت حاصل ہوتی ہے اور جب قربت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور اللہ کے دوستوں کو خوف و غم نہیں ہوتا ہے اور جن کے اندر خوف و غم ہے وہ اللہ کے دوست نہیں۔

اب آپ لوگ غور کریں کہ کیا ہمارے اندر خوف و غم ہے یا نہیں۔

آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کون ہیں۔ کس کیٹیگری میں آتے ہیں۔ البتہ جو لوگ یقین اور مشاہدہ حاصل کر لیتے ہیں وہ اللہ کے دوست ہو جاتے ہیں۔ جب بادشاہوں نے انہیں قتل کرایا تو وہ آرام سے ہو گئے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مرنے کے بعد کی دنیا میں کیا کچھ ہے، کس طرح ہے۔ اس لئے وہ اللہ کے مہمان بن کر آرام سے اس دنیا سے چلے گئے۔

زمانہ میں ہر وقت ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ موجودہ سائنسی دور پچھلے دو سو سالوں سے بہت زیادہ ارتقاء پذیر

ہے۔ بہت زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ وسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ جس مناسبت سے وسائل میں اضافہ ہوا ہے اسی مناسبت سے وسائل کی زیادتی سے انسان کے اندر سے قوت مدافعت کم ہوتی چلی گئی ہے۔

زمانے کی ترقی کے مطابق سلسلہ عظیمیہ کی منظوری حضور پاکؐ سے حاصل کر لی گئی تا کہ انسان مادی وسائل میں گم ہو کر اللہ سے دور نہ ہو جائے اور اسے روک لیا جائے۔ یہی مقصد تمام خانقاہوں کا تھا اسی لئے ہر خانقاہ میں آپ کو مسجد ملے گی جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مذہب اندرونی واردات و کیفیات کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا نام ہے۔ مذہب اللہ کو پہچاننے کا نام ہے۔ جس کی تمام تر صلاحیتیں بھی انسان کے اندر منتقل کر دی گئیں ہیں۔ یہ بات آپ ذہن نشین کر لیں کہ ہمیں صرف روٹی کپڑے، گھر بنانے، بیوی یا شوہر، اولاد پیدا کرنے یا محنت مزدوری کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ ہمارا اصل مقصد اللہ کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنا ہے جو اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ اللہ کو پہچان لیں۔ اور اللہ کی پہچان مذہب اسلام کے ذریعے ہوتی ہے اور مذہب اسلام میں مسجد کو اسی لئے بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ یہ ایک ایسا مرکز ہے ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں سے آپ کو اللہ کی پہچان کے لئے اسباق، وسائل اور قواعد و ضوابط حاصل ہوتے ہیں تزکیۂ نفس کے لئے مسجد ایک اہم حیثیت رکھتی ہے۔

مسجد دراصل ایک مرکزیت، ایک اجتماعی شعور کی نشاندہی کرتی ہے۔ حضورؐ کی زندگی میں مسجد ایک ایسی مرکزی جگہ تھی جو ایوانِ صدر بھی تھی اور جو فوجی ہیڈ کوارٹر کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی، سپریم کورٹ بھی تھی، مذہب کی تبلیغ کے لئے بھی استعمال ہوتی تھی الغرض مسجد ایک اجتماعی شعور ایک اجتماعی طرز ہی نظر آتی ہے۔ جہاں سے ہر چیز کنٹرول کی جاتی تھی۔ اسی اجتماعی شعور کی ترتیب، نشوونما اور اس سے آگاہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے مسجد کو تعمیر کرایا۔ جس میں پانچ وقت نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے۔

دراصل دن میں پانچ وقت باجماعت نماز ایک ایسا اجتماعی پروگرام ہے۔ جس میں محلے کی سطح پر لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ قدم سے قدم ملا کر اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہوتے ہیں اور سربسجود ہوتے ہیں ..... پھر جمعہ کی نماز پوری بستی کی سطح کا اجتماعی پروگرام ہے، جامع مسجد میں بستی کے لوگ ہر ہفتے اکٹھا ہوتے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ عیدین پر شہر کے کھلے میدان میں نماز کا اجتماع شہر کی سطح پر اجتماعیت کا شعور پیدا کرتا ہے۔

اسلام مسلمانوں سے تقاضہ کرتا ہے کہ وہ انفرادی شعور کی سطح سے بلند ہو کر اجتماعی شعور میں داخل ہو جائیں...... اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''اللہ کی رسی کو متحد ہو کر مضبوطی سے پکڑ لو'' اس آیت مبارکہ میں یہی حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی مرکزیت نہ توڑو، منتشر اور فرقے فرقے نہ ہو جاؤ بلکہ اجتماعی شعور کے دائرے میں داخل ہو کر متحد ہو جاؤ......

خدا کی نظر میں روئے زمین کا سب سے زیادہ بہتر حصہ وہ ہے جس پر مسجد تعمیر کی جائے۔ قیامت کے ہیبت ناک دن میں جب کہیں کوئی سایہ نہیں ہوگا خدا اس دن اپنے اس بندے کو اپنے عرش کے سائے میں رکھے گا جس نے کوئی مسجد تعمیر کی ہے مسجد کی حفاظت اور خدمت کیجئے اور اس کو آباد رکھیئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''خدا کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد رکھتے ہیں جو خدا پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔''

فرض نمازیں با جماعت مسجد میں ادا کیجئے کیوں کہ مسجد ایک ایسا مرکز ہے جس کے گرد مومن کی پوری زندگی گھومتی ہے۔ مسجد میں سکون سے بیٹھیے اور دنیا کی باتیں نہ کیجئے۔ مسجد میں اونچی آواز سے بات کرنا، شور مچانا، ہنسی مذاق اڑانا، کاروباری زندگی سے متعلق باتیں کرنا، ایسی باتیں کرنا جن میں دنیاوی آلائشیں شامل ہوں مسجدوں کی بے حرمتی ہے۔ مسجد ایک ایسا مقدس مقام ہے جہاں صرف خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔

جس طرح ہر آدمی کا ہر دوسرے آدمی پر حق ہے اسی طرح مسلمانوں پر مسجدوں کا حق ہے اور وہ حق یہ ہے کہ مسجد کا احترام کیا جائے۔ اور یہ کہ وہاں اپنے اللہ کے سامنے بندہ سربسجود ہو۔ مسجد کا حق یہ ہے کہ آپ اس میں نماز قائم کریں، اللہ کا ذکر کریں تاکہ آپ کو اطمینان قلب نصیب ہو۔ نہایت ادب و احترام اور ترتیل کے ساتھ کلام پاک کی تلاوت کریں۔

خواتین کو چاہیئے کہ وہ اپنے گھروں کی طرح مسجد کی زینت کا بھی خیال رکھیں امکان بھر کوشش کریں کہ مسجد سے ان کا ذہنی تعلق قائم رہے۔ ہوشیار بچوں کو ان کے بڑوں کے ساتھ مسجد میں بھیجیں تاکہ بچوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ایک اللہ کی بندگی اور اطاعت کا شوق پیدا ہو۔

آج یہاں لاہور کے مضافات میں، اس دور دراز جگہ پر آپ لوگوں نے اور خاص کر میاں مشتاق احمد عظیمی

صاحب نے جامعہ مسجد عظیمیہ بنا کر ایک اجتماعی شعور کی ابتداء کر دی ہے۔ میں میاں صاحب کو اور ان کی ٹیم کو اس پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ لوگ یہاں خود بھی آئیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھی لے کر آئیں تا کہ ان کے اندر بھی خدا شناسی کا جذبہ پیدا ہو۔ یہاں تقریبات کریں، شب بیداریاں کریں۔ اجتماعی عبادت کیجئے۔ اللہ نے آپ کو ایک بہترین پلیٹ فارم دے دیا ہے اب یہ آپ پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے اور اس مسجد کو آباد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

السلام علیکم!

سہ ماہی میٹنگ سے خطاب

مورخہ ۸ اپریل ۱۹۹۵ء کو جامعہ عظیمیہ مراقبہ ہال کاہنہ نو، لاہور میں ایک سہ ماہی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں پاکستان کے تقریباً تمام مراقبہ ہالز کے نگران صاحبان نے شرکت فرمائی۔ میٹنگ کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ میٹنگ کے انتظام کی مکمل ذمہ داری مراقبہ ہال لاہور کی ٹیم نے بحسن و خوبی نبھائی۔ میٹنگ کی صدارت مرشدِ کریم حضور خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے فرمائی۔ کوآرڈینیٹر کے فرائض محترم جناب ڈاکٹر وقار یوسف عظیمی صاحب نے انجام دیئے۔

آخر میں سب کی کھانے اور چائے کے ساتھ تواضع کی گئی۔ مغرب کے وقت تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

میٹنگ کے اختتام پر مرشدِ کریم نے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آج یہاں آپ کا اللہ کے نام پر اور اللہ کے عرفان کی تلاش میں آنا، میرے لئے باعثِ افتخار ہے، باعثِ عزت ہے اور اللہ کا شکر ہے۔

عزیزانِ گرامی!

سلسلہ عظیمیہ کی جب بنیاد رکھی گئی تو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ارشاد فرمایا،

''خواجہ صاحب! سلسلہ آپ کو چلانا ہے۔''

اس وقت میرے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ سلسلے کے سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دستارِ فضیلت اور گوشہ نشینی کے آداب سے واقف ہو، اونچی جگہ پر لباس فاخرہ پہن کر بیٹھنے والا بندہ ہو۔ اس کے آگے پیچھے بہت سارے لوگ ہوں۔ جو لوگ سامنے ہوں وہ سرنگوں ہوں اور جو لوگ بیٹھے ہوئے ہوں ان کے اندر اتنی جرأت نہ ہو کہ وہ آنکھ اُٹھا کر مرشد کے چہرے کو دیکھ سکیں۔ مقصد یہ ہے کہ میرے ذہن میں سلسلے کے بڑوں کے لئے ایک ماورائی ہستی کا تصور تھا۔ یہ بات بالکل بھی نہیں تھی کہ مرشد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر بھی کچھ ہوتا ہے اور یہ

بات بھی میرے ذہن میں نہیں تھی کہ زندگی میں کبھی سنا ہی نہیں تھا کہ انسان کی اصل زندگی باطنی زندگی ہے اور ظاہرہ زندگی مفروضہ اور فکشن ہے۔

یہ سب کچھ سوچ کر حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے عرض کیا کہ صاحب! آپ نے ایک ایسی عجیب بات فرمائی ہے کہ جس کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں ابھرتا، اس لئے کہ اگر روحانی استاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اچھا مقرر ہو تو تقریر مجھے نہیں آتی۔ اگر مرشد کے لئے ضروری ہے کہ اسے کچھ لکھنا آتا ہو تو لکھنا مجھے نہیں آتا۔ اگر مرشد کے لئے ضروری ہے کہ اس کی معلومات عام لوگوں کی معلومات سے زیادہ ہوں تو میں نے تو کبھی سکول کے اندر قدم ہی نہیں رکھا۔ مرشد کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے اندر روح کی بالیدگی ہو، اس کو روحانی پرواز حاصل ہو تو میں نے یہ بات کبھی نہیں سُنی۔ میں نے جس ماحول میں نشوونما پائی وہاں روح کا کوئی تصور مجھے نہیں ملا کہ مادی جسم کے علاوہ بھی کوئی اور جسم ہے؟

میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں معروضات پیش کئے تو حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا کہ،

قانون یہ ہے کہ:

''جب اللہ تعالیٰ کسی کو نوازنا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتے کہ آدمی میں کتنی صلاحیت اور سکت ہے؟ اور آدمی کتنا کام کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک مزاج، اپنی ایک عادت ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نوازتے ہیں تو بندے کے اندر از خود تمام صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ اگر گونگا ہے تو بولنے لگتا ہے، بہرہ ہے تو سننے لگتا ہے۔ اس کے اندر قوت پرواز نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے بال و پَر دے دیتا ہے۔ اگر وہ بدصورت ہے تو لوگوں کو وہ خوبصورت نظر آتا ہے۔ اگر اس کا تکلم اچھا نہیں ہے تو اس تکلم میں ایسی شیرینی اور حلاوت اللہ تعالیٰ داخل کر دیتا ہے کہ سننے والے اس کے حکم کا انتظار کرتے ہیں۔ زمین پر بسنے والوں اور آسمانوں میں رہنے والوں کے لئے اس کا لہجہ ایک تاثیر بن جاتا ہے۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے سنتے ہیں۔

اس کے چہرے پر انوار و تجلیات کی ایسی چادر تن جاتی ہے کہ لوگ اسے تکتے رہتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ کیا دیکھ رہے ہیں۔

یہ اللہ کے معاملات ہیں۔ سلسلہ تو اللہ نے چلانا ہے۔ اور جو چیز اللہ نے چلانی ہے اُسے چلانے کے لئے اللہ وسائل دے دیتا ہے۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا۔

آپ کو یہ نہیں سوچنا کہ میں یہ نہیں کر سکتا، میں وہ نہیں کر سکتا۔ آپ کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ کی طرف

سے جو ڈیوٹی لگ گئی ہے راضی برضا ہو کر اللہ کے راستے پر قدم بڑھا دیں۔ اس کے بعد آپ کا کوئی کام نہیں ہے۔

مرشدِ کریم نے توجہ سے، تصرف سے، علم سے، گفتگو سے اور قربت سے میری تربیت فرمائی۔ تربیت کا محور یہ ٹھہرا کہ صدیوں پرانی روایات کو ختم کر کے نئی روایات میں زندگی گزارنی ہے اور وہ روایات یہ ہیں کہ:

''انسان جو بھی کچھ کرے۔ جو بھی کچھ کہے وہ اللہ کے لئے ہو۔ جو عمل بھی کرے اس میں اللہ کی مرضی شامل ہو۔ اپنی ذات کا عمل دخل نہ ہو۔''

صدیوں پرانے اس شعور نے اس بات کو برداشت نہیں کیا۔ صدیوں پرانی روایات نے بغاوت کر دی۔ ایک جنگ شروع ہو گئی۔ ظاہر اور باطن کی اس لڑائی نے بے جان اور نڈھال کر دیا۔ بہت زیادہ تکلیف ہوئی۔ شعور نے بہت زیادہ مزاحمت کی۔ جب مزاحمت حد سے بڑھ گئی تکلیف اتنی زیادہ ہو گئی کہ احساسِ تکلیف ختم ہو گیا تو مرشد نے ایک دن سامنے بیٹھا کر فرمایا کہ:

''زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔
خوش رہنے کے بھی دو طریقے ہیں۔
کچھ بننے کے بھی دو طریقے ہیں۔
کسی سے کچھ حاصل کرنے کے بھی دو طریقے ہیں اور
کسی کو کچھ دینے کے بھی دو طریقے ہیں۔

اور وہ دو طریقے یہ ہیں کہ، انسان کے اندر اتنی صلاحیت ہو کہ وہ دوسروں سے اپنی بات منوا سکے۔ انسان کے اندر اتنی صلاحیت ہو کہ وہ دوسروں کو اپنا ہم ذہن بنا سکے۔ انسان کے اندر یہ صلاحیت ہو کہ وہ صدیوں پرانی منفی روایات کو سینے سے نکال کر زمین میں دفن کر سکے، حقیقی اور مثبت روایات کو جاری و ساری رکھنے کے لئے ساری دنیا کا مقابلہ کر سکے۔ اس طریقے کو دنیا والے (Independent) ہونا کہتے ہیں، خود مختار زندگی کہتے ہیں۔ یعنی جو آپ چاہتے ہیں وہ دوسروں سے منوا لیں۔ جو آپ خود ہیں وہ دوسروں کو بنا دیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی نفی کر دیں یعنی Independent زندگی کو داغ مفارقت دے کر Dependent ہو جائیں۔ دوسروں کے اوپر خود کو چھوڑ دیں۔

یاد رکھیے! آپ کی ساخت اور تخلیق کا قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے وہ فطرت Independent نہیں ہے۔ آپ کی ساخت ہی اس بنیاد پر ہے کہ آپ Dependent ہو کر زندگی

گزار سکتے ہیں۔

لہٰذا ضروری ہے کہ آپ Independent زندگی سے کنارہ کش ہو جائیں اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ آپ کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہے کہ آپ کسی کو اپنا بنالیں آپ کے اندر یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ آپ دوسرے کے بن جائیں۔''

بات بہت گہری تھی۔ جیسے کہ آپ لوگ محسوس کر رہے ہوں گے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا، یہ کیا بات ہوئی کہ اپنے آپ کو کیسے دوسروں کے سپرد کر دیں۔ اپنی ذات اور انا کو کس طرح ختم کر دیا جائے۔ بہرحال میں نے غور وفکر کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے خودمختار زندگی سے نجات عطا فرما دے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اور اس کے بھروسے پر میری سمجھ میں آ گئی کہ:

جب روحانی استاد اور مرشد پکڑا ہے جب یہ بات تسلیم ہے کہ مرشد نے ہی سب کچھ بنانا ہے تو تین سال کے بچے کی طرح خود کو استاد کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ میں نے سوچا کہ مجھے تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ علم کیا ہے؟ یہ بھی پتہ نہیں کہ کہاں سے آیا ہوں؟ یہ بھی نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے؟ اس کا بھی سراغ نہیں ملتا کہ زندگی کیا ہے؟ صحیح اور غلط کیا ہے؟ سانس کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے؟ فکشن ہے کیا؟ ..... مفروضہ کیا ہے؟ .... اور حقیقت کیا ہے؟

بہرحال میں نے یہ بات طے کر لی کہ مجھے اب Independent زندگی نہیں گزارنی۔ جو کچھ کہا جائے گا اس پر عمل کیا ہوگا۔ بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ تعمیل ہوگی۔ شعور اور لاشعور کے درمیان اس پر مزاحمت شروع ہوگئی۔ اس طرزِ فکر کی تبدیلی میں دس سال لگے۔ دس سال شعور اور لاشعور کی محاذ آرائی جاری رہی۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سیّدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصی توجہ اور نسبت سے شعور نے مزاحمت ختم کر دی۔

دس سال کے بعد ذہن کی اُفتاد یہ بنی کہ جو کچھ کہا جاتا تھا بس وہی سب کچھ تھا اور جو کچھ نہیں کہا جاتا تھا وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ذہن کے اندر کوئی خیال ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ذہن ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرح ہوگیا ہے۔ جو بات جتنی کی جاتی بس اتنی سمجھ میں آ جاتی۔ لفظوں کا کوئی مفہوم ذہن میں آتا تھا نہ کوئی معانی سمجھ میں آتے تھے۔ نہ اس کے پیچھے کسی حکمت کی سمجھ آتی تھی۔ انہوں نے کہا درخت۔ جی درخت ہے۔ کونسا درخت ہے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے؟ تربیت کا یہ سلسلہ اس سے تجاوز کر کے ۱۶ سال تک دراز ہوگیا۔ ۱۰ سال اذیّت کے دور میں گزر گئے اور ۶ سال اس اذیّت کو بھولنے میں صرف ہوگئے۔ ۱۶ سال کے عرصے میں ذہن کی رفتار میں تیزی

آئی۔

اُفتادِ طبیعت میں تبدیلی بھی آئی اور تبدیلی یہ آئی کہ کہیں کچھ نہیں ہے۔ جہاں بھی ہے جو بھی ہے، اللہ ہے۔

اللہ ہی ہر شے پر محیط ہے۔ اللہ چاہتا ہے تو بندہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ چاہتا ہے تو بندہ جوان ہو جاتا ہے اور جب اللہ چاہتا ہے بندہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ پیدا ہوا، جوان ہوا، بوڑھا ہوا مر گیا۔ یہی کائنات کی زندگی ہے۔ پیدا ہوا تو کچھ ساتھ نہیں لایا۔ مرا تو کچھ ساتھ نہیں لے گیا۔ محلات بنائے، کارخانے لگائے، دکانیں سجائیں، روزگار کے حصول میں جدوجہد کی۔ دنیا بھی خراب عاقبت بھی خراب۔ اچھا آیا تھا بُرا چلا گیا۔ کومل معصوم بچہ کرخت اور خشک چہرہ بن گیا۔

یہ بات ۱۶ سال میں سمجھ میں آئی۔ آپ سب سمجھدار ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہاں کوئی آدمی نہ کچھ لے کے آتا ہے نہ کچھ لے کے جاتا ہے۔ لیکن اس بات کا یقین آدمی کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ یقین پیدا ہونے کے لئے کہ آدمی یہاں کچھ لے کر نہیں آتا اور کچھ لے کر نہیں جاتا، مقصدِ حیات کو سمجھنے اور اس یقین کو مستحکم ہونے کے لئے ۱۶ سال کی زندگی صرف ہوئی وہ بھی انفرادی زندگی نہیں ہے۔ مرشد کی قُربت کی زندگی ہے۔ شب و روز مرشد کی قُربت نے یقین کا یہ پیٹرن (Pattern) تخلیق کیا کہ انسان نہ پیدا ہونے پر بااختیار ہے اور نہ اسے زندہ رہنے پر قدرت حاصل ہے۔ بااختیار تو تب ہو جب اسے علم ہو کہ مجھے پیدا ہونا ہے۔ اسے اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ مجھے کہاں پیدا ہونا ہے۔ سیّد کے ہاں پیدا ہونا ہے۔ پٹھان کے ہاں پیدا ہونا ہے۔ شیخ کے یہاں پیدا ہونا ہے۔ کسی چمار کے گھر پیدا ہونا ہے۔ جاپان میں پیدا ہونا ہے۔ امریکہ میں پیدا ہونا ہے۔ پاکستان میں پیدا ہونا ہے۔

جب اس بات کا علم ہی نہیں ہے کہ کہاں پیدا ہونا ہے تو بااختیار ہونا کسی طرح زیرِ بحث نہیں آتا۔ آپ پیدا ہوگئے جہاں اللہ نے چاہا۔ چمار کے ہاں چاہا، چمار کے ہاں پیدا ہوگئے۔ بادشاہ کے ہاں چاہا۔ بادشاہ کے ہاں پیدا ہوگئے۔ چپٹی ناک سے پیدا کر دیا۔ آپ چپٹی ناک سے پیدا ہوگئے۔ کھڑی ناک سے پیدا کر دیا۔ آپ کھڑی ناک سے پیدا ہوگئے۔ آپ کو اللہ نے کوتاہ قد کر دیا تو کوتاہ قد ہوگئے۔ دراز قد کر دیا تو دراز قد ہوگئے۔ کالا بنا دیا تو آپ کالے پیدا ہوگئے۔ گورا اللہ نے بنا دیا تو آپ گورے پیدا ہوگئے۔

آپ جتنا بھی غور کریں گے آپ کو یہ جواب ملے گا کہ پیدا ہونے پر کوئی شخص کوئی فرد کسی بھی طرح بااختیار نہیں ہے بے اختیار آدمی پیدا ہوگیا۔ اسے اس بات کا بھی اختیار نہیں ہے کہ پیدا ہونے کے بعد وہ جوان ہو جائے۔ اگر پیدا ہونے کے بعد سال میں دو سال میں اس پر موت وارد ہوگئی تو جوانی نہیں آتی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کیا جوان

ہونے سے پہلے لوگ نہیں مرتے؟ جوان ہونے کے بعد بھی مرجاتے ہیں۔ بڑھاپا آنے سے پہلے مرجاتے ہیں اور بڑھاپا آنے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ اس کا مطلب تو یہی نکلا کہ آپ کو جس طرح پیدا ہونے پر کوئی اختیار نہیں اسی طرح مرنے پر بھی آپ کو کوئی اختیار نہیں یعنی زندہ رہنے پر بھی آپ کو اختیار نہیں ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ انسان عجیب بے وقوف ہے کہ موت سے ڈرتا ہے اور موت ہی انسان کی سب سے بڑی محافظ ہے۔

''ولکم فی الارض مستقر و متاع الیٰ حین'' (سورہ بقرہ ۳۶)

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے اس زمین پر رہنے کے لئے۔''

موت مرنے نہیں دیتی جب تک وقت کا تعین پورا نہیں ہوتا۔ ملک الموت کی جہاں یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ روح قبض کرے۔ ملک الموت کی یہ بھی ڈیوٹی ہے کہ وقت معینہ سے پہلے کسی آدمی کو اس دنیا سے باہر نہ جانے دے۔ انسان کی سب سے بڑی محافظ اس کی موت ہے اور انسان اپنی سب سے بڑی محافظ سے ہی ڈرتا رہتا ہے۔ موت سے آپ ڈریں یا نہ ڈریں اگر عمر باقی ہے تو ملک الموت بھی آپ کی طرح مجبور ہے۔ اور اگر وقت آ گیا ہے تو آپ ایک سیکنڈ بھی دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس حقیقت سے دنیا کا کوئی ایک فرد بھی انکار نہیں کر سکتا۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا ہے کہ زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں Independent زندگی گزارنا اور Dependent زندگی گزارنا۔ جب آپ کو اس بات کا علم ہی نہیں ہے کہ میری عمر کتنی ہے۔ دو سال ہے۔ ۱۰ سال ہے، ۸۰ سال، ۹۰ سال، ۱۰۰ سال تو حساب کتاب کیا لگانا۔ اللہ نے جب بھیج دیا آ گئے۔ بُلا لیا چلے جائیں گے۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

Independent زندگی Dependent زندگی دو ایسے رُخ ہیں کہ اگر آدمی Independent زندگی گزارے گا تو اس کا تعلق اللہ سے قائم نہیں ہوگا۔ اللہ رسیدہ بندے Dependent زندگی گزارتے ہیں۔ اللہ تک رسائی اور عرفان حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی روح سے واقف ہوں۔ ''**من عرفہ نفسہ فقد عرفہ ربہ**'' جس نے اپنی روح کو پہچان لیا اس نے اللہ کو پہچان لیا۔ اللہ کو تو کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ روح کو کسی

نے نہیں دیکھا تو اللہ کو بھی نہیں دیکھا۔ اللہ کی صفات کے مظاہراتی خدوخال میں مرشد کی ذات ہے۔ اگر اللہ تک پہنچنا ہے، اس دنیا کے بعد دوسری دنیاؤں میں داخل ہونا ہے تو اپنے روحانی استاد کی راہنمائی میں راستہ چلیں۔ خود کو مرشد کی ذات سے وابستہ کر دیں۔ مُرشد پہ خود کو نثار کر دیں۔

روحانیت کا اصل اصول یہ ہے کہ مرید مرشد کی ذات میں فنا نہیں ہوگا تو مرشد کی طرز فکر اس کے اندر منتقل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ مرشد کی طرز فکر اگر دودھ کی اور گلاب کی طرح ہے تو اس کے اندر دودھ گلاب کے سمانے کے لئے ظرف چاہیئے، پیالہ چاہیئے۔ مرشد کی ذات ایک مخصوص Pattern ہے۔ مرید کے اندر پہلے سے ہی ایک پیٹرن بنا ہوا ہے۔ اس کے اندر پیالہ پہلے ہی سے بھرا ہوا ہے۔ جس پیالے میں کثافت گندگی کیچڑ بھرا ہوا ہے۔ اس میں آپ گلاب کیسے ڈال سکتے ہیں۔ بغیر منجھے ہوئے پیالے میں آپ دودھ کیسے اُنڈیل سکتے ہیں۔ ضروری ہے کہ پہلے پیالے کو خالی کیا جائے پھر اس پیالے کو مانجھ کر صاف کیا جائے۔ قلعی کیا جائے اور اس کے بعد اس میں دودھ یا گلاب ڈال سکتے ہیں یا شہد ڈال دیں۔ یہ آپ کی مرضی ہے۔ مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا:

روحانیت سیکھنے سکھانے سے نہیں آتی۔ روحانی علوم الف۔ ب۔ ت کی طرح قاعدہ میں نہیں پڑھائے جاتے۔ روحانی علوم سیکھنے کے لئے قلم اور تختی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ روحانی علوم سیکھنے کے لئے کتابی صورت میں ابھی تک کوئی قاعدہ مرتب نہیں ہوا ہے۔ کوئی کتاب نہیں بنی۔ آپ جو کتابیں پڑھتے ہیں اولیاء اللہ کے واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ شاگرد اس وقت تک تعلیم حاصل نہیں کرتا جب تک وہ خود کو روحانی استاد کے سُپرد نہیں کر دیتا۔ کتابیں پڑھنے سے روحانیت نہیں آتی۔

آپ لوگوں نے کبھی اس پہ سوچا ہے کہ روحانیت ہے کیا؟

روحانیت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ آپ کا تعلق اس طرح قائم ہو جائے کہ آپ کی سوچ اپنی نہ رہے۔ آپ کی سوچ اللہ کی سوچ کے تابع ہو جائے۔

"والراسخون فی العلم یقولون امنا بہ کل من عند ربنا" (آل عمران ۷)

جن لوگوں کے اندر الٰہی صفات کی منتقلی کا پیٹرن بن جاتا ہے اور اللہ کی طرز فکر ان کے اندر مستحکم ہو جاتی ہے اور اپنی ذات کی نفی کر دیتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم نے اس کا مشاہدہ کر لیا ہے کہ یہاں رب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ہر چیز اُسی کی طرف سے ہے۔

میں نے اپنے مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی اس بات پر عمل کیا اور Independent خود مختار زندگی

سے نجات حاصل کر کے اپنے مرشد کے اوپر Dependent ہوگیا۔ نتیجہ کے طور پر اللہ کا عرفان حاصل ہوگیا۔

میں نے اس بات پر عمل کیا، آپ کو پتہ ہے، میں نے اس بات پر کیوں عمل کیا.. ؟ اس لئے کیا کہ میں اپنے مرشد کی، حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی ہر بات کو آخری بات سمجھتا تھا، مرشد کریم کے وصال کے بعد میں تنہا رہ گیا۔ تنہائی دور کرنے کے لئے ایک ہی بات تھی کہ تصور میں اتنا غرق ہو جاؤں کہ کوئی دوسری بات یاد ہی نہ رہے، تصور میں بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنی ٹانگ خود دبائے جا رہا ہوں اور ذہن میں یہ ہے کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی ٹانگ دبا رہا ہوں۔ ایسے بے شمار واقعات اس دوران تصور میں مرشد کریم کے اندر غرق ہونے کے پیش آئے۔

پھر میں دربار پر رہنے لگا اور دربار پر بھی تصور میں غرق رہتا۔ ایک بے خودی کی کیفیت ہر وقت طاری رہتی۔ مرشد سے بچھڑنے کا غم دنیا میں سب سے زیادہ غم محسوس کر کے ہمہ وقت مرشد میں گم رہتا۔ تا کہ مرشد سے دوری محسوس نہ ہو۔

میرے دربار پر رہنے اور تصور میں ہمہ وقت گم رہنے سے میری زندگی کے باقی تمام امور انتہائی طور پر ڈسٹرب ہوگئے۔

آخر ایک دن مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا، ''میرے لئے بیوی اور بچوں سے محبت کرو۔'' اور میں نے پھر یہ کیا۔

آہستہ آہستہ زندگی بحال ہوئی۔ کچھ غم کم ہوا اور زندگی کے عوامل پھر روٹین میں پورے ہونے لگے۔

پھر میں سلسلے کو لے کر چل پڑا۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا وسائل بھی بڑھتے رہے۔ پہلی مرتبہ جب مجھے امریکہ بلوایا گیا تو میں عبید اللہ درانیؒ صاحب سے مشورہ کے لئے پشاور گیا، انہوں نے کہا کہ ''سلسلہ کی کامیابی آپ کی پیشانی پر لکھی ہے۔''

پھر ہمیں (KDA) میں جگہ بھی مل گئی۔ جب تقریر کے لئے مجھے بلوایا گیا تو میں نے سوچا کہ میں کیا بولوں، ذہن میں آیا جو اللہ کہے وہ کہہ دو۔ پھر میں نے اپنے خطاب میں اعلان کیا کہ آئندہ چل کے ہم بچوں کے لئے قاعدہ بنائیں گے۔ سکول بنائیں گے کلاسیں بنائیں گے۔ لوگوں کو پڑھائیں گے سکھائیں گے۔

۱۹۸۵ء میں کچھ بھی نہ تھا۔ کتابیں، لٹریچر، بلڈنگ الغرض کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے صرف اپنی نفی کر دی۔ آپ دیکھ لیں..... جس نے قربانی دی وہ میاں مشتاق احمد صاحب ہیں۔ میاں صاحب نقالی ہیں کہ اباجی نے کالم لکھا، میں بھی لکھوں گا، اباجی نے کتابیں لکھیں، میں بھی لکھوں گا۔ میاں صاحب ہمیں وسیلہ مل گئے ہیں۔ اللہ نے وسائل

بنائے ہیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کا فرمان ہے کہ ''آپ کو سامنے کیا گیا ہے۔ وسائل اوپر سے ہم دیں گے۔''

سلسلہ کے بڑوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ان کو گڈا بنا کر کرسی پر بٹھایا گیا ہے وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ اوپر سے چابی بھرتے ہیں اور وہ چلتے پھرتے ہیں۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہم بحیثیت کھلونا منتخب ہوگئے۔ ۱۹۸۵ء میں جو بات بغیر سوچے سمجھے کہی۔ پوری ہوگئی۔ اب انشاء اللہ ہم ایک یونیورسٹی قائم کریں گے۔ اللہ نے ہمیں توفیق دی کہ ہم پہلے تھیوری سے تیاری کریں پھر پریکٹیکل تیار کریں۔ میں تمام نگران مراقبہ ہالز کو دلی طور پر مبارکباد دیتا ہوں۔

تکوینی نظام میں ۱۹ سال کی منصوبہ بندی ہوتی ہے............ اور۔

روحانیت میں ۳۰ سال بیٹا بننے کے لئے ضروری ہیں۔ ایک سال پرائمری، ۵ سال ہائی اسکول، ۱۰ سال کالج اور ۳۰ سال یونیورسٹی کے ہیں۔

۳۰ سالہ منصوبے کا ایک حصہ شب برات ہے ..... اور آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ پھونک ماریں اور کام ہو جائے۔ یہ پھونک کا (Concept) ایک سازش کے تحت روحانیت میں داخل کیا گیا ہے۔ کوئی منصوبہ بھی ہو ذہنی سطح کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ روحانی آدمی کم از کم پانچ سو سال تک منصوبہ بندی کرتا ہے۔ ہر کام کے لئے منصوبہ بندی ضروری ہے اور طویل منصوبہ بندی بہت اچھی ہوتی ہے۔

روحانی علم ایسا علم ہے جو پانچ ہزار سال کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے عام کیا ہے جن پر ہم نے عمارت تعمیر کر دی ہے۔ عمارت کو کھڑا کرنا الگ بات اور اس میں رہنا الگ بات ہے۔ رہنے کے لئے مصالحہ کی تیاری ہو جو پریکٹیکل کے علم سے ہی ممکن ہے۔

یاد رکھیں! جو چیز جتنی تیزی سے نشوونما پاتی ہے اس کی عمر اتنی ہی کم ہوتی ہے۔ پروانے کی عمر ۱۵ منٹ ہے جبکہ یہ بہت جلدی بڑا ہو جاتا ہے لیکن بڑ کا درخت ۵۰ سال میں بڑا ہوتا ہے اور اس کی عمر ہزار سال ہے۔ اس لئے چلتے رہیں، چلتے رہیں رکیئے مت۔ جمود طاری نہ ہونے دینا چاہیئے۔ کیونکہ............

ہمارے مشن میں جمود طاری نہیں ہونا چاہیے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہیں۔ ایک بات خاص طور پر یاد رکھیں کہ جب تک ہمارے سلسلہ میں اور ہماری زندگیوں میں قربت نہ ہوگی روحانی علوم نہیں سیکھ سکتا۔ آدمی چھ ماہ کی تعلیم کچھ وقت مرشد کے قریب بیٹھ کر سیکھ لیتا ہے۔

نگران سلسلہ کا سرمایہ ہیں۔ نگران کو چاہیئے کہ اپنی بھی تربیت کرے اور کم از کم دو بندے ضرور تیار کرے۔

تا کہ نگران کے بعد سلسلے کے سیٹ اپ کو قائم رکھ سکیں۔ آپ کی جتنی روحانی کلاسیں ہوگی ان کلاسز کے حساب سے ضرور امتحانات ہونگے ۔ اس سے یہ پتہ چلے گا کہ کس آدمی میں کتنی قابلیت ہے تا کہ اسے استاد بنایا جا سکے۔

یاد رکھیں! ہم آپ کو آزمائیں گے۔ آپ کو گالیاں نکلوائیں گے۔ آپ کے اوپر کوڑا پھینکوائیں گے تا کہ آپ کے اندر برداشت پیدا ہو سکے۔

جو بندہ مراقبہ ہال میں ہر ہفتہ یا ہر ہفتہ میں ایک یا دو دن نہیں آتا تو گویا اُسے سلسلہ عظیمیہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میری طرزِ فکر سولہ سال مرشد کی قربت میں رہنے سے تبدیل ہوئی۔ آپ لوگ کم از کم ۱۰ سال انتظار کریں۔

۱۰ سال تک پہنچنے کے لئے مصالحہ کی تیاری ہو۔

آپ لوگ.........غور سے سنیں۔

روحانی تعلیم کو ایک دائرے میں لیکر پھیلایا جائے نیز روحانی تعلیم کو اپنی ذات کے لئے اور دوسروں تک پہنچانے کے لئے سیکھیں۔ اس دوران آپ کے اندر ذرّہ برابر غرور وتکبّر اور خودنمائی نہیں آنی چاہیئے کیونکہ یہ زہر قاتل ہے سالک کے لئے۔

عظیمی شخص کو سچا ہونا چاہیئے اُسے چاہیئے کہ وہ منافقت نہ کرے۔ سچائی یہ ہے کہ وہ اسباق پر پابندی سے عمل کرے اور منافقت یہ ہے کہ دن میں گیارہ مرتبہ ہی یَا حَیُّ یَا قَیُّوم نہ پڑھے۔

سلسلہ میں لوگوں کے آنے کے متعلق فرمایا کہ ''سلسلہ عظیمیہ کے پیغام کے مطابق جب آدمی ڈھل جائے گا تو لوگ سلسلہ میں خود بخود آئیں گے۔'' کسی نے سوال کیا کہ ہمیں کتابوں کی سمجھ نہیں آتی اگر آتی ہے تو ذہن میں نہیں رہتا کیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ۔

ایک کتاب لیں اس کی انفرادی طور پر دو یا تین بار مختلف انداز میں گہرائی کے ساتھ تشریح کریں۔ پہلے ایک صفحہ لیں پھر دو اس کے بعد جتنے ہوسکیں۔' پھر فرمایا قرآن پاک پڑھیں اور ترجمہ پر خوب غور وفکر کریں۔ تراجم مختلف ہیں مگر حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے مطابق شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے قرآن مجید کا صحیح ترجمہ کیا ہے۔

جب بھی کسی کو سلسلہ کا پیغام دیں تو اپنی نفی کر کے کہیں .... کہ ہمارے سلسلہ کا پیغام یہ ہے ''ہماری دعوت اللہ کے عرفان کی دعوت ہے اللہ کے عرفان کے لئے قواعد وضوابط اور اغراض ومقاصد وجود میں آئے ہیں ان کو پڑھ کر سمجھ لیں۔ اگر متفق ہیں تو ہم حاضر ہیں اگر نہیں تو تمہارا وہ راستہ ہمارا یہ راستہ۔''

آپ لوگ جب سلسلہ کا کام کرتے ہیں تو تھک جاتے ہیں اور دلچسپی کے بغیر کام کرتے ہیں۔ کیونکہ جب کسی چیز میں شغف ہو اور دلچسپی ہو تو دلچسپی کے مطابق کام کرنے سے آدمی تھکتا نہیں اور جب شوق نہیں ہوگا تو آپ تھک جائیں گے۔ میں نے چوبیس گھنٹوں میں سے اس عمر میں بھی بیس بیس گھنٹے کام کیا ہے۔

ذہین نشین رکھیے! جب بھی آپ سلسلہ کا کوئی کام کریں تو ہمیشہ کام اس نیت سے کریں کہ یہ کام میرے ابا جی کا ہے، مرشدِ کریم کا ہے، میرے سلسلہ کا ہے، حضورؐ کا ہے، اللہ کا ہے، بچے کی حیثیت سے کام کرنے سے آدمی نہیں تھکتا۔ پھر ذوق وشوق اور دلچسپی پیدا ہو جائے گی آپ تھکیں گے بھی نہیں۔ بچہ بن کر کام کریں۔

یاد رکھیں! ہر حال میں اپنا روحانی تشخص برقرار رکھیں۔ اغراض و مقاصد یاد کریں اور قواعد وضوابط بھی یاد کریں۔ اس فریم میں رہ کر زندگی گزاریں تو اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا کی نعمتیں عطا فرمائے گا۔ پہلے خود علم سیکھیں۔ اپنی ذات کو مرشدِ کے انوار سے رنگین کریں مرشدِ کی طرزِ فکر میں ڈھلئے۔ اپنی ذات کی مرکزیت اپنے مرشدِ کو بنا دیجئے۔ انشاء اللہ آپ کے تمام مسائل بھی حل ہوں گے اور سلسلہ بھی ترقی کرے گا۔ یاد رکھیے! اللہ اپنی قربت سے نوازتا ہے۔ مگر اللہ سے درخواست کرنا ہمارے ذمے ہے۔

دعا کریں! اللہ تعالیٰ میری ان معروضات کو آپ کے دلوں کا نور بنا دے تاکہ جہاں آپ جائیں میری روشنی پھیلا دیں اور جو مشن پھیلانے کا ذمہ اللہ کی طرف سے میرے اوپر عائد ہوا تھا وہ بحسن وخوبی پورا ہو جائے۔ (آمین) یاد رکھیں! بندہ کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہے۔

السلام علیکم!

☆……☆……☆

ہے تو ہم اپنے ہم جنسوں کو تکلیف پہنچا کر یہ نو

نگران مراقبہ ہالز کی میٹنگ (مراقبہ ہال) جامعہ عظیمیہ لاہور سے مرشد کریم کا خطاب

کلاس قلندر شعور سے عظیمی صاحب کے تین اہم لیکچرز

جون ۱۹۹۵ء کو مرشدِ کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے حکم سے مراقبہ ہال جامعہ عظیمیہ کاہنہ نو لاہور میں قلندر شعور کے عنوان سے ایک کلاس کا آغاز کیا گیا۔ اس کلاس سے مرشدِ کریم نے درج ذیل تین بنیادی موضوعات پر انتہائی اہم لیکچرز دیے اور آخر میں سوال و جواب کے ذریعے ان موضوعات کو مزید ذہن نشین کرایا گیا۔

☆ اس میں پہلا لیکچر بعنوان ''قلندر شعور'' ۳۰ جون ۱۹۹۵ء کو دیا گیا۔

☆ دوسرا لیکچر ''شعور اور لاشعور'' کے عنوان پر ۱۴ جولائی ۱۹۹۵ء کو دیا گیا۔

☆ تیسرا اور آخری لیکچر ''کن فیکون'' کے موضوع پر ۲۱ جولائی ۱۹۹۵ء کو دیا گیا۔

مندرجہ بالا لیکچرز کے بعد مرشدِ کریم کی ناسازیٔ طبع کی بنا پر کلاس جاری نہ رہ سکی مگر یہ لیکچرز بھی عوام کی تشنگی مٹانے کے لئے کافی ہیں۔

اس کلاس کا انتظام و انصرام میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب کے زیرِ نگرانی انتظامیہ مراقبہ ہال لاہور نے کیا۔ اس کلاس میں پاکستان کے اہم شہروں کے مراقبہ ہالز کے نگران صاحبان نے خصوصی طور پر شرکت کی تھی۔ اس کلاس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

پہلا لیکچر:

قلندر شعور

اِس کتاب کا نام ''قلندر شعور'' ہے۔ قلندر شعور نام یہ ظاہر کرتا ہے کہ جس طرح ہر آدمی کے اندر شعور کام کرتا ہے اور اس شعور کی بنیاد پر ہر انسان کی طرزِ فکر مختلف ہوتی ہے اُسی صورت سے ایک شعور ایسا بھی ہے کہ جس کا نام ہم نے قلندر شعور رکھا ہے۔

شعور سے مُراد یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی ایجنسی موجود ہے جو ایجنسی آنے والے خیالات کو اپنے مطلوبہ معنے پہناتی ہے۔ شعور سے ہمیشہ مراد یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسی ایجنسی جو نیوٹرل نہیں ہوتی۔ شعور سے مراد موجودہ علم کی روشنی میں آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ طبیعات، طبیعات کے دائرے میں جو شعور ہے۔

طبیعات اور نفسیات کے بارے میں ماشاء اللہ آپ سب لوگ پڑھے لکھے ہیں جانتے ہیں کہ طبیعات اور نفسیات دو دائرے ایسے ہیں کہ جن کے بغیر نہ کوئی انسان زندگی گزار سکتا ہے اور نہ کوئی حیوان زندگی گزار سکتا ہے۔ جہاں تک طبیعات کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی ذی روح مخلوق ایک مخصوص دائرہ عمل میں رہ کر زندگی گزارتی ہے اس مخصوص دائرہ عمل میں اُس مخلوق کو یا اس فرد کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مجھے کیا کھانا ہے؟ کیا پینا ہے،؟ کس طرح رہنا ہے؟ جسمانی مشین کو جب وہ تھک جائے یا گرم ہو جائے کس طرح آرام دینا ہے؟ طبیعات کے دائرے میں یہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ اب طبیعات کے دائرے میں وہ مخلوق جو زمین پر زیر بحث ہے ایک کا نام ہم رکھتے ہیں انسان، دوسری کا نام ہم رکھتے ہیں حیوان۔

انسان بذاتِ خود اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ انسان جو ہے حیوانِ ناطق ہے۔ یعنی بولنے بولا حیوان، لیکن جب غور و فکر کیا جاتا ہے تو یہ انسان کا دعویٰ بے بنیاد اور مفروضہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اس لئے کہ جتنے بھی یہاں حیوانات ہیں وہ سب بولتے بھی ہیں۔ وہ آپس میں اپنی بولیاں سمجھتے بھی ہیں اور خطرے کے وقت وہ اور قسم کی بولی بولتے ہیں خوشی کے وقت اور قسم کی بولی بولتے ہیں۔

مثلاً اگر جنگل میں کوئی شیر آ جائے تو بندر درختوں پہ چڑھ کر اپنا پیٹ بھی پیٹتے ہیں، آوازیں بھی نکالتے ہیں،

بہت شور کرتے ہیں۔ اُس سے یہ ہوتا ہے کہ جنگل کے جتنے بھی جانور ہیں وہ باخبر ہو جاتے ہیں کہ اب ہمیں خطرہ ہے اور اس خطرے سے ہمیں بچنا چاہیئے۔ اِسی صورت سے جتنے بھی جانور آپ دیکھتے ہیں مثلاً گائے، بھینس، بکری، بھیڑ، شیر، کتا، بلی جتنے بھی چوپائے ہیں اُن کی آوازیں الگ الگ ہیں پھر وہ اپنی آوازوں کو سمجھتے بھی ہیں۔ مرغی ایک مخصوص آواز اُس وقت نکالتی ہے جب اُس کے بچوں کو یا چوزوں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ اس کی آواز سن کر چھوٹے چھوٹے چوزے دوڑتے ہیں اور مرغی اپنے پر کھول کر اپنے تمام بچوں کو ان میں اس طرح سمیٹ کر بیٹھ جاتی ہے کہ چیل مرغی کے بچوں کو نہیں اُٹھا سکتی۔ ثابت ہوا کہ مرغی کی آواز مرغی کے بچے نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ اُس آواز کو سن کر اُس پر عمل درآمد بھی کرتے ہیں۔ اب یہ کہنا کہ انسان حیوانِ ناطق ہے باقی دوسرے حیوانات گونگے بہرے ہیں یا سمجھ اور عقل سے بالکل بے خبر ہیں۔ یہ انسان کا محض ایک دعویٰ ہے جس کو ہم خودفریبی کے علاوہ کوئی نام نہیں دے سکتے۔

دوسرا مسئلہ شعوری اعتبار سے یہ آتا ہے کہ انسان کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دوسرے حیوانات کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار ہے، زیادہ باصلاحیت، زیادہ عقل کو استعمال کرتا ہے۔ یہ دعویٰ بھی اگر غور وفکر کیا جائے تو بے بنیاد اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب ہم حقیر ترین چھوٹا سا پرندہ مکھی پر غور وفکر کرتے ہیں تو مکھی کی نفسیات کا جب مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً شہد کی مکھی کا تو وہاں بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان عقلی اعتبار سے کسی بھی طرح شہد کی مکھی سے زیادہ عقل نہیں رکھتا۔ پھر جس طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کے لئے فرماتے ہیں کہ وحی نازل ہوتی ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کے لئے بھی فرمایا ہے کہ شہد کی مکھی پر وحی نازل ہوتی ہے۔

ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ عقل وشعور کے جو دائرے ہیں، طبیعات کے شعبوں میں رہتے ہوئے، انسانی نفسیات کے جو تقاضے ہیں وہ مختلف تو ہو سکتے ہیں لیکن کوئی انسان محض عقل کی بنیاد پر، محض شعور کی بنیاد پر حیوانات سے ممتاز ہونے کا دعویٰ کسی بھی صورت میں نہیں کر سکتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اب تک جو بھی علوم یہاں رائج ہیں یا آدم وحواؑ سے لے کر اس وقت تک انسانی ارتقاء جس انداز میں بھی ہوا وہ ارتقاء کتنا ہی اہمیت رکھتا ہو لیکن لاکھوں کروڑوں سال کے ارتقاء کی بنیاد پر کوئی انسان حیوانات سے ممتاز ہونے کی سند پیش نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر انسان کے اندر عقل ہے کہ وہ جہاز بنا لیتا ہے تو کبوتر کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ اُسے جہاز کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود جہاں چاہے اُڑ کر جا سکتا ہے۔

انسان کا شعور محدود ہے۔ وسائل کا پابند ہے۔ کوئی ترقی آج تک ایسی نہیں ہوئی، کوئی ایجاد ایسی نہیں ہے کہ

جو ایجاد شعوری حدود میں بند نہ ہو۔ کوئی ایجاد ایسی نہیں ہے کہ جو وسائل کی پابند و محتاج نہ ہو۔ جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جانوروں میں انسانوں کی طرح وسائل کی پابندی نہیں ہے اور وہ ہم سے بہت اچھی زندگی گزارتے ہیں۔

تعمیر میں انسان نے بڑی ترقی کی لیکن تعمیری نقطۂ نظر سے جب ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ضرورت کے لحاظ سے پرندے بھی ایسے ایسے عجیب گھونسلے بناتے ہیں کہ موجودہ سائنس کی پوری ترقی بھی اگر مصروف ہو جائے تو وہ ایسے گھر نہیں بنا سکتی۔

مثلاً بیا کا گھونسلہ ہے۔ بلبل کا گھونسلہ ہے۔ چیونٹیوں کا ایک نظام ہے۔ زمین کے اندر چوہوں کا ایک بڑا اپنا پورا نظام ہے۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں کہ جہاں انسان کی عقل ختم ہو جاتی ہے اور انسانی عقل حیوانی عقل کے تابع ہو کر کام کرتی ہے اور کوئی چیز بنا لیتی ہے۔ مثلاً یورپ میں انڈر گراؤنڈ ریل کا سلسلہ ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ انڈر گراؤنڈ ریل کا سلسلہ زمین کے اندر چوہوں کی کالونیوں کو دیکھ کر نقشہ کھینچا گیا ہے۔ چوہے زمین پر کس طرح رہتے ہیں؟ وہ باقاعدہ زمین کی تہہ میں سیڑھیاں بناتے ہیں اِن سیڑھیوں کے اندر سُرنگیں بناتے ہیں اور اس میں وہ بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ سردی گرمی سے حفاظت بھی کرتے ہیں۔ چیونٹیوں کے بارے میں قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ قرآن کی ایک پوری سورۃ کا نام ہی ''سورۃ نمل'' ہے۔ یعنی سورۃ چیونٹی ہے۔

تو اب یہ طبیعاتی نقطۂ نظر سے اگر ہم یہ کہیں کہ انسان بہت عقلمند ہے، بہت باشعور ہے اور دنیا میں موجود جتنی مخلوقات ہیں وہ اُن سے زیادہ باصلاحیت ہے تو یہ بات خود کو آئینے میں دیکھنے کے مصداق ہے۔ اس کی کوئی سند ہمارے پاس نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس شعور سے ہم واقف ہیں وہ شعور ہمیں ایک طرف محدود رکھتا ہے اور دوسری طرف ہم اِس محدودیت کو آزادی کا نام دے کر خود کو دھوکے اور فریب میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن جب اُس کی زندگی پر غور کیا جائے تو وہ جتنا خود کو چار دیواری میں بند کر کے اور اندر سے کنڈی لگا کر محفوظ سمجھتا ہے اتنا وہ کھلے آسمان کے نیچے خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔

ایک طرف وہ آزاد ہونا چاہتا ہے اور دوسری طرف خود کو قید و بند کی زندگی میں داخل کر کے آزاد کہتا ہے۔ یہ آپ کا شعور، جتنا بھی شعور اس وقت زمین کے اوپر کام کر رہا ہے اِس کے پیچھے محدودیت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔

سائنس اور سائنسدانوں نے بڑی ترقی کی۔ ہر شعبے میں ترقی کی اور وہ نظر بھی آتی ہے۔ ان تمام ترقیوں کو

جب وہ انسانی دماغ سے شمار کرتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ابھی تک انسان پانچ فیصد دماغ سے زیادہ واقف نہیں ہوا۔ یعنی ابھی تک انسانی شعور جو ہے کروڑوں سال کی ایجادات سے کروڑوں سال کے ارتقاء سے انسان کے اندر پانچ فیصد شعور پیدا ہوا ہے۔ کون جانے اور کتنے اربوں کھربوں سال کے بعد مزید پانچ فیصد شعور بیدار ہوگا تو انسان کا یہ سمجھنا کہ وہ اس لئے اشرف المخلوقات ہے کہ اُس کے اندر عقل ہے یہ بالکل لغو، غلط، بے معنی اور فضول بات ہے۔ انسان کا شرف کسی بھی صورت سے شعوری ارتقاء سے ثابت نہیں ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق انسان دوسری مخلوقات میں ممتاز ہے اور اُسے دوسری مخلوقات پر شرف حاصل ہے۔

اس لئے ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ انسان دوسری مخلوقات سے اشرف المخلوقات نہیں ہے۔ وہ شرف عقل کی بنیاد پر اس لئے نہیں ہے کہ اگر انسان کے اندر سونگھنے کی صلاحیت سو گز تک ہے تو دوسرے جانوروں کے اندر سونگھنے کی صلاحیت ہزار گز سے بھی زیادہ ہے۔ اب دیکھئے کہ انسان کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ انسان جرم کرتا ہے اور اپنے مجرم کو پکڑ نہیں سکتا۔ اتنا کوتاہ طاقت ہے کہ انسان اپنے مجرم کو پکڑنے کے لئے کتوں کا محتاج ہے۔ جو مخلوق اپنے جرائم کو ڈھونڈنے کے لئے کھوج لگانے کے لئے کتوں کی محتاج ہو، اس کو کسی بھی طرح اشرف المخلوقات نہیں کہا جا سکتا۔

یہ شعور جس سے ہم واقف ہیں ہمیں ہر ہر قدم پر پابند رکھتا ہے۔ ہمارے اندر کوئی حس ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ ہم پانچ حسّوں میں سے کسی ایک بھی حِس میں آزاد ہیں مثلاً سونگھنے کے حس، اس کی بھی ایک معین مقدار ہے۔ چھونے کی حِس، دیکھنے کی حِس، بولنے کی حس، ہر حس جو ہے شعوری طور پر پابند ہے یا اس کا ایک تعین ہے۔ اسی طرح دوسری مخلوقات بھی، سنتی بھی ہیں، بولتی بھی ہیں، محسوس بھی کرتی ہیں۔ مستقبل کے بارے میں اُن پر انکشاف بھی ہوتا ہے جو انسان کے اوپر نہیں ہوتا ہے۔ بلیوں کے اوپر کتوں کے اوپر، پرندوں کے اوپر پہلے سے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اب کوئی مصیبت ظاہر ہونے والی ہے، کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ جبکہ انسان کو اُس وقت پتا چلتا ہے جب وہ ڈوب جاتا ہے۔

شرف کو تلاش کرنے کے لئے ہمیں اُس شعور سے گزرنا ہوگا جو طبیعات کے دائرے میں رہتے ہوئے انسانوں اور جانوروں میں مشترک ہے۔ جانوروں کی طبیعات پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ جبلّت کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ مثلاً بکری کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ گوشت نہیں کھاتی۔ اس کی جبلّت میں بھوک رفع کرنے کا جو تقاضا ہے وہ پتّے کھانے سے پورا ہوتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ شیر کی جبلّت کھانے پینے کے

سلسلے میں گوشت کھاتی ہے گوشت کھانا شیر کی جبلّت ہے اس جبلّت کے تقاضے کے تحت گوشت کو شیر کھاتا ہے۔ شیر پتے نہیں کھاتا۔ انسان کی جبلّت یہ ہے کہ وہ سب کچھ کھا جاتا ہے۔ گوشت بھی کھاتا ہے، لکڑی بھی کھاتا ہے، مٹی بھی کھاتا ہے، پتھر بھی کھاتا ہے، پتے بھی کھاتا ہے۔ وہ ہر چیز کھا جاتا ہے۔ یہ اُس کی ایک جبلّت ہے کہ کھانے پینے کے معاملے میں ہم انسان کو پابند نہیں کر سکتے شیر اور بکری کی طرح۔

اس بات کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ جبلّت میں انسان یا آدم دوسرے جانوروں سے کچھ تھوڑا سا آگے ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ انسان کی جبلّت اور حیوانات کی جبلّت میں کوئی نمایاں فرق نظر آتا ہو۔ نسل کشی کا جب مسئلہ سامنے آتا ہے تو انسان کی بھی نسل بڑھتی ہے، جانوروں کی نسل بھی بڑھتی ہے۔ انسان بھی اپنے بچوں سے محبت کرتا ہے اور دوسرے تمام جانور بھی اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں۔ انسان کی جبلّت کا تقاضا ہے کہ اُس کی نسل زیادہ سے زیادہ زمین پر پھیل جائے۔ اسی صورت سے مرغی کا بھی یہ تقاضا ہے کہ اُس کی نسل زیادہ سے زیادہ زمین پر پھیل جائے۔

عرض یہ کرنا ہے کہ جبلّت میں انسان اور حیوانات میں فرق تو آپ بیان کر سکتے ہیں لیکن جبلّت کے اعتبار سے کوئی انسان کسی حیوان سے الگ نہیں ہو سکتا نہ وہ ممتاز ہو سکتا ہے۔ انسان کو چونکہ شرف عطا کیا گیا ہے اس لئے یہ ضروری ہوا کہ انسان حیوانات کی صف سے نکل کر اُس مقام پر پہنچے جس مقام پر پہنچ کر وہ حیوانات سے ممتاز ہے۔ اگر انسان اُن مقامات کو طے نہیں کرتا کہ جن مقامات کے طے کرنے سے وہ حیوانات سے ممتاز ہو جاتا ہے تو انسان کی آدم کی اور حیوانات کی پوزیشن بالکل ایک ہے۔ اب یہ کوئی بات نہ ہوئی کہ انسان گوشت پکا کے کھاتا ہے اور وہ اشرف المخلوقات ہے شیر کچا گوشت کھاتا ہے وہ اشرف نہیں ہوا، یہ ایک ارتقائی صورت ہے۔ پہلے جب انسان گوشت کھاتا تھا تو کچا ہی گوشت کھاتا تھا۔ انسان گوشت پکا کر کھانے کے باوجود پیٹ کے امراض میں مبتلا ہوتا ہے۔ گوشت خور جانور کچا گوشت کھانے کے باوجود پیٹ کے امراض میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اگر انسان کا اور دوسرے حیوانات کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو انصاف یہ بتاتا ہے کہ انسان بہرحال حیوانات سے پیچھے ہے، حیوانات سے کمتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”انسان جو ہے وہ ایسے خسارے میں پڑا ہوا ہے کہ وہ شعور کا خسارہ بھی حاصل کر رہا ہے اور آخرت کا خسارہ بھی حاصل کر رہا ہے، ڈھونڈ رہا ہے اور تلاش کر رہا ہے۔“

جبلّت کے تقاضے میں حیوان اور انسان دونوں برابر برابر سفر کر رہے ہیں۔ انسان کی جب عقل کی طرف آتے ہیں تو اس عقل کی کارفرمائی بھی پوری زمین کے اوپر فساد کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ جب بھی انسان نے عقل

استعمال کی جب بھی نوعِ انسانی میں جینئس لوگ زیادہ ہو گئے انہوں نے سوائے فساد برپا کرنے کے کچھ نہیں کیا۔ جبکہ حیوانات کی زندگی میں ہمیں زمین کے اوپر فساد برپا کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے بھی انسان حیوانات سے کم تر ثابت ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ انسان نے سائنسی ترقی کی، انسان نے نئی نئی مشینیں ایجاد کر لیں، انسان نے رفتار کو زیادہ سے زیادہ...... زیادہ سے زیادہ پکڑ کر وقت کو کم کر دیا یہ ترقی، اس طرح ترقی اس لئے نہیں ہے کہ اس ترقی کے جو ثمرات ہیں اس ترقی کے جو نتائج ہیں وہ انسانی شعور کے لئے ہلاکت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ اب ترقی کی بنیاد یہ ہے کہ ایک سُپر پاور کوئی ہتھیار بناتی ہے اور وہ کہتی ہے کہ ایک منٹ میں تین لاکھ آدمی مر جائیں گے اور اس کا نام ترقی رکھا جاتا ہے، عقل کی کارفرمائی سمجھا جاتا ہے۔ دوسرا آدمی کہتا ہے کہ ایک منٹ میں پانچ لاکھ آدمی مر جائیں گے۔ وہ اور زیادہ ترقی یافتہ کہلاتا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ ہوا میں بم کو ماردیں گے آکسیجن ختم ہو جائے گی اور دنیا، انسان، حیوان، پرندے، چرندے سب مر جائیں گے، ختم ہو جائیں گے زمین کے اوپر سے۔ انہوں کہا بہت بڑی ترقی ہے۔ شعوری نقطۂ نظر سے جتنی بھی ترقی اب ہے، آئندہ ہوگی یا ہو چکی ہے اس سب کے پیچھے سوائے تخریب کے، سوائے پریشانی کے، سوائے مالی منفعت کے، سوائے مادی اضافے کے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اگر ہم موجودہ شعور کے مطابق انسان کو افضل قرار دیں تو انسان حیوانات سے افضل تو نہیں ہے لیکن حیوانات سے ابتر درجے میں ضرور ہم اس کو شمار کر سکتے ہیں۔

موجودہ دور شعور کا دور کہلاتا ہے۔ موجودہ دور ترقی کا دور کہلاتا ہے۔ موجودہ دور میں محیّر العقول ایجادات سامنے آئی ہیں لیکن جب اجتماعی طور پر اُن ترقیوں کے ثمرات کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہر شخص یہ بات جانتا ہے اس ترقی کے پیچھے ہمیں جو تحائف ملے ہیں وہ بیماریاں ہیں، ایسی ایسی بیماریاں جن کا پہلے کبھی کوئی وجود نہیں تھا۔ ہمیں بے سکونی ملی ہے، فرسٹریشن ملا ہے، ٹینشن ملی ہے، بلڈ پریشر کا کبھی سُنا ہی نہیں تھا، اب یہاں ہر آدمی بلڈ پریشر سے اس طرح واقف ہے کہ وہ اپنی ذات سے بھی واقف نہیں۔ بیماریاں نئی نئی بن رہی ہیں مثلاً کینسر کی بیماری ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ کینسر کا علاج ہی نہیں ہے لیکن اگر غور کیا جائے کہ کینسر کے علاج سے مہنگا کوئی علاج نہیں ہے۔ یعنی عقل و شعور کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اگر کوئی آدمی نیوٹرل ہو کے سوچے تو یہ تصدیق ہوتی ہے...... پتا نہیں چلتا، اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ایک مخصوص گروہ ہے جنہوں نے اپنے چالاک ذہنوں سے پوری آبادی کو اپنے زیردست کر کے اِن کو محتاج اور مجبور کر دیا ہے۔ عوام مجبور ہے۔ چند لوگوں نے اپنی ذہنی عیاریوں سے، چالاکیوں سے اور عقل سے ترقی کا نام اُس شے کو دے دیا ہے کہ جس شئے میں سوائے بے سکونی اور پریشانی کے کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ ہماری اُس شعور کی تعریف ہے جو زمین پر ٹائم اینڈ اسپیس میں بند ہے اور ہم اِس میں زندگی گزارتے ہیں۔ اِس شعور سے، اس پابندی ہے، اس غمناک اور ہیبت ناک ترقی سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے ترقیوں کا جائزہ لیں اور اُن ترقیوں کے جو ثمرات ہیں اُن کے بارے میں غور وفکر کریں۔ غور وفکر کرنے کے بعد بظاہر تو یہ ترقی بہت بڑی ترقی نظر آتی ہے لیکن اس کے پیچھے جو نوعِ انسانی کی ہلاکت اور بربادی ہے اُس کا کوئی شمار وکتاب نہیں ہے۔ انسان نہ صرف اپنے عزیز واقارب ت، اپنے خاندان سے، اپنی قوم سے، اپنے ملک سے دُور ہوگیا ہے بلکہ اب وہ اپنی ذات سے بھی نفرت کرنے لگا ہے۔ یہ ہماری اُس ترقی کا ثمرہ ہے جو ہم نے شعوری طور پر حاصل کی ہے۔ میرا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ترقی نہ کی جائے، یہ بھی نہیں ہے کہ یہ جو انسان کا شعوری ارتقاء ہوا ہے یہ غلط ہوا ہے۔ منشاء یہ ہے کہ اس شعوری ارتقاء کے پیچھے شعور بھی ایک دائرہ بن گیا ہے اور شعور ایسے دائرے کا نام ہے جس کو ہم محدودیت کے علاوہ دوسرا کوئی نام نہیں دے سکتے۔ قلندر شعور کتاب جو آپ پڑھیں گے اس میں شعور کے ساتھ قلندر لگایا ہوا ہے۔

☆ قلندر سے مُراد ایسی طرزِ فکر جو آزاد طرزِ فکر ہے۔
☆ قلندر سے مراد غیر جانبدار زاویہ نظر۔
☆ قلندر سے مراد محدودیت میں رہتے ہوئے لامحدودیت میں داخل ہونے کی صلاحیت۔
☆ قلندر سے مراد وہ ایجنسی جو ایجنسی ہمارے محدود شعور کو متحرک کئے ہوئے ہے۔

محدود شعور کو متحرک کرنے کا جو طریقہ ہے وہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے مثلاً اگر کسی آدمی سے کہا جائے کہ بھئی! تم زندہ کیوں ہو؟ تو وہ اِس کا جواب نہیں دے سکتا میں زندہ کیوں ہوں۔ بھئی! میں زندہ ہوں! بھئی کس طرح زندہ ہو؟ وہ جی سانس آرہا ہے تم بھی لو۔ بھئی! سانس کیا چیز ہے؟ وہ نہیں بتا سکتا ہے۔ بھئی سانس ایک ہوا ہے، آکسیجن ہے جو اندر آجاتی ہے اور کبھی باہر چلی جاتی ہے۔ بھئی! تم جو زندہ ہو اُس کی وجہ؟ اُس کی وجہ آکسیجن ہے جی آکسیجن ہمارے اندر فضا میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ فضا سے آکسیجن ہمارے اندر جارہی ہے اس لئے ہم زندہ ہیں۔

لیکن جب آپ اُس سے یہ سوال کریں گے کہ جب آدمی مرجاتا ہے ایک آدمی مرگیا دس ہزار آدمی اُسی فضا میں موجود ہیں اُس فضا میں آکسیجن بھی موجود ہے، اُس فضا میں ہوا بھی موجود ہے، اُس فضا میں گیسز (Gasses) بھی موجود ہیں تو وہ ایک آدمی کیسے مرگیا؟

تو اِس کا جواب کوئی بڑے سے بڑا سائنسدان بھی نہیں دے سکتا۔ اور یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں

نے یورپ میں بڑے بڑے انگریزوں کے اجتماع میں یہ سوال کیا اور انہوں نے یہ کہا کہ اس پر ابھی ریسرچ (Research) نہیں ہوئی۔ ایک بڑا اُن کے پاس ہتھیار ہے جو ترقی یافتہ قوم ہے کہ اگر وہ کسی چیز کا جواب نہیں دے پاتے تو وہ کہتے ہیں کہ ابھی اس پر ریسرچ (Research) نہیں ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آکسیجن کی بنیاد پر آدمی زندہ ہے تو جب وہ مرجاتا ہے تو فضا میں کیا آکسیجن ختم ہو جاتی ہے؟ آپ کا جواب ہوگا کہ ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی آکسیجن کی بنیاد پر زندہ نہیں ہے۔

اگر آدمی پانی کے اوپر زندہ ہے جس وقت آدمی مرجاتا ہے، ایسا نہیں ہوتا زمین پر سے پانی ختم ہو جائے۔ پانی موجود رہتا ہے۔ اگر انسان گیسز (Gasses) کے اوپر زندہ ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ جب آدمی مرجائے تو فضا میں سے ساری گیسیں بھی ختم ہو جائیں، سارے رنگ ختم ہو جائیں۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ انسان لہروں کے اوپر زندہ ہے، اگر انسان لہروں کے اوپر زندہ ہے تو جب آدمی مرجاتا ہے تو سورج کی بھی شعاعیں لہروں کی شکل میں موجود ہیں۔ چاند کی کرنیں بھی لہروں کی شکل میں موجود ہیں۔ ہوا بھی چل رہی ہے وہ بھی لہروں کی شکل میں موجود ہی ہے۔ فضا میں خنکی و گرمی اور گرد و غبار ہر چیز موجود ہے لیکن مرنے والا آدمی مرجاتا ہے۔ تو اِس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ ہمارے جینئس لوگ، ہمارے دانشور لوگ موت و حیات کے فلسفے سے واقف نہیں ہیں۔ وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ انسان مرکیوں جاتا ہے؟ وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ انسان زندہ کیوں ہو جاتا ہے؟ اس لئے کہ زندگی کا دار و مدار اگر آکسیجن پر ہے، گیسز (Gasses) پر ہے، ہوا پر ہے پانی پہ ہے، غذاؤں پر ہے تو مرنے والا آدمی جس وقت پلنگ پر ڈیڈ باڈی (Dead Body) ہو جاتا ہے تو اُس وقت یہ ساری چیزیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا محدود شعور اس بات سے ناواقف ہے کہ ہم زندہ کیوں ہیں؟ ہم مرکیوں جاتے ہیں؟ ہم پیدا کیوں ہوتے ہیں؟ ہمارے اندر جو توانائی ہے وہ کس طرح بنتی ہے؟ اگرچہ جب کیلوریز بنتی ہیں اس سے آدمی زندہ رہتا ہے۔ اگر یہ زیادہ خرچ ہو جائیں تو آدمی کمزور ہو جاتا ہے۔ کیلوریز کم خرچ ہو جائیں تو وہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ وہاں بھی عجیب صورتحال ہے۔ ایک پہلوان آدمی اور ایک دُبلا پتلا آدمی اُس کی زندگی کا جب آپ تجزیہ کریں گے تو وہاں بھی عقل جو ہے وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پاتی۔ کیلوریز کا جو فلسفہ ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔

تو ثابت ہوا کہ جس شعور سے نوعِ انسانی واقف ہے یا جس شعور میں نوعِ انسانی زندہ ہے وہ شعور وہ نہیں ہے جس کو ہم قلندر شعور کا نام دیتے ہیں۔

☆ قلندر شعور آزاد طرزِ فکر رکھنے والا شعور ہے۔

☆ قلندر شعور غیر جانبدار زاویہ نظر سے چیزوں کو سمجھنے والا شعور ہے۔

☆ قلندر شعور زندگی کے (Equation) اور فارمولوں سے واقف شعور ہے۔

☆ قلندر شعور اس بات سے واقف شعور ہے کہ انسان پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھا اور مرنے کے بعد کہاں چلا جاتا ہے۔

کتاب ''قلندر شعور'' میں آپ پڑھیں گے تو اس میں سب سے پہلے عقلی توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حیوانی عقل اور انسانی عقل میں اگر فرق ہے تو وہ کیا ہے اگر فرق نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے؟ اور انسان کس عقل کی بنیاد پر، کس شعور کی بنیاد پر، کس فہم کی بنیاد پر اور کس تفکر کی بنیاد پر اپنے آپ کو ممتاز قرار دے سکتا ہے۔

''قلندر شعور'' کتاب کا نام رکھنے میں میرے پیش نظر، میرے اُستاد، میرے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ تھے جن کی طرزِ فکر سے، آزادانہ طرزِ فکر سے میں اس قابل ہوا کہ میں نے یہ کتاب لکھی۔

اِس کتاب کے لکھنے کا منشاء نوعِ انسانی کو خصوصاً عظیمی برادری کو یہ ہے کہ ''آزاد طرزِ فکر سے واقف ہو کر انسان اپنا شرف تلاش کر سکتا ہے۔ محدود دائرے میں رہ کر خود کو آزاد کر لے تو اُس کے اوپر اِس بات کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ اس دنیا سے باہر کیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اے گروہ انسان اور جنّات تم اس زمین اور آسمان کے کناروں سے باہر نکل کر دکھاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے۔'' سلطان ایک آزاد طرزِ فکر ہے۔ ''یہی سلطان قلندر شعور ہے''۔ قلندر شعور آپ کی راہنمائی کرے گا کہ گوشت پوست کا جسم کیا معنی رکھتا ہے۔ گوشت پوست کے جسم کی جو مشینری ہے اس مشینری کے اندر یہ خون کی ترسیل کا جو نظام ہے اُس کا ایک ایندھن سسٹم وغیرہ وغیرہ ہے وہ کس بنیاد پر قائم ہے؟ آج تک بڑے سے بڑا سائنسدان یہ معلوم نہیں کر سکا کہ یہ دل دھڑکتا کیوں ہے؟ مجھے ایک صاحب بتا رہے تھے کہ انسان کے اندر وریدوں اور شریانوں کی جو لمبائی ہے وہ ایک لاکھ پچاس ہزار کلومیٹر ہے۔ ایک لاکھ پچاس ہزار کلومیٹر ہمارے اندر شریانیں اور وریدیں ہیں اور دل جب ایک دفعہ پمپ کرتا ہے تو ستر ہزار وریدوں اور شریانوں کو سیراب کرتا ہے آخر یہ کون سی توانائی ہے کون سی وہاں بجلی کے جنریٹر لگے ہوئے ہیں؟

''اگر قلندر شعور سے آدمی واقف ہو جائے تو وہ اُن چیزوں سے بھی واقف ہو جاتا ہے کہ جن چیزوں کی بنیاد پر وہ زندہ ہے، جن چیزوں کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے اُسے اشرف المخلوقات کہا ہے۔''

سوال:

زمین اور آسمان کے کناروں سے کیا مراد ہے؟

جواب:

وہی حد بندی، محدودیت، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم جس محدود شعور میں بند ہو، آسمان اور زمین کو جس محدود شعور سے تم جانتے ہو، اُس محدود شعور سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ تم لامحدود شعور سے واقفیت حاصل کرلو۔ زمین کیا چیز ہے؟ محدود شعور کا نام زمین ہے۔ آسمان کیا چیز ہے؟ وہ لامحدود، لامحدود شعور کہہ لیجئے۔ لیکن یہ محدود لاشعور کا نام ہے۔ جب ہم نے سات آسمان کہہ دیئے تو محدودیت میں آپ داخل ہوگئے۔ آسمان کی جب حد بندی ہوگئی تو محدودیت ہوگئی۔ زمین کی حد بندی ہوگئی وہ بھی محدودیت ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم محدود شعور سے اُس وقت تک نہیں نکل سکتے جب تک کہ تم اپنے اندر اُس صلاحیت سے واقف نہ ہو جاؤ، جو صلاحیت تمہیں محدود شعور سے نکال کر لامحدود شعور میں داخل کرتی ہے۔ اب وہ ہماری اصطلاح میں عظیمیہ اسکول کی اصطلاح میں اُس کا نام ''قلندر شعور'' ہے۔

سوال: محدود شعور کو متحرک کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ محدود شعور کو متحرک کر کے لامحدود کیسے بنائیں؟ جبکہ آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ محدود شعور کو متحرک کرنے کا طریقہ کسی کو معلوم نہیں ہے؟

جواب:

کسی کو معلوم نہیں بھئی وہی تو بتائیں گے آپ کو آئندہ۔ یہاں جو اس وقت ہمارے ہاں سائنسی ریسرچ (Research) ہے وہ ساری کی ساری رفتار کے اوپر ہے۔ رفتار کو اتنا تیز کر دیا جائے کہ ٹائم کی نفی (Time-Less) ہو جائے۔

اگر کسی صورت سے شعور کی رفتار اتنی بڑھا دی جائے تو وہ شعور ہی نہ رہے تو شعور کے اوپر لامحدود شعور کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ پیدل چلتے ہیں تو ایک گھنٹے میں تین چار میل چلیں گے۔ سائیکل پر چلیں گے تو چھ سات میل چلیں گے۔ موٹر سائیکل پر چلیں گے تو تیس پینتس میل چلیں گے۔ گاڑی میں چلیں گے سو میل چلیں گے۔ ہیلی کاپٹر میں چلیں گے تو ہزار پندرہ سو میل چلیں گے ہوائی جہاز میں چلیں گے۔ تین ہزار میل چلیں گے تین ہزار میل فی

گھنٹہ۔ کنکارڈ میں چلیں گے تو ہوا کی رفتار سے چلیں گے۔ بات ساری رفتار کی ہے۔ تو ہمارا جو شعور ہے جس کو ہم شعور کہتے ہیں وہ مٹھک بیل کی طرح ہے۔ جب تک اس کی دُم نہیں پکڑو گے چلے گا نہیں اور یہ شعور آرام طلب ہے، کام چور ہے۔ ایسی کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ جس کام کی وجہ سے اُس کے ذاتی مفاد کے علاوہ نوعِ انسانی کو بھی فائدہ پہنچ سکے۔ جتنا انسان اپنے خول میں بند ہو جائے گا اتنا ہی اس کے شعور کی رفتار کم ہو جائے گی۔ وہ مزید محدود ہو جائے گا اور جتنا انسان اپنی ذات سے ہٹ کر اپنے خاندان کے لئے، اپنی برادری کے لئے، اپنی قوم کے لئے اور پوری نوعِ انسانی کے لئے سوچے گا عمل کرے گا اُسی مناسبت سے اُس کے شعور کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ مثلاً آپ خدمتِ خلق کا شعبہ قائم کرتے ہیں اس خدمتِ خلق کے شعبے میں پیش رفت ہو جاتی ہے ایک وہ آدمی ہے جو اپنی ذات کے علاوہ سوچتا ہی نہیں ہے اور ایک وہ آدمی ہے جو اپنی ذات کے بارے میں نہیں سوچتا دوسروں کے بارے میں سوچتا ہے۔ کیا اُس کے اعمال و حرکات کی رفتار اس آدمی کے برابر ہوگی یا زیادہ ہوگی...... (زیادہ ہوگی) تو جتنا انسان اپنے خول سے باہر نکل جائے گا اسی مناسبت سے اُس کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ بھئی اشفاق احمد صاحب نے بڑی اچھی بات کہی تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ایک آدمی جو ہے ایک وقت میں اتنے سارے کام کیسے کر لیتا ہے۔ بڑی اچھی بہت پیاری بات کہی ہے تقریر میں کہ حضرت کتابیں بھی لکھ رہا ہے، خطوں کا جواب بھی دے رہا ہے، دورے بھی کر رہا ہے اور بیمار بھی ہو رہا ہے اور بخار بھی ہو رہا ہے۔ جب اُس کے کام کا موازنہ کیا جاتا ہے تو یقین ہی نہیں آتا ہے کہ یہ کام کیسے کر سکتا ہے۔ بات وہی ہے کہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر آپ یہاں سے کراچی جائیں گے تو ایک گھنٹہ بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ ریل میں بیٹھ کر جائیں گے تو چوبیس گھنٹوں میں پہنچیں گے۔ بیل گاڑی میں جائیں گے تو ظاہر ہے کہ آپ نو دس دن میں پہنچ جائیں گے بلکہ پندرہ دن میں ہی پہنچیں گے۔ اب بیل گاڑی میں سفر کرنے والا آدمی ہوائی جہاز کی رفتار کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ ہوائی جہاز کی رفتار سے واقفیت کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیل گاڑی میں بند شعور سے باہر نکل کر ریل میں بیٹھے۔ ریل کے بند شعور سے بھی نکل کر ہوائی جہاز میں بیٹھے۔ ہوائی جہاز کے بعد بھی شعور ہے، دیکھیں نہ ایک گھنٹہ بیس منٹ پابندی تو ہے۔ ہوائی جہاز کے محدود اور بند شعور سے نکل کر اُس شعور میں داخل ہو جائے جہات لمحات کا بھی وجود ہے۔ مثال آپ کے سامنے ہے چاہے سائیکل پر سفر کریں، بیل گاڑی میں سفر کریں، موٹر سائیکل پر سفر کریں، ریل میں سفر کریں یا ہوائی جہاز میں سفر کریں اس سے ایک قانون یہ پتا چلا کہ انسان کے اندر یعنی انسان کے ذہن میں الاسٹک کی طرح سکڑنے اور پھیلنے کی صلاحیت ہے۔

جب وہ پیدل چلتا ہے تو اُس کو چلانے والی ایجنسی اتنی محدود ہو جاتی ہے کہ وہ دو یا تین میل چلاتی ہے۔ جب وہ جہاز پر بیٹھتا ہے تو اُس کو چلانے والی ایجنسی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ اُس کو ایک گھنٹے میں تین ہزار میل چلاتی ہے۔ اگر انسان کے اندر پیدل چلانے والی صلاحیت جہاز میں بیٹھ کر وہی رہے گی جو پیدل چلنے والی ہے تو انسان کا دماغ پھٹ جائے گا اور وہ مر جائے گا۔ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جب جہاز اترتا ہے تو ان کا رنگ ایسے ہوتا ہے جیسے سفید کپڑا۔ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جہاز میں بیٹھنے ہی سے ڈرتے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ ان کے اندر جو صلاحیت ہے اس میں پھیلنے اور سمٹنے کی جو صلاحیت ہے وہ متحرک نہیں ہو پاتی۔

تو انسان ایک ایسا اللہ تعالیٰ کا عجوبہ ہے کہ یہ جہاں بھی ہو جس حال میں بھی ہو ذہن اُس ماحول کو بھی قبول کر لیتا ہے اُس بات کو بھی قبول کر لیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتار بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ محدود رفتار بھی ہو سکتا ہے۔ اس صلاحیت کو متحرک کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کی شروعات اللہ تعالیٰ کے ذہن میں سے نکلے ہوئے لفظ ''کُن'' سے ہوئی ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ جب یہاں کچھ نہیں تھا تو ایک ذات موجود تھی جس کو ہم اللہ تعالیٰ کے نام سے جانتے ہیں۔ اللہ نے یہ چاہا کہ ایک کائناتی سسٹم بنایا جائے۔ اس کائناتی سسٹم کو اللہ تعالیٰ نے پورے پروگرام کے ساتھ، خدوخال کے ساتھ، نقش و نگار کے ساتھ، معین مقداروں کے ساتھ اور درجہ بندی کے حساب سے تخلیق کیا۔

کتاب کی ابتدائی سطریں اس طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ محدود شعور کو باخبر کیا جا رہا ہے کہ محدود شعور کے علاوہ بھی اور ایسی چیزیں ہیں جن سے شعور واقف نہیں ہوا۔ مثلاً ایک کتاب المبین۔ اس لفظ کی تشریح آپ محدودیت کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔

ایک کتاب المبین، شعور ایک کو تو جانتا ہے لیکن کتاب المبین کو نہیں جانتا۔ شعور کے ایک جاننے کا سہارا لے کر شعور کو ایسی فضا میں دھکیل دیا گیا ہے کہ جس سے شعور واقف تو نہیں ہے لیکن وہ ایک سے واقف ہے اس لئے وہ کتاب المبین کے بارے میں انکار نہیں کر سکتا یعنی ایک کتاب المبین کہہ کر شعور کے اوپر ضرب لگائی گئی ہے کہ ایک، دو، تین، چار کمرے نہیں ہوتے، ایک، دو، تین، چار کرسیاں ہی نہیں ہوتیں، ایک، دو، تین چار، آدمی نہیں ہوتے، ایک کتاب المبین بھی ہوتی ہے۔ شعور نے جب اس بات کو قبول کیا کہ ایک کتاب المبین۔ شعور کتاب سے بھی واقف ہے، ایک کتاب المبین۔ شعور ایک سے بھی واقف ہے۔ شعور کتاب سے بھی واقف ہے اور شعور مبین سے بھی واقف ہے۔ روشن چیز کو مبین کہتے ہیں۔

یعنی ایک ایسی کتاب جو روشنیوں سے اور انوار سے بھری ہوئی ہے۔ تو سب سے پہلے شعور کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا گیا کہ شعور جس ایک میں بند ہے انر (Inner) میں۔ یعنی ایک بند اور محدود دائرے میں کتاب المبین دو لفظ کا اور اضافہ کر کے شعور کی محدودیت کو ایک سے ختم کر کے تین میں داخل کر دیا گیا ہے۔ تین میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شعور کی محدودیت میں ہم سب کردار داخل ہیں۔ دوسری بات ایک کے بعد کتاب کا تذکرہ آیا تو شعور اس بات سے واقف ہے کہ کتاب اُس دستاویز کا نام ہے جس میں صفحے ہوتے ہیں، ورق ہوتے ہیں، جلد ہوتی ہے اور اُن صفحات پر تحریر لکھی ہوتی ہے۔ تو جب کتاب کا تذکرہ آیا شعور کیلئے لامحالہ ایک وسعت پیدا ہوگئی۔ ایک کتاب یعنی کوئی ایسی چیز ہے کہ جو دستاویزی شکل میں موجود ہے۔ اور وہ دستاویز کیا ہے اُس کا تعلق انوار اور روشنیوں سے ہے۔ ایک کتاب المبین۔ جب شعوری طور پر کوئی بندہ ایک کتاب المبین کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شعور جو ایک میں محدود ہے اس کی وسعت کتابی ہوگئی۔ جب کتابی وسعت ہوگئی اب کتابی شعور اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ کتاب میں کہانی بھی ہوتی ہے، افسانہ بھی ہوتا ہے۔ ریاضی بھی ہوتی ہے۔ بے شمار شعبے ہیں جو کتابوں سے ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔ ایک کتاب المبین سے مراد ایک ایسی کتاب جس کے اوپر نورانی تحریر نقش ہے یعنی اس کتاب کا تعلق صفحات سے، ورقوں سے، سطروں سے، لفظوں سے، حرفوں سے تو ہے لیکن یہ سارے الفاظ، سارے حروف نور کے غلاف میں بند ہیں۔

ایک کتاب المبین شعور کی ایک محدودیت ختم ہو کر ایک کتاب کی سطح پر بکھر گئی ہے، پھیل گئی ہے کتاب کی سطح پر روشن تحریر لکھی ہوئی ہے۔ کالی روشنائی سے لکھی، نیلی روشنائی سے لکھی کس روشنائی سے لکھی ہے۔ کتاب المبین ساری کی ساری روشنی، نور ہے اور اُس نور میں اللہ تعالیٰ کا پروگرام جو ''کُن'' سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ذہن میں تھا وہ پروگرام نورانی تحریر میں ایک کتابی شکل میں موجود ہے یعنی شعور کی محدودیت جو ایک محدودیت میں بند ہے۔ لفظ ایک میں ایک کتاب المبین کہہ کر شعور کی سطح کو زمین کو سطح سے نکال کر بلند اور ارفع سطح میں داخل کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کُن کہا۔ کُن کہنے سے اللہ تعالیٰ کے ذہن میں جو پروگرام تھا وہ سارا کا سارا مظہر بن گیا۔ اور وہ جو مظہر بنا تو پہلے اُس کی ایک دستاویز بنی اور اُس دستاویز کو قرآن پاک نے کتاب المبین کہا۔ دیکھئے یہ بڑی عجیب بات ہے سوچنے کی بات ہے۔ ایک کتاب المبین تو ٹھیک ہے۔ ایک کتاب المبین تو ایک کتاب المبین، جب تک آپ آزادانہ طرزِ فکر سے قلندر شعور سے ایک کتاب المبین کے بارے میں ریسرچ نہیں کریں گے تو آپ کا شعور محدود رہے گا۔ لیکن اگر آپ قلندر شعور کتاب کے نام کی مناسبت سے ایک کتاب المبین اور کن کے بارے میں تفکر

کریں گے تو آپ کا ذہن کششِ ثقل اور (Gravity) سے آزاد ہو کر آسمانوں سے نکل کر جذبات سے نکل کر اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اللہ کے بعد تخلیق کا پہلا مرحلہ موجود ہے اور اگر ہم غور نہ کریں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

''کتاب المبین سے مراد کائنات کا یکجائی پروگرام۔''

کتاب المبین سے مراد کائنات کا یکجائی پروگرام کس سسٹم کے تحت بنایا گیا، کس سسٹم کے تحت قائم ہے اور کس سسٹم سے وہ چل رہا ہے۔ یہ کتاب المبین کا مطلب ہے۔''

باقی تشریح اگلے لیکچر میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو محدود شعور سے نکال کر لامحدود شعور میں داخل فرمائے۔ (آمین)۔

السلام علیکم!

☆......☆......☆

جامعہ عطا نعیمیہ کا فخر الاسلام کلاس قلندر شہود میں لیکچر دیتے ہوئے

کنز الایمان ... میٹنگ میں جامعہ نعیمیہ لاہور میں ... خطاب فرما رہے ہیں

دوسرا لیکچر:

شعور اور لاشعور

آج کی کلاس میں، میں آپ سے سوال پوچھتا ہوں بتائیں، ”شعور، لاشعور کیوں نہیں ہے اور لاشعور، شعور کیوں نہیں ہے؟“ .... کچھ دیر بعد خود ہی فرمانے لگے کہ

ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کے اندر (Information) یعنی اطلاع کو معنے پہنانے کی صلاحیت بالکل نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ زندگی کا دار و مدار اطلاعات یا (Informations) پر ہے اور زندگی کسی بھی لمحے اطلاعات یا انفارمیشن کے علاوہ قائم نہیں رہتی ہے۔ جب ہم یہاں پیدا ہوتے ہیں تو سب سے پہلے بچے کے اندر جو انفارمیشن منتقل ہوتی ہے اور وہ اُس کو معنے پہناتا ہے وہ سونگھنے کی حِس ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے اندر یا زمین کے اوپر موجود جتنی بھی مخلوقات ہیں پہلی جو انفارمیشن ہے وہ سونگھنے کی حس ہے اور اُسی سونگھنے کی حس سے کوئی بچہ سب سے پہلے اپنی ماں کو پہچانتا ہے۔ سونگھنے کے بعد جو دوسری حس بچے کے اندر پیدا ہوتی ہے وہ مادی جسم کو فیڈ (Feed) کرنے کی صلاحیت ہے یعنی بچہ جسمانی نشوونما کے لئے غذا حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے انسان کے اندر سب سے پہلی حِس جو متحرک ہوتی ہے وہ سننا ہے۔ سننا در اصل وہ پہلی انفارمیشن ہے جو بچے کے اندر لاشعوری صلاحیت کو بیدار کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب اس بات کی پابندی کرتے ہیں کہ بچہ جب پیدا ہو جائے تو اُس کو آواز سنائی جائے۔ مثلاً کوئی گھنٹی بجاتا ہے کوئی کچھ اور طریقہ اختیار کرتا ہے، کوئی پانی کا چھینٹا دیتا ہے کچھ پڑھنے کے بعد اور اسلام میں اذان دی جاتی ہے۔ یعنی انسان کے لاشعوری اعتبار سے پہلی حِس جو ہے وہ سننا ہے اور انسان کے اندر مادی نقطۂ نظر سے پہلی حِس جو ہے وہ سونگھنا ہے۔

حسب القیاس اسی طرح بتدریج بچہ بڑا ہوتا رہتا ہے اور اِس کے اندر حِسیں بیدار اور متحرک ہوتی رہتی ہیں مثلاً سونگھنے کی حس، سننے کی حس، پہچاننے کی حِس، بولنے کی حِس، پکڑنے کی حِس جتنی بھی حسیّں ہیں جو انسان کے اندر کام کرتی ہیں بتدریج وہ بچے کے اندر پانچ یا چھ مہینے کی عمر تک منتقل ہو جاتی ہیں۔

پچھلی کلاس میں ہم نے شعور اور لاشعور کی محدودیت پر آپ سب لوگوں کے خیالات سنے۔ یہ شعور کی

محدودیت، لاشعور کی لامحدودیت دراصل اس طرح ہیں کہ شعوری ارتقاء جب ہوتا ہے یا شعور کی محدود صلاحیتوں کو جب بڑھایا جاتا ہے۔ مشقوں کے ذریعے، ماحول کے ذریعے، اساتذہ کے ذریعے، تعلیمات کے ذریعے، جس طرح بھی ہو شعور کو آہستہ آہستہ ایسی صلاحیتیں منتقل کی جاتی ہیں کہ وہ دس سال کی عمر میں ایک دن کا بچہ نہیں رہتا اور اس طرح ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے مقابلے میں جاہل آدمی بالکل الگ نظر آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شعور دراصل ایک ڈی لینیٹ چیز ہے ایک ایسی تختی ہے جس کے اوپر کچھ بھی نہیں لکھا ہوا۔ اسی بات کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔'' ماں باپ اسے ہندو، مسلمان، کافر جو بنانا چاہیں بنا دیتے ہیں۔

بات وہی ہے کہ وہ شعور کی جو بلینک (Balnk) تختی ہے اس کے اوپر جیسے جیسے نقوش ابھرتے رہتے ہیں اُسی مناسبت سے شعور کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ شعور کی صلاحیت میں اضافے کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے دماغ میں کروڑوں یا اربوں خُلیے ہوتے ہیں اور وہ جیسے جیسے شعور کی تحریکات انسان کا دماغ قبول کرتا ہے ماحول سے، اُسی مناسبت سے دماغ کے اندر جو سیلز (Cells) ہیں وہ زیادہ سے زیادہ چارج ہوتے ہیں لیکن اس چارج ہونے میں بہرحال ہر جگہ شعور کی کارفرمائی موجود ہے۔ محدود اور لامحدودیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لفظی معنوں میں لیا جاتا ہے کہ بس صاحب لاشعور لامحدود ہے اور شعور محدود ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ شعور کا جو پھیلاؤ ہے وہ کم ہے، لاشعور کا جو پھیلاؤ ہے وہ زیادہ ہے۔

لیکن شعور کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایسی صفات منتقل کی ہیں کہ جیسے جیسے شعور کی نالج ملتی ہے اُسی مناسبت سے شعور لاشعور کی طرح پھیلتا رہتا ہے۔ جس طرح لاشعور میں وسعت ہے اُسی طرح شعور میں بھی وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے۔

ہم نے یا حُضور قلندر بابا اولیاءؒ نے کتاب ''لوح وقلم'' میں چار شعور کا ذکر کیا ہے۔ چار شعور محدود بھی ہیں اور لامحدود بھی ہیں۔ ہر شعور چونکہ اس کا نام رکھ دیا گیا ہے اس لئے محدود ہے۔ کوئی بھی چیز جس کا نام رکھ دیا جائے وہ محدودیت کے دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔

تو بات شعور کی محدودیت کی ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے شعور کے اندر نالج بڑھتا چلا جاتا ہے اُسی مناسبت سے شعور کا پھیلاؤ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شعور اور لاشعور دونوں کا پھیلاؤ ایک ہو جاتا ہے یعنی شعور اور لاشعور دونوں ایک دوسرے کے (Parallel) کام کرتے ہیں۔ انفارمیشن جو اوپر سے آ رہی ہے لاشعور میں، وہ لاشعوری انفارمیشن پہلے شعور میں منتقل ہوتی ہے پھر مظاہرہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر شعور اور لاشعور دونوں

(Parallel) ہو جائیں، ایک دوسرے کے متوازی ہو جائیں تو شعور اور لاشعور دونوں انفار میشن کو بیک وقت قبول کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ اصل اہمیت شعور کی ہے لیکن اگر شعور نالج کے اعتبار سے، معلومات کے اعتبار سے، وسعت کے اعتبار سے کم ہے تو وہ جتنا کم ہے اتنا محدود ہے اور نالج کے اعتبار سے، وسعت کے اعتبار سے جتنا اس کا زیادہ پھیلاؤ ہے اتنا ہی وہ لامحدود ہے لاشعور کو ہم لامحدود اس لئے کہتے ہیں کہ لاشعور کی وسعت شعور کے پیمانے سے اتنی زیادہ ہے کہ شعور اُس وسعت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر شعور کی وسعت بڑھ جائے اور وہ لاشعور کے (Parallel) کام کرنے لگے تو اُس کو ہم محدود نہیں کہہ سکتے۔

ابھی یہ بات طے ہوئی ہے کہ چاروں شعوروں کا جب ہم تذکرہ کرتے ہیں تو دراصل ہم ایک محدود شعور کا ذکر کرتے ہیں باقی تین لامحدود لاشعور کا ذکر کرتے ہیں۔ صورتحال یہ ہے کہ جب شعور پہلے لاشعور کی وسعت کے مطابق بن جاتا ہے یعنی شعور اور لاشعور دونوں متوازی ہو جاتے ہیں تو ایک دوسرے کے (Parallel) کام کرتے ہیں۔ تو اب شعور اور لاشعور کی دونوں کی حیثیت شعور کی سی ہو جاتی ہے۔ پھر وہی شعور اور لاشعور جو شعور بن گئے ہیں اس کی حیثیت تیسرے لاشعور کے مقابلے میں محدود ہو جاتی ہے اور کم وسعت ہو جاتی ہے۔ پھر یہ مرکب شعور، ...... شعور لاشعور مرکب شعور، تیسرے لاشعور یعنی تیسرے لاشعور کا نالج حاصل کرتا ہے اور بتدریج اس کی بساط میں اضافہ ہوتا رہتا ہے وسعت بڑھتی رہتی ہے۔ ایسی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ مرکب شعور تیسرے لاشعور کے (Parallel) کام کرتا ہے۔ اب صورت یہ ہوئی کہ تین شعور ایک شعور بن گئے۔

اب تین شعوروں سے مرکب یعنی ایک شعور دو لاشعور سے مرکب پھر ایک شعور بن جاتا ہے۔ پھر یہ شعور چوتھے لاشعور کا نالج حاصل کرتا ہے اور پھر چوتھے لاشعور کی وسعت جو بے پناہ ہے بے حد و حساب ہے اس کو کسی طرح الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آہستہ آہستہ چوتھے لاشعور کا تمام ذخیرہ تمام معلومات، تمام نالج اس میں تجلی، تدلّی، اللہ تعالیٰ کے رموزِ کائنات، تخلیقی فارمولے یہ جب نالج تین شعوروں سے مرکب ایک شعور کو حاصل ہو جاتا ہے تو یہ شعور چوتھے لاشعور کے (Parallel) ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ چاروں شعور ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں ایک دوسرے کی وسعت کو اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں اب یہ ایک ایسا شعور ہے جس کا نام ہم کسی بھی طرح شعور نہیں رکھ سکتے۔ اسی کو قرآن پاک نے سلطان کا نام دیا ہے۔ سورۃ رحمان میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اے گروہ جنات و انسان! تم زمین و آسمان کے کناروں سے تم نہیں نکل سکتے، مگر سلطان سے۔ دیکھئے! سات آسمان بھی ہیں زمین بھی ہے یعنی کائناتی پروگرام، کائناتی حد بندی، کائناتی سسٹم میں داخل ہونا۔ اگر تم کائناتی سسٹم سے باہر نکل

سکتے ہو یعنی پوری کائنات کے نظام کو سمجھنا چاہتے ہو تو تم یہ نہیں کر سکتے۔

سات آسمان دراصل سات شعور ہیں یہ الگ ایک بحث آ گئی ہے کہ ہم نے ابھی چار شعوروں کا ذکر کیا ہے۔ تو سات آسمانوں سے اور سات آسمانوں کی یہ جو انفارمیشن ہے، سات آسمانوں کے اندر جو کچھ ہے اور اُن سات آسمانوں کے اندر جو کچھ موجود ہے جس اسکرین پر اس کا مظاہرہ ہو رہا ہے اگر تم اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہو تو تم نہیں کر سکتے۔

اگر تم واقفیت حاصل کر سکتے ہو، جان سکتے ہو، کناروں سے نکلنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لاہور سے باہر نہیں نکل سکتے اگر لاہور سے باہر نکل سکتے ہو۔ نکل کے دکھاؤ تو اس کا صاف مطلب ہے کہ ہمیں چوائس دی گئی ہے کہ ہم لاہور سے باہر نکلیں، اب لاہور کے دس راستے ہیں تو پہلے ایک راستے سے نکلیں گے پھر دوسرے سے دوسرے سے نہیں تو تیسرے سے نکلیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم لاہور سے نکلنے کے لئے اگر دس راستے ہیں تو ہم ان دس راستوں پر (Try) ٹرائی کریں گے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پورے لاہور سے واقف ہو گئے ہیں۔ لاہور میں کتنی سڑکیں ہیں کتنے محلے ہیں، کیسے لوگ ہیں، گرمی ہے، سردی ہے، برسات ہے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم نہیں نکل سکتے۔ مگر ایک صورت ہے نکلنے کی ''اِلا بسلطان'' کہ تمہارے اندر جو چار مرکب شعور (Parallel) کام کر رہے ہیں اگر تم اس کو حاصل کر لو تو تم کائناتی نظام سے باہر نکل سکتے ہو۔ یعنی کائناتی نظام کو دیکھ سکتے ہو، سمجھ سکتے ہو۔

تو محدودیت اور لامحدودیت کا فلسفہ صرف اتنا ہے کہ اگر آپ کے اندر وسعت کم ہے تو آپ محدود ہیں اگر آپ کے اندر وسعت زیادہ ہے آپ لامحدود ہیں۔ اب جتنی وسعت زیادہ ہے آپ اتنے لامحدود ہیں جتنی وسعت کم ہے اتنے محدود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اس طرح فرمایا ہے کہ ''تمہارے سارے سمندر روشنائی بن جائیں اور زمین کے اوپر موجود تمام درخت قلم بن جائیں اور اللہ کی نشانیوں کو تم لکھنا شروع کر دو یعنی سمجھنا، سمجھنے کی کوشش کرو تو درخت بھی ختم ہو جاؤ گے اور پانی بھی ختم ہو جائے گا'' کیا مطلب ہوا اس کا؟ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اللہ تک پہنچنے کے لئے، اللہ کے نظام میں داخل ہونے کے لئے محدودیت جو ہے وہ ایک بڑی دیوار ہے جس کو آپ کسی طرح کراس (cross) نہیں کر سکتے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ سارا سمندر روشنائی بنا دو روشنائی ختم ہو جائے گی، سمندر تو محدود ہوتا ہے سارے درخت قلم بن جائیں گے، درخت بھی محدود ہوتا ہے۔ مقصد وہاں یہی ہے کہ محدودیت میں اگر آپ انفارمیشن قبول کر رہے ہیں تو آپ کی رسائی زمین و آسمان سے نہ باہر ہو سکتی ہے اور نہ زمین

و آسمان کے اندر ہو سکتی ہے۔ مثلاً اب زمین کا معاملہ ہے۔ اب زمین کے اندر سائنسدان تحقیق کرتے ہیں تلاش کرتے ہیں، نئی نئی دھاتوں کی تحقیق ہوئی ہے۔ یورینیم جیسے نکل آئی۔ تو عام آدمی کے معاملے میں سائنسدانوں کی اس کوشش کو آپ لامحالہ لامحدودیت کا نام دے دیتے ہیں۔ ایک جاہل آدمی کے مقابلے میں ایک پڑھے لکھے آدمی کے دماغ کے بارے میں لازماً یہ کہیں گے کہ یہ لامحدود ہے اور جاہل کو آپ محدودیت کا نام دیں گے۔

تو یہاں صورتحال یہ ہے کہ بشری تقاضوں کے تحت انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح تخلیق کیا ہے کہ وہ محدودیت سے چل کر لامحدودیت میں داخل ہوتا ہے۔ اور محدودیت سے چل کر لامحدودیت میں داخل ہونا دراصل اُس سلطان کو تلاش کرنا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم سلطان سے واقفیت حاصل کر لو یعنی تم اس بات سے وقف ہو جاؤ کہ بظاہر تو تم محدود ہو لیکن تمہارے اندر لامحدود صلاحیتیں اتنی زیادہ ہیں کہ تم آسمان اور زمین کے اندر جو صلاحیتیں ہیں اُس سے بھی زیادہ لامحدود ہو۔ آسمان اور زمین کی جتنی وسعت ہے تم اُس سے بھی زیادہ وسعت رکھتے ہو اپنے اندر اور یہی وہ طرزِ کلام ہے اللہ تعالیٰ کا کہ جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ

''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍo ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَo''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان میری بہترین صناعی ہے۔ لیکن یہ اسفل السافلین میں پڑا ہوا ہے۔ بہترین صناعی لامحدودیت ہے۔ اسفل السافلین محدودیت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ محدودیت کے دائرہ کار میں اپنے آپ کو قید نہ کرو۔ محدودیت کے دائرہ کار سے جیسے جیسے تم نکلنے کے لئے جدوجہد اور کوشش کرتے رہو گے محدود وسعت لامحدود ہوتی چلی جائے گی اور نتیجے میں وہ محدودیت جس محدودیت کی بنا پر آپ دو قدم بھی نہیں اُٹھا سکتے بغیر ٹائم اسپیس کے لامحدود ہو جائے گی۔ مثلاً آپ ایک قدم اُٹھاتے ہیں۔ تو ایک قدم سے دوسرا قدم اُٹھانے میں آپ محتاج ہیں اسپیس (Space) کے، ایک قدم سے دوسرا قدم اٹھانے میں آپ محتاج ہیں ٹائم (Time) کے یعنی آپ نے جب ایک قدم اُٹھا کر دوسرا قدم زمین پر رکھا اُس زمین کا فاصلہ اگر ایک فٹ ہے اس کا مطلب ہوا کہ آپ کی یہ مجبوری ہے کہ ایک قدم اٹھانے کے بعد دوسرے قدم رکھنے میں آپ کو ایک فٹ زمین کے فاصلے سے گزرنا ہوگا۔ آپ اس سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اسی لئے جب آپ نے ایک قدم اُٹھا کے دوسرا قدم رکھا اس میں ایک سیکنڈ کا ہزارواں فریکشن سہی لیکن ٹائم خرچ ہوا۔

ایک آدمی ایک گھنٹے میں تین میل پیدل چلتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ تین میل...... تین میل کی مسافت یا

تین میل کی اسپیس یا تین میل کے فاصلہ کے لئے آپ کو ایک گھنٹے کا ٹائم چاہیئے۔ ایک گھنٹے میں تین میل آدمی چلا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۶۰ منٹ میں تین میل کا فاصلہ آپ کو طے کرنا پڑے گا۔ اگر آپ تین میل کا فاصلہ ساٹھ (۶۰) منٹ میں طے نہیں کریں گے تو آپ چل ہی نہیں سکتے، سفر نہیں کر سکتے۔ اسی صورت سے آپ کار میں بیٹھ گئے تو ایک گھنٹے میں آپ نے سو میل کا سفر، طے کیا تو کار میں بیٹھنے اور پیدل چلنے میں فرق یہ ہوا کہ آپ کی اسپیڈ بڑھ گئی۔ یعنی ایک آدمی جو مجبور ہے ایک گھنٹے میں تین میل فاصلہ طے کرنے پر، اگر وہ اپنی اسپیڈ بڑھا لے تو ایک گھنٹے میں سو میل کا سفر کر سکتا ہے۔ لیکن ایک گھنٹے میں تین میل کا سفر ہو۔ سو میل کا سفر ہو اسپیس سے گزرنا ہی ہوگا ٹائم خرچ ہونا ہی ہوگا۔ اِسی صورت سے ہوائی جہاز کا بھی ہے۔ ہوائی جہاز میں آدمی ایک گھنٹے میں تین ہزار میل کا سفر کر لیتا ہے۔ لیکن وہ ہزار میل کا سفر ہو، تین ہزار میل کا سفر ہو تین میل کا سفر ہو۔ سفر اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ٹائم اسپیس دونوں سے آپ نہ گزرتے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سفر کے لئے ضروری ہے کہ آپ کا ٹائم بھی خرچ ہو اور آپ اسپیس کے اوپر سے بھی گزریں۔ اس اسپیس پر سے گزرنا اور ٹائم کو خرچ ہونا اس طرف واضح اشارہ ہے کہ انسان ٹائم اسپیس میں بند ہے۔ یہ کس طرح بند ہو جاتا ہے ٹائم اسپیس میں انسان۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کچھ لوگوں نے شکایت کی تھی کہ ہمارا تو ذہن ہی بند ہو گیا۔ ٹائم اسپیس کو سمجھنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جب ہم زمین پر کھڑے ہوتے ہیں تو دراصل ہم اسپیس میں بند ہیں یعنی اُس زمین پر کھڑے ہیں، چلتے پھرتے ہیں لیکن (Space) میں بند ہیں۔ ٹائم گزار کر زمین پر چلنا یا اسپیس پر چلنا یہ سب حِس مکانیت ہے۔

میں نے آپ حضرات کو جو سوال کیا تھا محدودیت اور لامحدودیت کا۔ وہ یہ تھا کہ کتاب المبین اور شعور کی محدودیت یا لامحدودیت۔ یہ بات آج کی کلاس میں فائنل ہو گئی کہ شعور لاشعور جو بھی کچھ ہے اس میں بہرحال محدودیت ہے جتنی ہماری رفتار تیز ہو جائے گی، جتنا ہمارا شعور سے تعلق ایک شعور سے دوسرے شعور کا تعلق جو ہے اس سے قریب ہو جائے گا۔ جتنی شعور کی وسعت بڑھ جائے گی اسی حساب سے انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صلاحیتیں لامحدود ہوتی چلی جائیں گی۔

ایک کتاب المبین۔ ایک کتاب المبین میں تیس کروڑ لوحِ محفوظ۔ ایک لوحِ محفوظ میں اسی ہزار حضیرے۔ جب یہ ہم تعداد متعین کر رہے ہیں تو دراصل ہم محدودیت کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ اب محدودیت کا تذکرہ اس لئے مجبوری ہے کہ انسان کا جو شعور ہے وہ بالکل بچہ ہے۔ پہلا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی وسعت کے بارے میں کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا ہے اُسے نئی نئی اطلاعات فراہم ہوتی رہتی ہیں۔ اسی مناسب سے بچے

کا شعور بڑا ہوتا رہتا ہے اور اس کا پھیلاؤ بڑھتا رہتا ہے اور اِسی مناسبت سے بچے کی (Activities) بھی بڑھتی رہتی ہیں۔ مثلاً تین چار مہینے کا بچہ بیٹھتا ہی نہیں ہے۔ چھ مہینے کا بچہ زمین پر بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ سال بھر کا بچہ کھڑے ہو کر چلنے لگتا ہے۔ دس سال کا بچہ اور تیز بھاگتا ہے۔ تو جیسے جیسے اُس کے شعور کے اندر معلومات کا ذخیرہ ہوتا ہے معلومات کے ذخیرے سے اس کے اندر وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے اور یہ وسعت بھی دراصل ارتقاء ہے وہ یہ ایک بچے کا ارتقاء ہو یا قوم کا ارتقاء ہو یا پوری نوع انسانی کا ارتقاء ہو۔ ارتقاء سے مراد یہ ہے کہ انفارمیشن میں زیادہ سے زیادہ اضافہ اور انفارمیشن میں زیادہ سے زیادہ اضافے کی بنیاد پر شعور کا لاشعور سے زیادہ سے زیادہ قریبی تعلق یا قربت ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بہترین تخلیق فرمایا ہے۔

”لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیمٍO ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ“ O

انسان اللہ تعالیٰ کی بہترین تخلیق ہے لیکن جب یہ زمین پر آتی ہے تو اس کو ایک تختی، ایک سلیٹ، ایک کینوس، ایک اسکرین، ایسی فراہم کر دی جاتی ہے کہ جس میں جتنی زیادہ معلومات کا اضافہ ہوتا رہے گا اُسی مناسبت سے وہ مادی دنیا کے ساتھ ساتھ، مادی دنیا میں رہتے ہوئے غیب کی دنیا سے قریب ہوتا چلا جائے گا۔ اور جن لوگوں نے غیب کی دنیا کا مشاہدہ کیا ہے یا غیب کی دنیا میں داخل ہوئے ہیں انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ یہ بتاتے ہیں کہ کائناتی سسٹم میں بنیادی جو عوامل ہیں یا بنیادی جو بساط ہے وہ یہ ہے کہ ایک کتاب المبین ہے۔ ایک کتاب المبین میں تیس کروڑ لوحِ محفوظ ہیں۔ ایک لوحِ محفوظ میں اسی ہزار حضیرے ہیں۔ ایک کھرب سے زیادہ مستقل نظام اور بارہ کھرب غیر مستقل نظام ایک حضیرے کے اندر ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو لاشعور سے واقف ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس واقفیت کے لئے بحیثیت طالبِ علم آپ بھی بھرپور جدوجہد اور کوشش کیجئے انشاء اللہ آپ کامیاب و کامران ہوں گے۔

السلام علیکم!

☆......☆......☆

تیسرا لیکچر:

کُن فیکُون

کتاب قلندر شعور کی ابتدائی تین سطروں میں جو سب سے اہم لفظ ہے وہ "کُن" ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ذہن میں موجود کائناتی پروگرام کو شکل و صورت کے ساتھ وجود میں لانا چاہا تو کہا "کن" کوئی دس سال سے کوئی پانچ سال سے کوئی تین سال سے کوئی مہینوں سے یہ پڑھ رہا ہے، سُن رہا ہے تو جب اللہ میاں نے کہا کُن ہو جا اور ساری کائنات بن گئی...... سوال یہ ہے کہ لفظِ کُن ہو جا تو سمجھ میں آ گئی پھر مزید پڑھنے کی، لکھنے کی مراقبہ کرنے کی، سمجھنے کی کیا ضرورت تھی؟

"کُن" ۔اللہ نے کُن کہا۔ اللہ یہ چاہتے تھے اِس کا وہ مظاہرہ ہوگیا، مظہر بن گیا بس۔

اب یہ مزید پڑھنا، لکھنا اور جناب پشاور سے یہاں تک آنا اور گوجرانوالہ سے آنا اور اپنا وقت ضائع کرنا اور کیا ضرورت تھی اس کی؟

جب پتہ ہے کہ "اللہ نے کہا کُن، کائنات ہو جا! اور وہ ہوگئی۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہوا کہ کُن ، محض کُن سننا اور کُن معنی کا پتہ چل جانا، کُن کی تشریح نہیں ہے۔

اُستاد کا کام یہ ہے کہ کُن تو یہ بھی بتائے کہ کُن کا مطلب ہے ہو جا! اور کُن کیا چیز ہے اور کیوں ہوگئی؟

کاف۔نون۔ (ک ۔ن) کُن! اِن دو حرفوں میں ایسی کون سی طاقت ہے ایسا کون سا فارمولہ ہے ایسکون سی (Equation) ہے کہ دو حرف ک، ن۔ کن! تو پوری کائنات کا ایک ایسا مربوط سسٹم بن گیا کہ اس میں چاند بھی آ گئے، سورج بھی آ گئے، ستارے بھی آ گئے فرشتے بھی آ گئے، جنات بھی آ گئے، معدنیات بھی آ گئیں، جمادات بھی آ گئے، اشجار بھی آ گئے، حیوانات بھی آ گئے اُن کی پوری پوری زندگیاں آ گئیں، زمین آ گئی، سات آسمان آ گئے، ہے لفظ ک، ن = "کُن"۔

مطلب میرا عرض کرنے کا یہ ہے کہ آدابِ مجلس کا خیال رکھنا ہر جگہ ضروری ہے۔ لیکن روحانی آدمی اگر آدابِ مجلس کا خیال نہیں رکھتا اور اُس سے کسی کی دل آزاری ہو جاتی ہے تو وہ بہت بڑی غلطی ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے جو آپ کے اغراض و مقاصد بیان کئے ہیں سلسلے کے۔ اس میں بھی آپ نے پڑھا ہے اور وہ یاد بھی ہونے چاہئیں کہ

(i) "اگر دانستہ یا نہ دانستہ تم سے کسی کی دل آزاری ہو جائے وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اُس سے معافی مانگ لیں۔

(ii) اگر تمہاری دل آزاری کسی سے ہو جائے تو اُس کے لئے آپ کے اندر انتقام کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے۔ اُس کو فوراً معاف کر دینا چاہیئے۔''

تو دونوں باتوں کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ صبر اور تحمل سے کام لیں۔ اپنے اندر برداشت پیدا کریں۔ اگر کوئی خلافِ ضابطہ بات ہوئی تو مجلس میں نہیں، مجلس سے باہر جو بھی بڑے ہیں اُن کے سامنے رکھ کر اُس کو ٹھیک کرا لینا چاہیئے، ختم کرالینا چاہیئے یا آئندہ کے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب ہونا چاہیئے۔

اب قلندر شعور کی پہلی تین سطریں بلکہ اڑھائی سطریں اس وقت ہماری توجہ کا مرکز ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب اپنے ذہن میں موجود کائناتی پروگرام کو شکل وصورت کے ساتھ وجود میں لانا چاہا تو فرمایا کُن!

ان کے ذہن میں کائناتی پروگرام ایک ترتیب اور تدوین کے ساتھ وجود میں آ گیا۔

بات تو سمجھ میں آ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی قادرِ مطلق ہستی ہیں کہ جو کائنات کے وجود سے پہلے ہیں۔ اللہ تعالیٰ درمان ہیں، بینا ہیں، سنتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کو اپنی صفتِ خالقیت کو اپنی صفتِ کاملیت کو اور قادرِ مطلق ہونے کی صفت کو جب متعارف کروانا چاہا تو اُن کے ذہن میں یہ بات آئی کہ میرے علاوہ بھی کوئی ہونا چاہیئے تاکہ میری وحدانیت اور خالقیت کا اعتراف کرے۔ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ایک مربوط، مستحکم اور مرتب پروگرام موجود تھا اور اس پروگرام کو نشر کرنے کے لئے، اس پروگرام کو مظاہراتی شکل وصورت میں وجود میں لانے کے لئے ''کُن'' کہا! یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کو حرکت دی اور جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتے تھے، چاہتے ہیں یا جس طرح کائناتی خدوخال اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھے یا ہیں اُن کو اپنے اندر سے باہر مظاہراتی شکل وصورت میں ظاہر کر دیا۔

اس کی مثال ناقص ہے لیکن بہرحال مثال، مثال ہوتی ہے۔ ہم ایک ڈرامہ نویس سے مثال کو بیان کر سکتے ہیں۔

ایک رائٹر (Writer)، ایک ڈرامہ نویس، ڈرامہ لکھنے والا جب ڈرامہ لکھتا ہے تو اُس ڈرامے کے کردار، اُس ڈرامے کے اندر تفصیلات، اُس ڈرامے کا پلاٹ پہلے سے ڈرامہ نویس کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، ڈرامہ نویس جب کوئی ڈرامہ لکھتا ہے تو سب سے پہلے وہ کرداروں کا تعین کرتا ہے۔ ان کرداروں میں رحم بھی ہوتا ہے، ظلم بھی ہوتا ہے، معافی بھی ہوتی ہے، اُلجھن، بیزاری، پریشانی، رونا دھونا اور غم ناک آوازیں بھی ہوتی ہیں۔ اور سکون وراحت اور اطمینان کی کیفیت بھی ہوتی ہے لیکن جب تک ڈرامہ نویس دماغ کے اندر سے ڈرامہ کو کاغذ پر منتقل نہ کر دے تو ڈرامے کی تشکیل نہیں ہوتی۔

مطلب یہ ہوا کہ ہم جو ڈرامہ دیکھتے ہیں وہ ڈرامہ، ڈرامے کے اندر مناظر، پس منظر، ماحول، حالات، فضا، اسٹیج سے پہلے ڈرامہ نویس کے دماغ میں موجود تھیں۔ ڈرامہ نویس کا کردار یہ ہوا کہ دماغ کے اندر جس طرح ڈرامے

کے کردار موجود تھے اُنہیں کاغذ پر منتقل کر دیا۔

یہ ایک چھوٹی سی اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ناقص مثال ہے لیکن انسان ہے ہی ناقص...... اس کا شعور ہے ہی بہت کمزور، جس طرح ڈرامہ نویس کرداروں کے باہر ڈرامہ نہیں لکھ سکتا اور ڈرامہ کے کردار مکمل نہیں ہوتے جو اُس کے دماغ میں ہیں۔ اسی طرح کائناتی پروگرام، کائناتی سسٹم (System) اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا۔ اللہ نے اِسے کُن کہہ کر ظاہر فرما دیا۔ اور ان کو الگ الگ لکھ کر اگر آپ کاف کے اوپر غور کریں گے تو یہ دراصل مثلث یا ٹرائینگل (Triangle) کی شکل بنتی ہے۔ نون کے اوپر اگر آپ غور کریں گے تو یہ دائرہ یا سرکل (Circle) کی شکل ہے۔

ک اور ن دو حرفوں سے کائنات کی تخلیق کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ساری کائنات ٹرائینگل اور سرکل میں تخلیق ہوئی ہے۔ کائنات میں موجود کوئی ایک شے بھی اس فارمولے، اس (Equation) سے باہر نہیں ہو سکتی۔ ہر تخلیق ٹرائینگل اور سرکل میں بند ہے۔

اس کو ہم چند مثالوں سے بیان کرتے ہیں۔۔ درخت کا ایک تنا ہے۔ درخت کے تنے کو جب ہم دیکھتے ہیں تو دراصل وہ بہت سارے اوپر نیچے دائروں کی ایک اجتماعی شکل و صورت ہے۔ جب ہم تنے کو کاٹتے ہیں، کاٹتے، کاٹتے، کاٹتے، باریک ترین اس کو کاٹ دیتے ہیں تو ہمارے ہاتھ میں دائرے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اب اس دائرے کو جب ہم بیچ میں سے کاٹ دیتے ہیں تو مثلث کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے۔ دوسری مثال انسان کی ہے۔ انسان کی ہڈیوں کا جو اسٹرکچر ہے اس کو دیکھئے۔ اب آپ پنڈلی کی ہڈی کو ہی لے لیجئے یا ہاتھ کی ہڈی لے لیجئے۔ جب آپ اسے سیدھا کھڑا کرتے ہیں تو وہ بھی دراصل ایک دائروں سے بنا ہوا ترتیب وار بازو ہے۔ ہڈی کو اگر اوپر سے دیکھیں تو درخت کے تنے کی طرح یہ بھی گول ہوتی ہے۔

پھر اس کو آپ پرت در پرت کاٹیں ایک، دو، تین چار کر کے چاہے یہ پرت پچاس ہو، سو ہوں یا ہزار ہوں۔ دائرے کی شکل میں گول ہوں گے۔ کیونکہ گول ہڈی گول ہوتی ہے اور اس کے درمیان میں سوراخ ہوتا ہے۔ لیکن درخت کے اندر سوراخ نہیں ہوتا۔ یہاں بھی آپ کو دائرے کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا۔

اب آپ دیکھیں، باریک سے باریک ہڈی کے دائرے کو یا ہڈی کے ٹکڑے کو آپ بیچ سے کاٹ دیں۔ اب وہ مثلث یعنی ٹرائینگل کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ آپ کے سر کا جو بال ہے یہ بال نہایت باریک ایک ایسا درخت ہے، ایسا گھاس ہے جو بیچ میں سے خالی ہے نلکی کی طرح۔ اس بال کو جب آپ قینچی سے کاٹیں گے، تو آپ کے سامنے بے شمار دائرے کی شکل میں بال رکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ لیکن جب ان میں سے کسی ایک دائرے کو آپ بیچ میں سے کاٹیں گے تو یہی بال آپ کو مثلث یا ٹرائینگل کی شکل میں نظر آئے گا۔

علیٰ ہذاالقیاس یہ گلاس ہے اس کو جب ہم اوپر سے دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ ایک سیدھی سی بات ہوتی ہے کہ یہ، ایک دائرہ ہے، دو یا تین دائروں سے یا ایک ہزار یا ایک لاکھ دائروں کو اگر جمع کر دیا جائے تو یہ گلاس کی شکل ہے۔اور اگر دائرے سے اس گلاس کو نکال لیا جائے تو گلاس کا وجود ہی نہیں رہے گا۔ ساتھ ہی اگر اس دائرے کو بیچ میں سے کاٹ دیا جائے تو ٹرائینگل کی شکل حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی صورت سے آپ کے پاس یہ جگ رکھا ہوا ہے، یہ جگ جو ہے سمجھ لیجئے یہ ایک بڑا گلاس ہے۔ اسی طرح یہ بھی دائرے اور مثلث میں بند ہے۔

الغرض کوئی بھی آپ چیز اس زمین پر دیکھیں گے تو اس میں آپ کو دو چیزیں بطورِ خاص نظر آئیں گی۔ یا تو اس چیز کے اوپر مثلث غالب ہوگا یا سرکل یعنی دائرہ۔ اب جیسے بال ہے، اس کے اوپر سرکل غالب ہے، اب جیسے ناک ہے۔ ناک کے اوپر مثلث غالب ہے۔ آپ ذرا غور کریں۔ اپنی ناک تو آپ کو نظر نہیں آئے گی دوسروں کی دیکھ لیں۔ تو وہاں آپ کو مثلث غالب نظر آئے گی۔ اسی طرح آپ پیالہ لے لیں، تگاری لے لیں، ہنڈیا لے لیں، آپ کا اللہ بھلا کرے پھونکنی لے لیں، چشمہ لے لیں۔ ہر چیز میں آپ کو دائرہ یا مثلث غالب یہ مغلوب نظر آئے گی۔

اب آپ سوچیں، دماغ پر زور ڈالیں۔ ہوسکتا ہے کوئی ایک چیز ہو جو اس قانون سے باہر ہو...... اب اگر ہم غور کریں، آسمان پر، زمین پر، چاند اور ستاروں پر، زمین کے اندر جو چیزیں ہیں وہ، زمین کے اوپر جو چیزیں ہیں وہ، مکھی، مچھر، چیونٹی، ہاتھی، شیر، بکری، بیل، بھینس، درخت، پھول، پہاڑ اور ریگستان وغیرہ پر، فرشتوں اور جنات وغیرہ پر، تو پھر بتائیں ذرا...... ان میں دائرہ غالب ہے یا مثلث، ان کی تخلیق میں آپ کو دائرہ نظر آتا ہے یا مثلث۔

سوچیں آپ سب بھی......

اجناس کے اوپر غور کریں۔ گندم کے دانے کے اوپر غور کریں۔ اگر دانے کو کھڑا کر کے اوپر سے دیکھیں تو یہ دائرہ میں پرت در پرت نظر آئے گا اور اگر اس کے کسی ایک پرت کو، دائرے کو درمیان سے کاٹ دیں تو یہی گندم کا دانہ ٹرائینگل کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسی طرح نباتات، جمادات، حیوانات، حشرات الارض، انسان اور کائنات پر غور و فکر کریں، بار بار سوچیں، تھوڑا سا وقت نکال کر ضرور سوچیں...... کسی نے سوال کیا کہ،

سوال: ہوا کو ہم کیا کہیں گے؟

جواب: ہوا کو آپ جانتے ہیں؟ آپ نے دیکھا ہے؟ اگر نہیں تو پھر آپ کو کیا پتا ہوا مثلث ہے یا ٹرائینگل ہے یا سرکل ہے جب آپ کو پتا ہی نہیں ہے۔

یاد رکھیے! یہ آپ کی پہلی کلاس ہے۔ جو بات دیکھئے، جو بات آپ کریں بغیر سوچے نہیں کیجئے گا کبھی۔ اس سے دوسرے لوگ جو زیادہ سوچ و بچار والے ہیں اُن کا نقصان ہوتا ہے۔ دوسرے کیا سوچیں گے کہ یار کیا بیوقوفی کی بات کی ہے۔ اب ساری اُن کی توجہ (Concentration) ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ خود بن میں

سوال آیا کھڑے ہو کر کر دیا۔

اس ذہن میں سول آیا ہوا، تو آپ کو سوچنا چاہیے کس طرح ہوا؟ آپ کے ذہن میں خود ہی یہ بات آ جاتی کہ ہوا تو میں نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔" کچھ چیزیں مربع یا مثلث شکل میں ہوتی ہیں ان کے متعلق بتائیں؟ ہے کوئی چیز؟

پھر آپ اس کاف (ک) کو الگ اور نون (ن) کو الگ کاغذ پر لکھ لیں۔

ک سے مراد مثلث یعنی مثلث کی ایک شکل۔ ابھی جب آپ دیکھیں گے تو دراصل یہ مثلث کی ہی ایک شکل نظر آئے گی۔

(۱)

ک (۲)

(۳)

(۱) یہ (/) بھی مثلث ہے (۲) یہ (۱) بھی مثلث ہے، (۳) یہ (–) بھی مثلث ہے۔

ک۔ کاف کا مطلب یہ ہوا کہ تین مثلث کو ہم نے ایک جگہ جمع کر دیا۔ تین مثلث جب ایک جگہ جمع ہو گئیں اس کا مطلب ہوا ک۔ یعنی ک حرف مرکب ہے تین مثلث کا۔

(۲)

ن (۱)

یہ نون جو ہے یہ سرکل ہے۔ اس کو اگر اوپر سے ملا کر کے مکمل کر دیا جائے تو یہ سرکل بن جائے گا۔ (۱) یہ (U) بھی سرکل ہے۔ اس کے اندر جو نقطہ (•) ہے وہ بھی سرکل ہے تو ن مرکب ہے۔ دو سرکل کا۔

قانون: اب قانون یہ بنا کہ یہ ساری کائنات ٹرائینگل (Triangle) اور سرکل (Circle) پر تخلیق ہو رہی ہے یا کی گئی ہے۔ اس کائنات میں جو مخلوق ہے جو بھی مخلوق ہے وہ یا تو غالب ٹرائینگل سے بنی ہوئی ہے یا غالب سرکل سے بنی ہوئی ہے۔

لیکن دائرے یعنی سرکل (Circle) اور مثلث یعنی ٹرائینگل (Triangle) سے باہر کوئی تخلیق اس کائنات میں نہیں ہے۔

آپ لوگوں کے ذہن میں یہ بات پوری طرح آ گئی ہوگی کہ لوحِ محفوظ دراصل اللہ تعالیٰ کا ایک پروجیکٹر ہے جو کتاب المبین سے فیڈ ہو رہی ہے۔ جو کتاب المبین کی روشنیوں سے اور انوار سے متحرک ہے۔ جہاں یہ روشنیاں متحرک ہیں جہاں یہ روشنیاں تصویر بن رہی ہیں وہ اسکرین ہے جس کو تصوف اور روحانیت اور قرآن زمین

کے نام سے پکارتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ کائناتی پروگرام کی تخلیق جس فارمولے پر ہوئی اور مثلث وہ دائرہ ہے۔ مثلّث اور دائرے کے اجتماع سے کہیں دائرہ غالب ہے کہیں مثلث غالب ہے اس کی اجتماعیت سے جو کائنات تخلیق ہوئی وہ کائنات زمین کی اسکرین پر(Display) ڈسپلے ہو رہی ہے۔

روحانی تعلیمات کی روشنی میں جب غور و فکر کیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں زمین کا جب تذکرہ کیا ہے تو زمین کو ایک کہا۔ زمین کو جمع کے صیغے میں بیان نہیں فرمایا۔ اور جب آسمانوں کا ذکر کیا تو آسمانوں کی تعداد سات بتائی۔ اس بات کو ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں بیان کر سکتے ہیں کہ سات پروجیکٹرز سے ،سات چینل سے سات مختلف فریکوئنسی سے کائناتی پروگرام نشر ہو رہا ہے۔ اور وہ کائناتی پروگرام جو مظاہراتی خدوخال میں نظر آ رہا ہے، جو زمین کی اسکرین پر ہم دیکھ رہے ہیں اور زمین کی اسکرین پر جو پروگرام نشر ہو رہا ہے اس میں ٹھہراؤ نہیں ہے، استحکام نہیں ہے وہ ہر آن اور ہر لمحہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی مثال انسان کی اپنی ذات ہے۔

ایک انسان جو پیدا ہوا وہ دراصل زمین کی اسکرین پر نمودار ہوا۔ زمین کی اسکرین پر نمودار ہونے کے بعد اُس کے اندر استحکام نہیں ہے اُس کے اندر ٹھہراؤ نہیں ہے وہ ساکن و جامد نہیں ہے۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے ایک لمحے کے ہزارویں فریکشن میں تبدیل ہوتا ہے۔ اگر بچہ ہر لمحے کے ہزارویں فریکشن میں تبدیل نہ ہوتو اُس کی نشوونما رُک جائے گی وہ ایک منٹ کے بعد دوسرے منٹ میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک دن کا بچہ کبھی دو دن کا نہیں ہوگا۔ اور ایک سال کا بچہ کبھی دس سال کا بچہ نہیں بنے گا، یہی صورت زمین پر موجود تمام مخلوقات کی ہے...... آپ کبوتر کے بچے، بکری کے بچے، بھیڑ کے بچے، درخت کے بچے کسی بھی بچے پر غور کریں اس کی نشوونما کا سارا دار و مدار اس کی تبدیلی پر ہے۔ ان مشاہدات اور تجربات سے اور حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لفظ ''کُن'' ایک دفعہ نشر ہو کر ختم نہیں ہو گیا۔ لفظ کُن مسلسل اور متواتر جاری ہے۔ زندگی دراصل لفظ کُن کا (ECHO) ہونا ہے۔ یہ اللہ کا ایک قانون ہے جو لوگوں کو بتایا جاتا ہے۔

جو قانون ہم نے آج بیان کیا ہے اس کو صرف سُننا، لکھنا کافی نہیں ہے اس کے اوپر تفکر کرنا لازم ہے۔ اپنے گھروں میں ایک وقت مقرر کریں اور آج کے بیان کردہ اِس قانون پر غور و فکر کریں اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی مثالوں سے اِس کو ثابت کریں۔ کم از کم پچاس مثالیں لکھیے۔

کائنات کی بنیاد

A۔ کتاب المبین جہاں سے روشنی آ رہی ہے۔

B۔ پھر لوحِ محفوظ پر پڑ رہی ہے۔

C۔ لوحِ محفوظ پر کائناتی فلم پر روشنی پڑ رہی ہے۔

D۔ وہ عدسہ ہے جو مکانیت پیدا کرتا ہے یا چیزوں کو بڑا کر کے دکھاتا ہے۔

E۔ لہریں نزول کر رہی ہیں

F۔ نزول کر کے ایک اسکرین یا پردے پر ٹکرا رہی ہیں۔
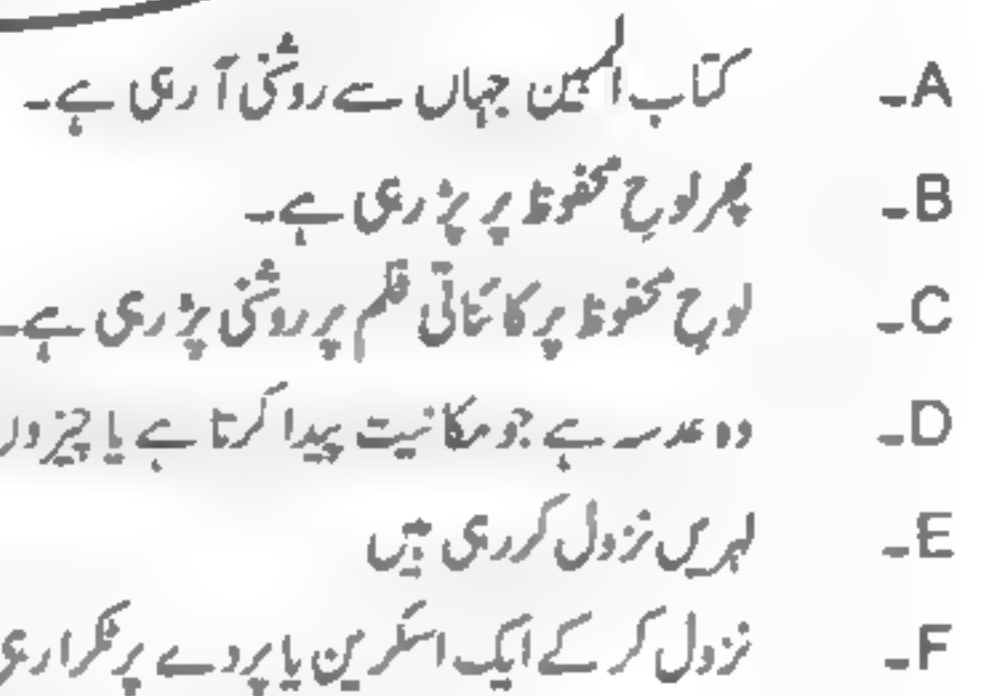
اس طرح تب جا کر ہم کہتے ہیں کہ ہم فلم دیکھ رہے ہیں چاہے وہ سینما کی ہو یا کائنات کی۔

جب اللہ تعالیٰ کے ذہن سے لفظ کُن نکلا تو دراصل وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہے کہ ساری کائنات ٹرائینگل اور سرکل میں اپنا مظاہرہ کرے۔ پہلا مظاہرہ کائنات کا، سرکل کی شکل میں ہوا۔

پہلا مظاہرہ سرکل کی شکل میں ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس وقت ٹرائینگل نہیں تھا یعنی اس وقت سرکل غالب تھا اور ٹرائینگل یا مثلث مغلوب تھا۔ اسی مثلث یا دائرے کی بنیاد پر کائنات میں تخلیق ہوئی اور نوعوں کا ظہور ہوا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ رُوح تو دراصل ہم کہتے ہیں۔ سرکل غالب ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فرشتے، اس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ سرکل غالب ہے اور ٹرائینگل جو ہے وہ مغلوب ہے۔ کائناتی پروگرام اوپر سے نیچے کو نشر ہو رہا ہے جس کو انبیائے کرام علیہ الصلوۃ والسلام کی تعلیمات کی روشنی میں، اولیاء اللہؒ اور حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے نزول کا نام دیا ہے۔ یعنی کہیں کوئی کائناتی پروگرام ریکارڈ ہے اور وہاں سے ڈسپلے (Display) ہو کر خدوخال اور شکل و صورت کے ساتھ اپنا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ایک بار پھر میری بات آپ غور سے اور توجہ سے سنیں کہ جہاں یہ پروگرام اجتماعی طور پر، نوعی اعتبار سے، پوری کائنات کے لحاظ سے ریکارڈ ہے اُس کو کتاب المبین کہا جاتا ہے۔ آپ کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ کتنا زور پڑتا ہے آپ کو سمجھانے کے لئے اور میں اپنے اندر کتنی گہرائی میں اُتر جاتا ہوں۔ اب اس کتاب المبین کی مثال کو ہم مادی وسائل سے بیان کرتے ہیں۔

آپ لوگوں نے سینما دیکھا ہے۔ سینما دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک اسکرین ہو اور اسکرین پر ڈسپلے (Display) ہونے کے لئے آپ کی کمر کے پیچھے کچھ بلندی پر پروجیکٹر لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس پروجیکٹر پر فلم چلتی ہے۔ جب فلم چلتی ہے اگر خالی فلم چلتی رہے تو پیچھے اُس کو روشنی نہ ملے تو اسکرین پر کوئی نقش و نگار آپ نہیں دیکھ سکتے۔

پروجیکٹر پر جب آپ فلم کا فیتہ چڑھاتے ہیں تو اس کی تین صورتیں آپ کے سامنے ہیں۔

ایک یہ کہ بیچ میں فلم ہوتی ہے فلم کے پیچھے روشن بلب ہوتا ہے اور تیسری یہ کہ اُس روشنی کو جو فلم سے چھن کر آ رہی ہے ایک (Lens) یا شیشہ، محدّب شیشہ اُس چھوٹی سی فلم کو بڑا بنا کر دکھاتا ہے۔ اور وہ روشنیاں ایک سوراخ میں سے نکل کر اجتماعی لہروں کی شکل میں پردے کی یا کینوس کی یا جو بھی اسکرین ہے اس پر پڑتی ہیں۔ جب وہ روشنیاں پروجیکٹر سے نکل کر فلم میں سے گزر کر اور اُس شیشے سے گزر کر لہروں کی شکل میں اسکرین پر گرتی ہیں تو اُس کو ہم کہتے ہیں کہ ''ہم فلم دیکھ رہے ہیں۔'' یہ فلم دراصل نزولی حرکت کے علاوہ کچھ نہیں ہے اگر یہاں یا دوسری منزل پر پروجیکٹر لگا ہوا نہ ہو یا اسکرین کے مقابل پروجیکٹر نہ ہو اور اس پروجیکٹر کے آگے ریکارڈ (Record) فلمی فیتہ نہ ہو اور اُس فلمی فیتے کے پیچھے بہت زیادہ وولٹیج کی بجلی نہ ہو اور اسکرین کے سامنے شیشہ نہ ہو جو بہت بڑا کر کے دکھاتا ہے تو آپ فلم نہیں دیکھ سکتے۔ تو اسی صورتِ مثال کو اگر ہم لوحِ محفوظ کے نام سے بیان کریں کہ لوحِ محفوظ ایک پروجیکٹر ہے اس پروجیکٹر پر کتاب میں کائناتی فلم سرکل کی شکل میں لکھی ہوئی موجود ہے چل رہی ہے اور اُس کے

پیچھے روشنی یا انوار جس کو فیڈ (Feed) کر رہے ہیں یہ اجتماعی روشنی لہروں کی شکل میں اسکرین پر گرتی ہے اس کو تصوف میں، روحانیت میں نزولی حرکت کہا جاتا ہے۔

یاد رکھیں! کلاس میں کامیاب ہونے کے لئے پرسکون ہونا بہت ضروری ہے۔ جب آپ پرسکون ہوں گے تو خوشحال بھی لازماً ہوں گے۔ اس سے ذہنی یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی طور پر آپ کو خوشحال ہونا، پرسکون ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی ذہنی طور پر پُرسکون نہیں ہے خوشحال نہیں ہے اس کا روحانیت پر چلنا مشکل ہے۔ صبر وتحمل اور برداشت پیدا کریں۔ غصے کو ختم کر دیں۔ اَنا کے خول سے باہر نکلیں۔ اَنا ایک اچھی چیز ہے مگر اس میں مبتلا ہو کر دوسرون کی دل آزاری ہو وہ دوسروں کو کیا خوشی دے گا۔ انسان غصہ اس وقت کرتا ہے جب اُسے اقتدار کی خواہش انسان ہوتی ہے اقتدار کی خواہش انسان کو خود اپنی ذات سے بیزار کر دیتی ہے۔

مسئلہ کسی کا ہو، شوہر کا ہو، بیوی کا ہو، بچوں کا ہو، والدین کا ہو، دوست احباب کا ہو، جب بھی آپ کو غصہ آئے آپ سمجھ لیجئے کہ شیطان نے آپ کے دماغ کو اقتدار کے حصول کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ جب بھی آپ غصہ کریں گے اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنی اَنا کے خول میں بند ہوگئے ہیں۔ اب غصے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اس طرح بچے کچھ بھی کرتے رہیں اور آپ اُنہیں نہ ڈانٹیں ڈپٹیں، نہ اُنہیں کچھ کہیں۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اعتدال ہونا چاہیئے۔ روحانیت اعتدال کا راستہ ہے۔ روحانیت یقین کا راستہ ہے اور یقین کے راستے پر چلنے والے بندے کے اندر شک نہیں ہوتا۔ اگر آپ کے اندر شک ہے آپ سمجھ لیجئے کہ جس راستے پر آپ چل رہے ہیں اُس میں کھوٹ ہے۔ یقین اور شک یہ دو ایسے مرحلے ہیں کہ جس سے ہر آدمی کا گزرنا یقینی ہے۔ آدمی یقین اور شک کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جو لوگ یقین پر شک کی اہمیت کو ختم کر دیتے ہیں وہ صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں اور جن لوگوں کے اندر یقین کے مقابلے میں شک زیادہ ہوتا ہے وہ شیطان کے راستے پر چلتے ہیں۔

شیطان کا راستہ کبر ونخوت اور اپنی ذات کی تسکین کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ آدمؑ اور شیطان ابلیس کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت کے ساتھ اس قانون کو بیان کر دیا ہے کہ:

''شیطان نے نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ کس بات نے تجھے مجبور کیا کہ ہماری تمام نعمتوں کی ناشکری کرتے ہوئے ہماری حکم عدولی کرے۔''

شیطان نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے جواب میں جو کچھ کہا ہے وہ بجائے خود شر اور خیر کے درمیان ایک مکمل راہنمائی ہے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ سے اس ارشادات کے جواب میں کہا!

اللہ تعالیٰ آپ یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں نے آپ کی نافرمانی کیوں کی؟ آپ نے مجھے اغوا (Kidnape) کر لیا ہے، گمراہ کر دیا ہے، صراطِ مستقیم سے ہٹا دیا۔ آپ نہیں چاہتے تھے اس لئے میں نے یہ کیا۔''

حضرت آدمؑ کی جنت میں بھول چوک ہوگئی۔ بھول سے وہ درخت کے قریب چلے گئے جس درخت کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو منع کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے بھی کہا کہ:

''ہم نے تمہیں منع نہیں کر دیا تھا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا اور اگر تم اس درخت کے قریب چلے گئے تو تم زمین پر کود پڑو گے اور تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔''

آدمؑ نے اللہ تعالیٰ کی اِس بات کا جواب عرض کیا! لیکن دونوں جواب کتنے مختلف تھے آپ غور کریں۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا! رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۔ اے ہمارے ربّ ہم نے اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا۔ وَ اِن لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا ۔ اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہیں کر دیا، اگر آپ نے ہم پر رحم و کرم نہیں کیا۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. تو ہماری ساری زندگی خسارے میں چلی جائے گی۔ یا اللہ ہمیں معاف کر دیں۔'' دیکھیں دونوں جواب اپنے سامنے رکھیں۔

(i) شیطان کا جواب اَنَا کے خول میں بند اور کبر و نخوت میں ڈوبا ہوا تھا۔

(ii) آدمؑ کا جواب عاجزی، انکساری، تحمل، بردباری اور معافی کے الفاظ میں ظاہر ہوا۔

عاجزی، انکساری اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، لوگوں کو بھی پسند ہے۔ اس عاجزی اور انکساری کی قبولیت کا اندازہ کیجئے کہ آدمؑ کی اولاد میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر پیدا ہوئے۔ اس عاجزی انکساری کا اندازہ کیجئے کہ آدمؑ کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا محبوب بنا کر بھیجا اور کبر و نخوت میں مبتلا اور بڑائی میں ڈوبا ہوا ابلیس محض اس لئے کہ وہ اپنی اَنا کے خول سے باہر نہیں آیا ذلت اور لعنت برس گئی۔

تمام روحانی طلباء اور طالبات کو یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عاجزی اور انکساری کو، صلہ رحمی کو اور معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کبر کو بڑائی کو، اقتدار کی خواہش کو، جا بے جا اپنی بات منوانے کو، ہٹ دھرمی اور ضد کو اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کو............ ناپسند کرتا ہے۔

آپ سب میری اولاد ہو، میرے شاگرد ہو۔ آپ کے اندر اپنے استاد کا عکس نظر آنا چاہیئے۔ استاد کا عکس لباس، ٹوپی اور داڑھی میں ہی نظر نہ آئے بلکہ طرزِ فکر میں، روح کے عرفان میں اور اللہ کی پہچان میں نظر آنا چاہیئے۔ روحانی علوم کے حصول میں میری ان ہدایات پر عمل کریں تبھی آپ کامیاب ہو سکیں گے ورنہ خسارے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

آپ کا یہ استاد آپ کے اندر اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کی ناشکری مت کریں، آپ کو اللہ تعالیٰ خوش رکھے اور حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

السلام علیکم!

☆......☆......☆

تقریبِ رونمائی کتاب ''مراقبہ'' سے خطاب

ممتاز روحانی اسکالر جناب خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی نئی کتاب ''مراقبہ'' کی تقریبِ رونمائی لاہور آرٹس کونسل کے الحمراء ہال نمبر۲ میں ۹ اپریل ۱۹۹۵ء کو منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت سپیکر پنجاب اسمبلی اور قائم مقام گورنر پنجاب محمد حنیف رامے نے کی۔ حاضرین سے صدرِ تقریب جناب محمد حنیف رامے، مصنف کتاب جناب خواجہ شمس الدین عظیمی کے علاوہ ممتاز ادیب جناب اشفاق احمد، ڈاکٹر فخر النساء سابق پرنسپل فاطمہ جناح میڈیکل کالج، ڈاکٹر رشید چوہدری چیئرمین فاؤنٹین فاؤنڈیشن اور میاں مشتاق احمد عظیمی نے خطاب کیا۔

تقریبِ رونمائی میں چار سو سے زائد خواتین و حضرات نے شرکت کی جو اس قسم کی تقریبات کے حوالے سے ایک ریکارڈ ہے۔ تقریبِ رونمائی میں شرکت کے لئے قومی اسمبلی کے اطلاعات و نشریات کمیٹی کے چیئرمین قاضی اسد عابد، وزیرِ اعلیٰ سندھ کے مشیر ڈاکٹر مسعود طارق خصوصی طور پر لاہور تشریف لائے تھے۔ اس کے علاوہ تقریب میں آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی کے صدر مصطفیٰ صادق، اے پی این ایس کے نائب صدر ممتاز طاہر، سی پی این ای کے سابق جنرل سیکرٹری جمیل اطہر، قومی طبی کونسل کے صدر منیر نبی خان، طبی کونسل کے رکن اور ڈائریکٹر پروجیکٹ حکیم ادریس بخاری، اقبال شاہد کے علاوہ ممتاز وکلاء صحافیوں، ڈاکٹروں، ادیبوں اور دانشوروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

قاری کاشف نعیم نے تلاوتِ کلامِ پاک اور خالد جاوید نے ہدیۂ نعت بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیش کیا اور تقریب کی نظامت کے فرائض سید طاہر جلیل عظیمی نے انجام دیئے۔

تقریب کے شرکاء میں مثالی نظم و ضبط دیکھنے میں آیا۔ یہ ایک سادہ مگر بہت پُروقار اور منظم تقریب تھی۔ حاضرین نے ہر مقرر کو بہت توجہ سے سنا اور وقتاً فوقتاً تالیاں بجا کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے رہے۔ اشفاق احمد اور ڈاکٹر فخر النساء کی تقاریر کو بہت زیادہ پسند کیا گیا۔

عظیمی صاحب نے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

تفکر کرنے، کنسنٹریشن کرنے، کسی ایک نکتے پر ذہن مرکوز کرنے اور اس نکتہ کے اندر کیا ہے؟ اس کو ڈھونڈنے کا نام مراقبہ ہے۔ مراقبے کی اصطلاح وہ انگریزی میں ہو یا اردو میں ہو، سندھی میں ہو، کسی بھی زبان میں ہو۔ یہ بات ہمارے اوپر ظاہر کرتی ہے کہ مراقبہ ایک ایسا اصطلاحی نام ہے جس کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا کہ کسی چیز کا کھوج لگانا، کسی چیز کے اندر اتر جانا اور ریسرچ کرنا۔ انسانی ساڑھے گیارہ ہزار صلاحیتوں میں سے کسی ایک صلاحیت کے اوپر ذہن مرکوز کرنا اور اس صلاحیت کے پیچھے کیا ہے، اس صلاحیت کے پسِ پردہ اللہ تعالیٰ کی کون سی مشیت کام کر رہی ہے، اس کو ڈھونڈنا اور تلاش کرنا یہ مراقبے کا مفہوم ہے۔

مراقبہ محض علم نہیں۔ مراقبہ ایک طرزِ زندگی ہے۔

یہ زمانہ سائنسی ترقی کا زمانہ ہے۔ سو سال پہلے ہم ٹیلی فون سے واقف نہیں تھے۔ ٹی وی اور کار سے واقف نہیں تھے۔ اب اگر سو سال پہلے کا آدمی آج یہاں آ جائے تو اُسے کچھ سمجھ نہیں آئے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گزر رہا ہے علم بھی بڑھ رہا ہے۔ آدم وحوا کے زمانے میں آدمی پتے کھاتے اور درخت کی جڑیں استعمال کرتے تھے۔ پھر آدم کی اولاد نے پتھر کا استعمال سیکھا اس دور کو ہم Stone-Age کہتے ہیں۔ پھر آدم کی اولاد میں مزید اضافہ ہوا اور اس نے مزید علم سیکھا...... اُس نے آگ کا استعمال کیا، جب آگ کا استعمال سیکھ لیا تو لوہے کا استعمال شروع ہوا۔ پھر مزید ترقی ہوئی اور آدم کے بچوں نے نت نئے علوم سیکھے اور بجلی کا استعمال کیا۔ آج کے زمانے میں انسانی ترقی کی سب سے بڑی وجہ بجلی ہے۔ اب دیکھیں کہ آج کوئی بھی چیز بجلی کے بغیر نہیں چلتی.... ہوائی جہاز، ٹی وی، فریج، ہیٹر، ایئرکنڈیشنر سب بجلی سے چلتے ہیں۔ اگر بجلی نہ ہو تو ٹیلی فون، ٹی وی اور ریڈیو سب بے کار ہیں۔

بجلی دو طریقے سے استعمال ہوتی ہے۔ موبائل فون میں جب آواز آتی ہے تو وہ بجلی یا کرنٹ ہوتا ہے جو آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بجلی ہمیں نظر نہیں آتی..... آج سائنس یہ بات جان گئی ہے کہ انسان بھی ایک بجلی ہے۔ جب دو تار آپس میں ملتے ہیں تو جھٹکا لگتا ہے یا دو تار ملنے سے Sparking ہوتی ہے۔ جب ایک بیٹا اور ماں گلے ملتے ہیں تو اُس وقت بھی بجلی کا جھٹکا لگتا ہے۔ جب میاں بیوی آپس میں ملتے ہیں تو اس وقت بھی دونوں کو بجلی کا احساس ہوتا ہے اور دونوں بجلی کے جھٹکے کو محسوس کرتے ہیں۔ اگر دو آدمیوں میں بجلی نہ ہو تو حواس ختم ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی بجلی کے علاوہ کچھ نہیں۔ سائنس نے انسانی بجلی کا نام Aura رکھا ہے۔ جب ہم موبائل فون پر بات کرتے ہیں تو کہیں نہ کہیں سے ہمیں انفارمیشن ملتی ہے، وہ ہم سنتے ہیں پھر ہم بات کرتے ہیں۔ اگر ہمیں

انفارمیشن نہ ملے تو ہم بات نہیں کر سکتے۔ کوئی آدمی اس وقت تک کوئی کام نہیں کرتا جب تک اس کو وہ کام کرنے کا خیال نہ آئے۔ خیال کا نام ہم انفارمیشن رکھتے ہیں۔ جب تک انفارمیشن نہیں ملتی ہم پانی نہیں پی سکتے۔ ہم نے پانی پینے کی انفارمیشن کا نام پیاس رکھا۔ کھانا کھانے کی انفارمیشن کا نام بھوک رکھا۔ سونے کی انفارمیشن کا نام نیند رکھا۔ جب ہم سونے کے بعد اُٹھتے ہیں تو اِس انفارمیشن کو بیداری کہتے ہیں۔ اب آپ موبائل فون کا تصور کریں اگر موبائل فون میں انفارمیشن نہ آئے تو ہم اس کے ذریعے آواز نہیں سن سکتے، اس انفارمیشن کو بھی ہم بجلی کہتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی Electricity ہے اور انفارمیشن ہے۔ اگر ٹیلی فون کے اندر بجلی آنا بند ہو جائے تو ٹیلی فون ڈیڈ ہو جاتا ہے۔ ٹی وی میں بجلی نہ آئے تو ٹی وی اسٹیشن کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ کار پٹرول سے نہیں چلتی۔ پٹرول کے ذریعے انجن جو بجلی بناتا ہے اُس سے کار چلتی ہے۔ اگر اسپارکنگ سے پٹرول نہ جلے تو گاڑی نہیں چل سکتی۔ اس کے علاوہ یہ جتنی بڑی بڑی مشینیں ہیں سب بجلی سے چلتی ہیں۔

انسان کے اندر جو بجلی ہے اس کا نام روح ہے۔ جب انسان کے اندر سے روح نکل جاتی ہے تو وہ بے کار ہو جاتا ہے۔ اب آپ خیال کریں کہ ایک زندہ آدمی اور ایک ڈیڈ باڈی ہے۔ ڈیڈ باڈی میں کوئی حرکت نہیں ہے، وہ شادی نہیں کرتی، کاروبار نہیں کرتی، جہاز میں بھی نہیں بیٹھتی..... کیوں؟..... اس لئے کہ اُس کے اندر سے روح نکل گئی ہے!......

فرض کریں ایک زندہ انسان ہے وہ ڈیڈ باڈی کے پاس لیٹا ہے ہم اُس سے کہتے ہیں بھائی اُٹھ کر بیٹھ جاؤ وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن ڈیڈ باڈی ہمارے کہنے سے کیوں اُٹھ کر نہیں بیٹھتی ..... اس لئے کہ اُس میں سے روح نکل گئی اور وہ آدمی ڈیڈ باڈی ہوگیا۔ روح موجود ہوگی، آدمی زندہ ہوگا۔ ٹی وی سے بجلی نکل گئی وہ بھی ڈیڈ باڈی ہے، بجلی آگئی ٹی وی زندہ ہوگیا۔ ٹیلی فون میں بجلی آتی ہے اور بجلی کے ذریعے اس میں سے آواز نکلتی ہے، اس طرح جیسے آدمی کے منہ سے نکلتی ہے۔ ٹیلی فون میں بجلی نہ ہو تو اس میں سے آواز نہیں نکلتی جیسے ڈیڈ باڈی سے نہیں نکلتی۔ ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے..... ڈیڈ باڈی ماں اپنے بچے کو دودھ کیوں نہیں پلاتی؟...... اس لئے نہیں پلاتی کہ اس کے اندر روح نہیں ہے۔ یعنی اصل انسان فزیکل باڈی نہیں ہے!............

ڈیڈ باڈی حرکت نہیں کرتی لیکن جب اس کے اندر روح ہوتی ہے تو وہ حرکت کرتی ہے۔ ہم کھانا بھی کھاتے ہیں، چلتے پھرتے بھی ہیں، کاروبار بھی کرتے ہیں، شادی بھی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری جو اصل ہے وہ ہماری روح ہے۔ جب تک انسان اپنی اصل سے واقف نہیں ہوتا اُس کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا ہے؟ ..... انسان

روز سوتا ہے روز جاگتا ہے۔ اللہ نے رات سونے کے لئے بنائی ہے دن کام کرنے کے لئے بنایا ہے۔ جب ہم سوتے ہیں تو ہماری حیثیت مردہ آدمی کی مانند ہو جاتی ہے اور ہمارا ذہن فزیکل باڈی سے دور ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہمارے ماحول میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم فزیکل باڈی سے آزاد ہو کر بھی زندگی گزارتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر دو دماغ کام کرتے ہیں ایک دماغ Time & Space میں بند ہو کر کام کرتا ہے اور ایک دماغ ٹائم اینڈ اسپیس سے آزاد ہو کر کام کرتا ہے۔ جو دماغ ٹائم اینڈ اسپیس سے آزاد ہو کر کام کرتا ہے وہ روح کا دماغ ہے اور جو دماغ ٹائم اینڈ اسپیس میں بند ہو کر کام کرتا ہے اُسے روح نے فزیکل باڈی سے بنایا ہے۔ فزیکل باڈی کا دماغ عارضی ہے اس لئے جو آدمی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کے اوپر موت ضرور آتی ہے۔ کوئی آدمی ایسا نہیں کہ جو آدم سے لے کر اب تک زندہ ہو۔ آدم کا بچہ پیدا ہوتا ہے، بڑا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔

اب ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہاں ۳۰ سال کے آدمی بھی ہیں، ۴۰ سال کے عمر کے لوگ بھی ہیں، ۲۰ سال کے بھی ہیں۔ کوئی آدمی یہ بتائے کہ اس کے ۲۰ سال کدھر گئے،...... ۴۰ سال کی عمر جب تک نہیں گزرتی، ہم ۴۰ سال کے نہیں ہوتے...... آدمی پیدا ہوا...... ۴۰ سال کا ہوا...... یہ ۴۰ سال کہاں گئے؟...... جب آدمی مر گیا تو اُس کی یادداشت Memory کدھر گئی؟......

اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۴۰ سال جہاں بھی گئے وہ سب کا سب غیب ہے...... بچپن بھی غیب میں چلا گیا، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا بھی غیب میں چلا گیا۔ جب ہم پیدا ہوئے تو ہم غیب سے آئے، جب ہم جوان ہوئے تو ہمارا بچپنا اور لڑکپن غیب میں چلا گیا۔ جب ہم بوڑھے ہوئے تو ہماری جوانی غیب میں چلی گئی...... اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی جو بنیاد Base ہے وہ غیب ہے۔ ہم غیب سے آتے ہیں...... پیدا ہوتے ہیں، مرنے کے بعد غیب میں چلے جاتے ہیں۔

جتنے پیغمبر دنیا میں آئے ہیں داؤدؑ، سلیمانؑ اور آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ... سب نے یہی پیغام دیا ہے کہ ہر انسان کو یہ علم ہونا چاہیئے کہ وہ کہاں سے آتا ہے؟ اور مسافر کی سی زندگی گزار کر کہاں چلا جاتا ہے؟

ہر آدمی غیب سے آتا ہے، بڑا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔ جو لوگ اللہ کو مانتے ہیں ان پر بھی یہی قانون عائد ہوتا ہے اور جو نہیں مانتے اُن پر بھی اسی قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اُسے یہ بالکل نہیں پتہ ہوتا کہ وہ کہاں پیدا ہوگا؟...... پاکستان میں پیدا ہوگا؟...... روس میں پیدا ہوگا؟...... یا چین میں پیدا

ہوگا؟...... امیر کے گھر پیدا ہوگا یا غریب کے گھر پیدا ہوگا؟...... جہاں اللہ چاہتا ہے پیدا ہو جاتا ہے اور جب تک اللہ اُس کو اس دنیا میں رکھتا ہے وہ رہتا ہے پھر مر جاتا ہے۔کوئی انسان نہ اپنی پیدائش پر اختیار رکھتا ہے اور نہ اس بات پر اختیار رکھتا ہے کہ وہ کب مرے گا؟

انسان درحقیقت انفارمیشن ہے۔ انفارمیشن بجلی ہے۔ جب تک آدمی کے اندر بجلی نہیں آتی وہ کام نہیں کر سکتا۔آپ یہاں بیٹھے ہیں جب تک آپ کو خیال نہ آئے کہ مجھے باہر جانا ہے تو آپ باہر نہیں جا سکتے۔ جب خیال آئے گا تب ہی جائیں گے۔ جب کھانا کھانے کا خیال آئے گا کھانا کھائیں گے۔۔ جب پانی پینے کا خیال آئے گا پانی پئیں گے۔ جب دوست بنانے کا خیال آئے گا تو دوست بنائیں گے اور جب شادی کا خیال آئے گا تو شادی کریں گے۔اگر شادی کا خیال نہ آئے تو ہرگز شادی نہیں کریں گے۔ چنانچہ انسان انفارمیشن کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور انفارمیشن کا جو نظام ہے وہ روح کے اوپر قائم ہے۔ اگر ہم اپنے اندر کی انفارمیشن سے واقف ہو جائیں تو ہم آسانی سے اپنی روح سے واقف ہو سکتے ہیں۔ روح چونکہ غیب ہے اس لئے وہ غیب کے سارے نظام سے واقف ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ روح کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جب قرآن پاک میں انسانی جسم کا تذکرہ فرمایا تو کہا کہ انسان کو مٹی سے تخلیق کیا۔ یہ بھی فرمایا کہ گندھے اور سڑے ہوئے تعفن والے گارے سے پیدا کیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جس مٹی سے انسان کو پیدا کیا وہ بجنی مٹی ہے۔بجنی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو خلاء سے پیدا کیا۔ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کا پتلا بنایا اور اس کے اندر اپنی روح ڈال دی۔ جب انسان میں جان پڑ گئی تو انسان میں حواس متحرک ہوگئے...... انسان کی ساری زندگی حواس پر مشتمل ہے...... سننا، دیکھنا، محسوس کرنا، چکھنا یہ سب حواس کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔

جسم کی حیثیت سے تو ہم واقف ہیں۔جسم کے جو Organs ہیں، اعضاء ہیں ہم ان سے بھی واقف ہیں۔آنکھیں ہیں، کان ہیں، دل ہے، گردے ہیں...... لیکن ہمیں اس بات سے واقفیت حاصل نہیں ہے کہ یہ جو دل کی Beat ہے، اس کی جو حرکت ہے، یہ کہاں سے آ رہی ہے؟............ وہ کون سا قانون ہے، وہ کون سی انفارمیشن ہے جس کی بنیاد پر جب دل حرکت کرنا بند کر دیتا ہے تو انسان مر جاتا ہے؟ ...... لیکن اگر دل کی حرکت دوبارہ شروع کر دی جائے تو آدمی زندہ ہو جاتا ہے۔

دوسری بات ہمیں یہ معلوم کرنی ہے کہ ہر انسان کی زندگی دو رُخوں پر مشتمل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے بنایا ہے۔ ہر یونٹ دو رُخوں سے مرکب ہے۔ حواس کے بھی دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ Time & Sapce کا پابند ہے اور دوسرا رُخ ٹائم اینڈ اسپیس سے آزاد ہے۔ اس کی پریکٹس ہمیں چوبیس گھنٹوں میں دو مرتبہ ہوتی ہے۔ جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں اور جب ہم مرتے ہیں تو دو دفعہ ہمارے اوپر یہ کیفیات طاری ہوتی ہیں کہ ایک کیفیت میں ہم ٹائم اسپیس سے آزاد ہو جاتے ہیں دوسری میں ہم پابند ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس کیفیت کو لیل و نہار کہا ہے۔ سورۂ یٰسین میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''ہم رات پر سے دن کو اُدھیڑ لیتے ہیں اور دن پر سے رات کو اُدھیڑ لیتے ہیں۔'' ..... یہ دو رُخ انسان میں پیدائش کے پہلے ہی لمحے سے شروع ہو جاتے ہیں اور اسی نوے سال جتنی بھی آدمی کی زندگی ہوتی ہے یہ دونوں رُخ اس کے ساتھ چپکے رہتے ہیں۔ ان دو رُخوں کے بغیر کوئی بھی انسان کسی بھی طرح اس دنیا میں زندگی کا تصور نہیں کر سکتا۔

جب ہم بیدار ہوتے ہیں تو ہمارے اوپر ٹائم اسپیس کی حدود مسلط ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہم دو قدم بھی چلنا چاہیں تو ہمیں Space سے بھی گزرنا ہوگا اور وقت بھی لگے گا ..... دوسرا جو عمل ہے وہ بیداری کے بعد خواب کا عمل ہے۔ کوئی انسان، کوئی شجر، کوئی حجر، کوئی حیوان، کوئی پرندہ اِس قانون سے مبرا نہیں ہے کہ وہ سوئے پھر بیدار ہو اور پھر سو جائے۔ سائنسدانوں کا قیاس ہے کہ دنیا کی عمر تین ارب سال ہے، اس کی کوئی سند نہیں ہے یہ محض اُن کا خیال ہے۔ ساڑھے تین ارب سال کی اس عمر میں بھی کوئی مثال ہمارے سامنے نہیں ہے کہ کوئی آدمی ساری عمر سوتا رہا ہو، یا ساری عمر جاگتا رہا ہو۔ جب ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم خواب دیکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ سعادت نصیب فرمائے کہ ہم دیکھیں کہ مسجدِ نبویؐ میں حاضر ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مواجہ شریف میں صلوٰۃ وسلام پیش کر رہے ہیں۔ اگر ہم بیداری کی حالت میں اس پوزیشن میں وہاں حاضر ہونا چاہیں تو پیدل چل کر جانے میں تین چار مہینے لگتے ہیں، پانی کے جہاز پر ہفتہ لگتا ہے، ہوائی جہاز پر کچھ گھنٹے لگتے ہیں یعنی ہمیں اسپیس سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور وقت بھی لگتا ہے۔ لیکن جب ہم خواب دیکھتے ہیں تو ہم رسول اللہ ﷺ کے دربار میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں حاضر ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی ہمارا انگوٹھا ہلائے تو ہم سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں واپس اپنے جسم میں آ جاتے ہیں۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ خواب کی زندگی میں ٹائم اسپیس کی گرفت سے ہر انسان آزاد ہو جاتا ہے۔ جسم و جان کے رشتے میں خواب کی بڑی اہمیت ہے..... بیداری

کی بھی بڑی اہمیت ہے...... ٹائم اسپیس کی بھی بڑی اہمیت ہے، ٹائم اسپیس سے آزاد ہونے کی بھی بہت اہمیت ہے۔

لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہے جب جسم میں روح موجود ہو۔ اگر روح موجود نہیں تو وہ بے جان، مردہ ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں۔ تمام اختیارات، تمام افعال اسی وقت زیر بحث آئیں گے جب روح جسم کے اندر ہو، انسان اس حقیقت کو سمجھے بغیر، میں نے یہ کیا میں نے وہ کیا کہتا رہتا ہے۔ حالانکہ یہ ''میں'' تو اس وقت زیر بحث آنی چاہیئے کہ جب آدمی کے کوئی چیز تو اختیار میں ہو یا اس کا تصرف ہو۔ ہمارا عام مشاہدہ ہے کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا مگر اپنی مرضی کے برخلاف اسے آخر مرنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی عالم شباب کو کھونا نہیں چاہتا مگر پھر بھی بڑھاپا اس پر آ کر رہتا ہے۔ اعصاب مضمحل اور قویٰ کمزور پڑ جاتے ہیں۔ دراصل یہ دنیا ایک دھوکا ہے اور ہر فرد کردار ہے۔ دنیا کی اسٹیج پر اگر ایک کردار اچھا ہے تو سب اسے اچھا کہتے ہیں اور اگر کردار بُرا ہے تو سب بُرا کہتے ہیں۔ انسان دراصل اپنے کردار کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ انسان کردار کے علاوہ کچھ نہیں ہے تو حقیقت اس پر آشکار ہونے لگتی ہے اور جب تک وہ دنیا کو سب کچھ سمجھتا رہتا ہے تو وہ اس حقیقت سے ناواقف رہتا ہے۔ اس کا ذہن اس حقیقت کی طرف نہیں جاتا کہ وہ پیدا ہونے اور مرنے پر بے اختیار ہے۔ وہ سدا جوان رہنا چاہتا ہے مگر بڑھاپا خراماں خراماں اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، دانت ٹوٹ جاتے ہیں۔ آنکھوں میں موتیا اور ٹانگوں میں خم آ جاتا ہے اور گھسٹتے گھسٹتے آدمی مر جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ مرتب ہوا کہ ''میں'' کچھ نہیں ہے۔ اگر ''میں'' کچھ نہیں ہے تو انسان کیا ہے؟ قرآن مجید اس طرف یوں روشنی ڈالتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ○

یعنی انسان میری بہترین صناعی ہے لیکن اسفل سافلین میں پڑا ہے۔ بہترین صناعی سے مراد یہ ہے کہ کائنات میں جتنی بھی تخلیقات ہیں ان میں انسان وہ واحد تخلیق ہے جو اللہ تعالیٰ کے نظام کو سمجھ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کو سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے لیکن اگر وہ خود اس نظام کو سمجھنا نہ چاہے تو اس سے بڑا جاہل، ناشکرا اور کفرانِ نعمت کرنے والا کوئی نہیں ہے۔''

اللہ کے اس نظام کو سمجھنے ہی کی بنیاد پر انسان اشرف المخلوقات ہے۔

آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ انسان کا شرف کیا ہے اور اس کو دوسری مخلوقات پر کیا فضیلت حاصل ہے۔ اگر فضیلت کی بنیاد شعور پر رکھی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ شہد کی مکھی میں نظم و ضبط اور تنظیم انسان

سے کہیں بہتر پائی جاتی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ وحی نازل کرتے ہیں۔ ہم کتے کو نجس اور ناپاک کہتے ہیں اور دوسری طرف منشیات سونگھنے کے لئے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں کہ اس کی حسیات انسان سے بہتر ہیں۔ پرندوں میں بے باکی عقل وشعور کو دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں جب وہ اپنے گھونسلے میں روشنی حاصل کرنے کے لئے جگنو کو مقید کر دیتا ہے۔ چیونٹیوں میں نظم ونسق قائم کرنے کا پورا نظام متحرک ہوتا ہے اور برسات کے آنے سے پہلے غلہ جمع کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر پرندہ اور جانور یہ جانتا ہے کہ اس نے کیا کھانا ہے اور کیا نہیں کھانا جیسے بکری گوشت نہیں کھاتی اور شیر گھاس نہیں کھاتا۔

آپ اس پر جتنا بھی غور وفکر کریں گے یہ بات واضح ہوتی چلی جائے گی کہ عقل وشعور کی بناء پر انسان زمین کی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق سے لے کر بڑی سے بڑی مخلوق پر ہرگز ہرگز ممتاز نہیں۔ اسی طرح آدمی روزی کمانے کے لئے جو کوشش ومحنت کرتا ہے۔ دیگر مخلوقات چرند وپرند بھی اپنے بچوں اور اپنے لئے رزق تلاش کرتے ہیں۔ جہاں تک بیماریوں کا تعلق ہے تو انسان میں حیوانات کی نسبت بیماریاں زیادہ اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔

انسان کا شرف دراصل اس بات پر ہے کہ اللہ نے آدم کو وہ علوم سکھائے ہیں جو کسی اور مخلوق کو نہیں سکھائے۔ ان علوم کو قرآن حکیم کی زبان میں علم الاسماء کہا گیا ہے۔ یہ اسماء اللہ کے نام اور صفات ہیں اور صفاتِ الٰہیہ تخلیقی مراحل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ خالق کی صفت یہ ہے کہ اسے تخلیقی فارمولوں کا علم آتا ہے۔ اللہ نے انسان کو تخلیقی فارمولوں کا علم سکھایا تاکہ اس کی نیابت اور خلافت کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ جس طرح گورنر صدر کے نائب کے طور پر اختیار استعمال کر کے صدر نہیں بن جاتا اس طرح بندہ خالق نہیں بن جاتا بلکہ وہ مخلوق ہی رہتا ہے۔ لیکن اللہ کا نائب اور خلیفہ بن جاتا ہے۔

دور جدید ہو یا قدیم، علم کی اہمیت افادیت سے کسی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ علم کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں۔ ایک مفروضہ اور مادی علم اور دوسرا حقیقی علم جو مادہ کو تخلیق کرتا ہے۔ انسان علم کے ان دو دائروں سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اسی طرح انسان بھی مادے اور حقیقت دونوں حالتوں کا مرکب ہے۔ ہمارا جسم مادی وجود ہے اور اس کو متحرک رکھنے والی اصل حقیقت روح ہے۔ روح کا علم حقیقی علم ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ علم انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق کو نہیں دیا۔ یہی وہ علم ہے جس کی بناء پر انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اللہ کا نائب اور خلیفہ ہے اور اسی علم کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے چاند، سورج، ستاروں کو مسخر کر دیا ہے کہ وہ چاہے تو ان میں تصرف کر سکے، جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، پتھر کی تسخیر کے معجزات دکھائے۔

آپ نے کیا کبھی سوچا ہے، تفکر کیا ہے یا مراقبہ کیا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو کیوں بنایا؟ اور یہ ساری خوبصورت تخلیقات کیوں عمل میں آئیں؟ جنت دوزخ کے دو الگ الگ گروہ کیوں وجود میں آئے؟ ظاہری دنیا کے عجائبات اور غیب کی دنیا کے لامحدود عجائبات کو کیوں بنایا گیا؟ اس کی وجہ خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ ایسی کائنات تخلیق کروں جو مجھ سے متعارف ہو کر مجھے پہچان لے۔'' اس حدیث قدسی میں تفکر کرنے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ کائنات کی تخلیق کا منشا بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ مجھے پہچانا جائے۔ پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ تمام مخلوقات میں سے کسی ایک مخلوق کا انتخاب کیا جائے اور اس منتخب مخلوق کو دوسری مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ علم دیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ علم دیا جائے بلکہ علم کے اندر مفہوم اور معنویت تلاش کرنے کی صلاحیت بھی عطا کی جائے۔ جہاں تک علم کی تقسیم کا تعلق ہے، ہر ذی روح کے اندر علم موجود ہے۔ ایک بکری یہ جانتی ہے کہ درخت کے پتے میری غذا ہیں۔ لیکن بکری یہ نہیں جانتی کہ بیری کا درخت کس طرح اگتا ہے اور درخت سے درخت اور دوسرے درخت سے تیسرا درخت کیسے اگایا جاتا ہے۔ بھوک پیاس کا علم تمام مخلوقات میں قدرِ مشترک ہے خواہ وہ ذی روح ہوں یا انہیں ذی روح نہ سمجھا جاتا ہو۔

مخلوق کی دو نوعیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کے اندر معانی تلاش کرنے اور مفہوم پہنانے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ ایک انسان اور دوسرے جنات۔

ذرا تفصیل سے اس بات کو دوسرے پیرائے میں بیان کرتا ہوں تاکہ ذہن کے اوپر الگ سے جو بار پڑ سکتا ہے اس کی شدت کم سے کم ہو جائے۔

ابھی یہ بات عرض کی گئی ہے کہ کائنات دراصل اللہ تعالیٰ کا وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات سے واقف تھے کہ کائنات کے تخلیقی خدوخال کیا ہیں۔ اپنے علم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تخلیقی خدوخال کو اپنے حکم اور ارادے سے شکل وصورت بخش دی۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا مخصوص اور ذاتی علم شکل وصورت بن کر وجود میں آ گیا۔ اب ہم یوں کہیں گے کہ کائنات کی بنیاد، کائنات کی حقیقت علم اور صرف علم ہے۔ یعنی کائنات نام ہے صرف اللہ تعالیٰ کے علم کا۔ جب تک یہ علم، علم تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ذہن میں موجود تھا اور جب اللہ تعالیٰ کے ذہن میں یہ علم اپنے معنی،

مفہوم اور نقش و نگار کے ساتھ ظاہر ہوا تو اس کا نام کائنات بن گیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ بندے مجھے پہچانیں، میرا تعارف حاصل کریں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود ایک علم ہیں ایسا علم جو ماوراء اور تمام علوم پر محیط ہے، اس لئے ضروری ہوا کہ مخلوقات میں سے کسی ایک مخلوق کا انتخاب کر کے اسے علم کی دولت سے نوازا جائے۔

قرعہ فال آدم کے حق میں نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو علم سکھایا۔ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا اپنی صفات اور اسماء کا علم عطا کیا۔ اسماء سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جو صفات کائنات کے خدوخال میں موجود ہیں۔ یہ وہ علم ہے جو آدم کے لئے مخصوص ہے۔ یہ ایسا علم ہے کہ جس سے فرشتے بھی ناواقف ہیں۔ اس علم کی حیثیت اتنی عظمت والی ہے کہ جب یہ علم آدم نے سیکھ لیا تو فرشتوں کو آدم کے سامنے جھکنا پڑا۔ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ سے مراد یہ ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے یہ بتا دیا کہ کائنات میرے ذاتی علم کا ایک حصہ ہے اور اس علم میں معانی اور مفہوم کے ساتھ بے شمار فارمولے ہیں، جن فارمولوں سے یہ کائنات تخلیق کی گئی اور جن فارمولوں پر یہ کائنات قائم ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ناموں کا علم سکھا دیا، ایسی طرز ہے جو عام سطح کے ذہن کے لئے بیان کی جاسکتی ہے۔

روحانیت میں اسماء سے مراد وہ فارمولے ہیں، جن فارمولوں پر کائنات کی تخلیق کی گئی ہے۔ آدم کو کائنات کی تخلیق کے فارمولے سکھانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھیج دیا۔ یہ بات بہت زیادہ اہم ہے کہ اس وقت جنت میں آدم کی پوزیشن ایک ایسے سائنس دان کی ہے جو کائنات کے تخلیقی فارمولوں کا عالم ہے۔ ان فارمولوں میں بنیادی فارمولا یہ ہے کہ ساری کائنات ایک علم ہے۔ اور آدم اس علم میں معانی اور مفہوم کے ساتھ تصرّف کر سکتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ''کُن'' ارشاد فرما کر ساری کائنات کو وجود عطا کر دیا ہے، اسی طرح کائنات میں موجود تمام تخلیقات پر فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کی حیثیت سے آدم کو تصرّف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

علم الاسماء سکھانے کے بعد ''اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جمع کر کے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانا چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کی آپ جسے نائب بنانا چاہتے ہیں وہ زمین میں فساد کرے گا۔ فرشتوں کے اس بیان کا مطلب کیا ہوا؟ دراصل فرشتے زمین پر خون خرابہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے اور ان کو علم تھا کہ آدم سے پہلے جو مخلوق یعنی جنات موجود تھی اس نے زمین پر فساد برپا کر دیا تھا اور آدم کی تخلیق کے عناصر تو وہی ہیں جن سے

پچھلی مخلوق جنات نے زمین پر فساد برپا کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ آدم خون خرابہ اور فساد برپا نہیں کرے گا اور آدم کو اپنے اسماء، صفات، تخلیق کے فارمولوں، کائنات کے رموز اور کائنات میں کام کرنے والی مشیت کا علم عطا کر دیا اور آدم سے فرمایا کہ ہم نے جو علم تمہیں سکھایا ہے اسے بیان کرو۔ آدم نے جب ان علوم کی تشریحات بیان کیں تو فرشتوں نے کہا ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو سکھا دیا ہے یہ تو ہم سے بہت زیادہ علم جانتا ہے چونکہ علم میں یہ ہم سے ممتاز ہے اس لئے آپ کے حکم کی تعمیل میں ہم اس کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ جنات میں سے ایک گروہ نے آدم کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کو مردود قرار دیا۔ مردود ہونے میں کیا عوامل پیش آئے؟ یہی کہ ابلیس نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علوم سے انحراف برتا، تو اگر آدم کی اولاد نے علم الاسماء کا کھوج نہیں لگایا اور یہ علم نہیں سیکھا تو ابلیس اور آدم میں کیا فرق ہے۔

جب کسی بندے کو علم الاسماء کی روشنی مل جاتی ہے تو یقین کریں اس کے اندر سے ''میں'' نکل جاتی ہے اور اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''پیغمبروں کی طرزِ فکر یہ ہوتی ہے کہ پیغمبر اپنی ذات کی معرفت کسی بات کا تذکرہ ہی نہیں کرتا بلکہ پیغمبر ہمیشہ Care of Allah یعنی اللہ کی معرفت سوچتا ہے۔''

وہ اس آیت کی منہ بولتی تصویر ثابت ہوتا ہے۔

وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا۰

یعنی جن کو علم الاسماء اور مشاہداتی نظر حاصل ہو جاتی ہے وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا یہ یقین ہے کہ یہاں ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور بے شک اللہ ہی دانا و بینا ہے۔

غور کریں کہ ہم گناہ کب کرتے ہیں؟ گناہ ہم اسی وقت کرتے ہیں جب ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے۔ جب ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو پھر ہم گناہ کیسے کر لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور اس دعویٰ کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ ہمارا یقین نہیں ہے کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ ہم تو انسان کے دیکھنے سے گناہ سے باز آ جاتے ہیں اللہ کے دیکھنے سے گناہ کیسے کر سکتے ہیں۔ جب انسان کو مشاہداتی نظر حاصل ہو جاتی ہے تو اسے اُٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے ہر لمحہ اور ہر ساعت سب جگہ اللہ جلوہ گر نظر آتا ہے۔

ایک مرتبہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا ''ایک پیر صاحب کے دو مرید تھے۔ پیر صاحب نے اپنے ایک مرید کو ایک مرغا اور چھری دی اور کہا اسے کسی ایسی جگہ لے جا کر ذبح کرو جہاں تمہیں کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ مرید چھری اور مرغا لے کر نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں ذبح کر کے لے آیا۔ اب پیر صاحب نے دوسرے مرید کو ایک مرغا اور چھری دے کر یہی حکم دیا۔ مرید کو گئے ہوئے چوبیس گھنٹے ہوگئے۔ آخر میں زندہ مرغ اور چھری کے ہمراہ واپس آ گیا اور عرض کیا حضور میں تو جہاں بھی گوشہ تنہائی میں گیا اور اس مرغ کے حلق پر چھری رکھی تو نظر آیا کہ اللہ دیکھ رہا ہے اور آپ نے ایسی جگہ ذبح کرنے سے منع فرمایا تھا جہاں کوئی دیکھ رہا ہو۔''

جو انسان آدم کی وراثت کو استعمال کرتے ہوئے ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کر لے وہ اللہ تعالیٰ کا ناپسندیدہ عمل کس طرح کر سکتا ہے۔ آدم ہی کی اولاد ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کر کے ثابت کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے حصول میں بڑی سے بڑی قربانی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بیاسی سال کی عمر میں بیٹا عطا کیا۔ بیٹا جب چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے کہا اسے ذبح کر دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کر دیا۔ یہ بات الگ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی قبول کر کے بیٹے کو بچا لیا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بات پوری کر دی۔

سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت جو آپ کے باپ آدمؑ کی نسبت سے ملی ہے ہم نے اس کے لئے کتنی جدوجہد اور کوشش کی ہے۔ اگر اپنے باپ آدمؑ کا ورثہ ہی نہیں ملا تو انسان کہلانے کا مستحق کس طرح ہو سکتا ہے۔ انسان اگر حیوانات سے ممتاز ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ اس کو علم الاسماء حاصل ہے اور یہ علوم انسان کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں ہیں۔ جب کوئی انسان علم الاسماء سیکھ لیتا ہے تو اس پر یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ یہاں ہر سُو اللہ تعالیٰ کی قدرت کار فرما ہے۔ جب یہ بات ذہن میں راسخ ہو جاتی ہے تو انسان اللہ کا دوست بن جاتا ہے۔

اللہ کا دوست وہی ہے جو اللہ کو جانتا ہے اور اللہ کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفات کا علم جانتا ہو۔ اگر آپ پانی کی صفت سے واقف نہیں ہیں تو درحقیقت آپ پانی ہی سے واقف نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اللہ کی صفات سے واقف نہیں ہے تو وہ اللہ سے واقف نہیں ہے۔ اللہ کی صفات علم الاسماء ہیں۔ انسان کے پاس جب تک اس کے باپ آدم کا ورثہ علم الاسماء نہیں ہوگا تو وہ آدم زاد کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ باپ بادشاہ ہے اس کا بیٹا باپ کی بادشاہت کو قبول نہیں کرتا اور کشکول [illegible] گداگری [illegible]تا ہے تو اس کو کوئی سعید اولاد نہیں کہہ سکتا۔ کوئی شخص پی ایچ

ڈی کرتا ہے لیکن علم الاسماء حاصل نہیں کرتا تو کیا اس کی ڈگری مرنے کے بعد کام آ سکتی ہے؟ کوئی ڈاکٹر، انجینئر یا سائنٹیسٹ بن جائے تو اسے دنیا میں حیثیت تو مل جائے گی مگر مرنے کے بعد یہ ڈگری اس کے کسی کام کی نہیں۔ پس بندہ اشرف المخلوقات اسی وقت ہے جب اس کو علم الاسماء حاصل ہو۔ جب وہ اپنی روح سے واقف ہو اور وہ اللہ کا دیدار ومشاہدہ کرتا ہو۔ وگرنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔

بندہ اگر اللہ کو دیکھنے کے قاعدے اور ضابطے پورے کر دے تو بندہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک بشر اللہ کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟...... ازل میں اللہ تعالیٰ نے کُن کہا اور ساری کائنات بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں سے مخاطب ہو کر فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کہ میں تمہارا رب ہوں۔ روحوں نے یہ آواز سنی، روحیں آواز کی طرف متوجہ ہوئیں تو اللہ کو دیکھا اور روحوں نے کہا قَالُوْا بَلٰی جی ہاں آپ ہمارے ربّ ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانوں کی ارواح ازل میں اللہ کو دیکھ چکی ہیں اور اللہ کو دیکھنے کے بعد اللہ کی ربوبیت کا اقرار کر چکی ہیں۔ اب اگر ہم اپنی اصل یعنی روح سے واقفیت حاصل کر لیں تو بڑی آسانی سے اللہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَo

میرے بندوں میں تمہارے اندر ہوں تم دیکھتے کیوں نہیں؟ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اپنے اندر دیکھنا ہے، اپنے اندر جھانکنا ہے، مراقبہ کرنا ہے۔ جب کوئی اپنے اندر جھانکتا ہے تو ایک دن آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سامنے آ جاتے ہیں۔

اب آپ سب حضرات اس حقیقت سے واقف ہو چکے ہوں گے کہ انسان اللہ سے واقف ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی روح اللہ کو دیکھ چکی ہے اللہ کی آواز سن چکی ہے۔ آپ اپنی روح سے بھی واقف ہو سکتے ہیں اور روح سے واقف ہونے کا ایک طریقہ مراقبہ ہے۔

جب ہم کوئی علم سیکھتے ہیں یا کسی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم ایک طریقہ اختیار کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس چیز کو سمجھنے اور جاننے کے لئے تفکر کرتے ہیں اور ہمارے ذہن میں یہ تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اس چیز کی اصلیت کیا ہے، یہ کیوں اور کس لئے ہے۔ اگر چھوٹی سے چھوٹی بات میں تفکر کیا جائے تو اس چھوٹی سی بات کی بڑی اہمیت ہے اور اگر کسی بڑی سے بڑی بات پر غور وفکر نہ کیا جائے تو وہ بڑی بات غیر اہم اور فضول بن جاتی ہے۔ تفکر سے ہمیں کسی شئے کے بارے میں علم حاصل

ہوتا ہے اور پھر تفکر کے ذریعہ اس علم میں جتنی گہرائی پیدا ہوتی ہے اسی مناسبت سے کسی چیز اور اس کی صفات سے ہم باخبر ہو جاتے ہیں۔

مراقبہ دراصل اس تفکر کا نام ہے جس سے انسان اس علم کو حاصل کر لیتا ہے جو اس کی اپنی انا، ذات، شخصیت یا روح کا علم ہے۔ یہ علم حاصل ہونے کے بعد کوئی انسان اپنی انا اور روح سے وقوف حاصل کر لیتا ہے اور روح سے واقفیت کے بعد انسان اللہ سے واقف ہو جاتا ہے جو کہ انسان کی زندگی کا مقصد ہے اور آدمؑ کا ورثہ ہے۔

آدمؑ کے اس ورثے کو عام کرنے کے لئے اور اس علم کے پھیلاؤ کے لئے میں نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے یہ کتاب ''مراقبہ'' لکھی۔ اس کتاب کا منشاء صرف اور صرف یہ ہے کہ نوعِ انسانی اس ورثے کو حاصل کر لے جو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو علم الاسماء کی شکل میں عطا فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ سب کو آدمؑ کے اس ورثے کو حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اور اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے۔ (آمین)

السلام علیکم!

☆......☆.....☆

کتاب مراقبہ کے افتتاح کے موقع پر مرشد خطاب کر رہے ہیں
ساتھ گورنر پنجاب حنیف رامے اور اشفاق احمد خان بیٹھے ہیں

کتاب مراقبہ کے افتتاح پر حاضرین بیٹھے ہیں

کتاب مراقبہ کے افتتاح پر گورنر پنجاب جناب حنیف رامے اور مرشد کریم سٹیج پر بیٹھے ہیں

کتاب مراقبہ کی رونمائی کی تقریب میں سٹیج پر گورنر پنجاب
جناب حنیف رامے اور میاں مشتاق عظیمی بیٹھے ہیں

مراقبہ ہال برائے خواتین کے افتتاح پر خطاب

۱۷ ستمبر ۱۹۹۶ء کو مرشدِ کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے ۵۵۔ سلمان اسٹریٹ، اسلامیہ پارک سمن آباد، لاہور میں مراقبہ ہال برائے خواتین کا افتتاح کیا۔ افتتاح کے اس موقع پر خواتین و حضرات کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔

پروگرام میں الشیخ عظیمی صاحب کے ہمراہ میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب بھی تھے۔ شروع میں نگران مراقبہ ہال برائے خواتین ڈاکٹر شگفتہ فیروز کو بنایا گیا لیکن اب موجودہ نگران مراقبہ ہال برائے خواتین سلمٰی مشتاق عظیمی صاحبہ ہیں اور اب مراقبہ ہال برائے خواتین سمن آباد سے A-۱۵۸، مین بازار مزنگ لاہور میں شفٹ ہوگیا ہے۔ اور بعد میں بیڈن روڈ پر منتقل کر دیا۔

مرشدِ کریم نے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا!

آج یہاں مراقبہ ہال برائے خواتین کے افتتاح سے روحانی علوم کے پھیلاؤ میں ایک نیا باب رقم کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سب خواتین اور نگران مراقبہ ہال لاہور میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

روحانی علوم کے سلسلے میں سلسلہ عظیمیہ کی تعلیمات ہماری راہنمائی کرتی ہیں۔ جن کے بارے میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنی کتاب ''لوح وقلم'' میں لکھا ہے کہ:

> ''نوعِ انسان میں زندگی کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر طبائع کی مختلف ساخت ہوتی ہیں مثلاً ساخت الف، بے، پے، چے وغیرہ وغیرہ۔ یہاں زیرِ بحث وہ ساخت ہے جو قدم قدم چلا کر عرفان کی منزل تک پہنچاتی ہے۔''

یعنی سلسلہ عظیمیہ کی تعلیمات وہ ہیں جن کی روشنی میں، عمل پیرا ہو کر ہمیں اپنی ذات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور سیڑھی با سیڑھی حضور پاکؐ تک اور اس کے بعد حسبِ استطاعت وسکت اللہ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

آپ بتا سکتے ہیں یہ سب کچھ کب ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے......؟

یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان روحانی علوم سے واقفیت حاصل کر لیں۔ لیکن یہاں صورتحال یہ ہے کہ روحانی علوم کی اہمیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ انسان صرف مادی علوم کی طرف ہی توجہ دیتا ہے وہ بھی شعور کی داغ بیل سے لے کر جب تک جسم کی مشینری ساتھ دے تب تک۔

یہاں صرف مادی علوم کی اہمیت رہ گئی ہے حالانکہ مادی علوم سے صرف پیٹ کا ایندھن ہی بھرا جا سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

آپ بتائیں کیا مادی علوم سیکھ کر آپ اپنی روح کو دیکھ سکتے ہیں؟

کیا مادی علوم سیکھ کر فرشتوں کا دیدار کیا جا سکتا ہے؟

کیا مادی علوم سیکھ کر آپ دربار رسالت مآبؐ میں حاضری کی سعادت سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں؟

کیا مادی علوم کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا جا سکتا ہے؟

ہے کوئی جواب ان سوالوں کا آپ لوگوں کے پاس۔ اگر ہے تو بتائیں۔..........؟

اگر ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو پھر میرے بزرگو، بچو، معزز خواتین اور بیٹیو!

ہم پھر اپنی ساری زندگی میں کیا کر رہے ہیں سوائے جانوروں کی طرح پیٹ بھرنے کے اور جانوروں ہی کی طرح زندگی گزارنے کے۔

اور جانور تو عالم نہیں ہوتے، پھر ہم کیا علم والے ہوئے یا جاہل۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"کیا علم والے اور جاہل برابر ہیں۔"

جہالت اور علم میں بہت فرق ہے۔ سو (۱۰۰) جاہلوں میں ایک پڑھے لکھے کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس کی (Approach) زیادہ ہے۔

یہ دنیاوی علوم کی بات ہے۔ جبکہ روحانی علوم میں بندہ اپنی روح سے واقف ہوتا ہے اور روح کے تحت جتنی بھی صلاحیتیں ہمارے اندر کام کر رہی ہیں ان سب صلاحیتوں سے واقف ہوتا ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ دنیا کے ہر شعبے میں آدمی کی اپنی صلاحیت ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شعبے میں اپنی خدمات سرانجام دیتا ہے۔

روحانی علوم کے تحت بھی بندہ اپنی صلاحیتوں سے واقف ہو کر، روحانی علوم کے شعبے میں اپنی خدمات سر انجام دیتا ہے۔

پھر روحانی علوم حاصل کرنے کا کیا فائدہ؟

روحانی علوم دراصل ہمارے لئے بہت کارآمد، فائدہ مند اور نتیجہ خیز ہیں۔ روحانی علوم کا مادی علوم کی نسبت بنیادی فائدہ یہ ہے کہ اصل اور نقل میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔

آپ بتائیں۔ اصل کیا ہے اور نقل کیا ہے؟

کیا یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں یہ اصل زندگی ہے؟

کیا ہمارا یہ جسم اصل ہے؟

کیا ہم جو اعمال سرانجام دے رہے ہیں وہ حقیقت کے دائرے میں سرانجام دے رہے ہیں؟

کیا ہم جو دیکھ رہے ہیں، سن رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں یہ سب کیا ہم حقیقت میں دیکھ رہے ہیں، سماعت کر رہے ہیں اور شعور سے، تدبر سے یا تفکر سے کام لے رہے ہیں؟

آپ سوچیں!............

تفکر کریں!............

جتنا بھی آپ سوچیں گے، غور و فکر اور تدبر و تفہیم سے کام لیں گے ایک ہی بات آپ کو نظر آئے گی کہ سب نقل ہی نقل ہے، جھوٹ ہی جھوٹ ہے، سب دھوکہ اور سراب ہے۔

ہم جھوٹ اور نقل کی زندگی میں پیدا ہوتے ہیں، زندگی گزارتے ہیں اور بالآخر فنا ہو جاتے ہیں۔

ایسے میں بھلا ہم خوش کیسے رہ سکتے ہیں، سکون کیسے ہماری زندگیوں میں آ سکتا ہے۔ ہم اپنا اشرف المخلوقات کا تشخص کیسے حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم پھر بیمار کیوں نہ ہوں، فتنہ و فساد ہر جگہ کیوں نہ نظر آئے جب ہم نے سب کچھ نقل ہی کو سمجھ لیا ہے۔

یہی اس دنیا کی بے ثباتی ہے۔

اسی بے ثباتی کے فرق سے متعارف کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی لڑی بنائی۔ اور پیغمبروں کے بعد ان کے علوم کے حامل افراد جنہیں اولیائے کرام کہا گیا نے اس مشن کا بیڑہ اُٹھایا اور نوعِ انسانی کو دنیا کی بے ثباتی کے فرق کے ساتھ حقیقت اور اصل زندگی سے متعارف کرایا۔ اور اسی مشن کے تحت سلسلہ

عظیمیہ وجود میں آیا جس کے نتیجے میں آج ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔

دنیا کی بے ثباتی سے منہ موڑ کر اصل سے، حقیقت سے واقف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بندہ اچھا کھانا نہ کھائے، اچھے کپڑے نہ پہنے، شادی نہ کی جائے، دنیاوی کام نہ کئے جائیں یہ کرنا رہبانیت ہے۔

اور رہبانیت کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ پاک ہے۔''دنیا میں رہتے ہوئے دنیاوی تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنی انا، روح سے واقفیت حاصل کریں۔''

خود آگاہی سے جب واقفیت ہوتی ہے تو سکون حاصل ہو جاتا ہے، بندہ پرسکون رہتا ہے اور قرآن کی اس آیت کی تفسیر بن جاتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ،

''اللہ کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ ہی وہ غم آشنا زندگی سے واقف ہوتے ہیں۔''

یعنی بندہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور تمام تفکرات سے اس کا ذہن آزاد ہو جاتا ہے وہ کلیتاً اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اور یہی سپردگی استغناء، توکل، بھروسہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اگر آپ انسانی صلاحیتوں کا، فطرت کا تجزیہ کریں اور کائناتی سسٹم پر غور کریں تو آپ کو ایک ہی بات نظر آئے گی کہ ساری کائنات علم کا ہونا ہے۔

ایک بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اسے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ کس مسلک کے ہاں پیدا ہوا ہے۔ مسلمانوں میں بچے کے کان میں اذان دی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے گھنٹی بجائی جاتی ہے، یہودی کے دمدمہ بجایا جاتا ہے اسی طرح عیسائی بھی کچھ کرتے ہیں۔

اذان دینا، اس سے مراد بچہ کے شعور میں مسلمان کے بارے میں علم منتقل کرنا ہے۔ اسی طرح ہندو کا شعور منتقل ہوتا ہے۔ اس کے بعد بچے کا نام رکھا جاتا ہے اور یہی نام ساری زندگی کے لئے بچے کی شناخت بن جاتا ہے۔

آپ دیکھیں یہاں جو کچھ موجود ہے یہ امر لازم ہے کہ اس کا نام ہو۔ انسانوں میں نام انفرادی طور پر لئے جاتے ہیں۔ جبکہ اشجار میں یہ نام اجتماعی طور پر رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً بادام کا درخت یہ کہیں بھی ہو اس کا نام بادام ہی ہوگا۔ اسی طرح تمام درخت ہیں۔

انسانی شعور میں سب سے پہلے یہ منتقل ہوتا ہے کہ مسلمان ہے یا عیسائی ہے پھر نام رکھا جاتا ہے۔ جب تک تم زندہ رہو گے تمہاری پہچان نام کے علاوہ نہیں ہوگی۔ ہر بچہ کو شناخت کا علم منتقل ہوتا ہے۔ یہ نقوش اتنے گہرے

ہوتے ہیں کہ جسم میں تبدیلی آ جاتی ہے مگر شناخت میں تبدیلی نہیں آتی ہے مثلاً ایک نوجوان کو ۱۰ سال کی تصویر دکھائیں وہ نہیں پہچانے گا۔

بچپن کی تصویر اگر بوڑھے کو دکھائی جائے تو وہ نہیں پہچانے گا۔ لاعلمی، علم سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ ایسے ہی لاعلمی بھی علم ہے۔ ہم لاعلمی کو علم سے پہچانتے ہیں اور علم کو لاعلمی سے پہچانتے ہیں۔

آپ جب پیدا ہوئے، بڑے ہوئے، والدین کہتے ہیں پانی پی لو، مم پی لو۔ یہ پانی ہے۔ کیا اس کا علم منتقل نہیں ہو رہا ہے۔ صحت کو بحال رکھنے کے لئے دودھ توانائی ہے۔ دودھ سے بھوک میں اضافہ اور قد میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ بیٹے کو کہنا دودھ پی لو، یہ کہنا دودھ کی خصوصیات منتقل ہونا ہیں۔ یہ کہنا پانی اور دودھ کا علم منتقل ہونا ہے۔ اس کے بعد روٹی ہے، کپڑوں کا استعمال ہے، قمیض شلوار، پہنانا، چڈی چڑھانا، ستر پوشی کا علم منتقل کرنا ہے۔ اس کے بعد جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو سکول جانے لگتا ہے۔ تصویریں، کھلونے، کتابیں وغیرہ بچے کی شعوری سطح کو علم کے ذریعے بلند کر رہے ہیں۔

ا، ب، ت اور تختی وغیرہ لکھنے پڑھنے کے علم کا منتقل کرنا ہے۔ پھر جب اور بڑا ہو جاتا ہے تو کاروبار میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہاں بھی کاروبار کے متعلق علم جانتا ہے۔ ان سب باتوں میں علم کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔

فرشتے کائناتی سسٹم میں کارکن کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ یعنی کائناتی سسٹم جس بنیاد پر چل رہا ہے فرشتہ اسے جانتا ہے۔ یہ قانون ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مرنے کے بعد بھی علم ہے۔ یہ مسلسل اور متواتر ہے۔ اس علم میں کہیں رخنہ نہیں ہے۔ اگر رخنہ ہو جائے تو اسے پاگل یا مخبوط الحواس کہتے ہیں۔ یہ بھی ہم اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک ہمیں علم نہ ہو۔

قرآن پاک کی تعلیمات کے مطابق انسان کی مادی تخلیق میں فساد ہے اور کائنات پر آدمؑ کی حکمرانی صرف اور صرف علم کی بنیاد پر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب کائنات تخلیق کرنے کا ارادہ کیا تو ''کن'' کہا یعنی ہو ''جا''۔

پس کائنات ''فیکون'' ہو کر معرضِ وجود میں آ گئی۔

اللہ نے جب کن کہا تو یہ کس لئے کہا؟

وہ اس علم کے بارے میں جو کائنات کے بارے میں تھا اس کے بارے میں کہا۔

اور وہ علم ظاہر ہوگیا۔

یعنی کائنات میں جو سسٹم ہے جو اللہ کے ذہن میں تھا اس کا مظاہرہ ہوگیا اس سے ثابت ہوگیا کہ

''کائنات دراصل اللہ کے ذہن میں موجود علم کا مظاہرہ ہے۔'' پھر غور سے سنیں۔

''کائنات اللہ کے ذہن میں موجود علم کا مظاہرہ ہے''۔

جب کائنات تخلیق ہوگئی تو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسان کو سماعت کا علم منتقل کیا۔ اس میں بولنا، قبول کرنا، ہاتھ سے پکڑنا وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔

''آواز دینے والے کو جب انسان نے دیکھا تو بصارت کا علم منتقل ہوا۔ مشاہدہ کر کے اقرار کیا تو بولنے کا علم منتقل ہوا۔ مخلوق نے مخلوق کو جب دیکھنے اور افہام وتفہیم کا علم حاصل کر لیا تو مخلوق کی اجتماعیت میں انفرادیت پیدا ہوگئی۔ پھر قوتِ احساس پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ کو دیکھ کر پہچانا یعنی شعوری علم منتقل ہوگیا اور شعور بن گیا۔''

جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ''ہم نے اپنی امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، زمین کے اندر جو کچھ ہے۔ پہاڑوں میں جو کچھ موجود ہے اُن سب کو دی تو انہوں نے کہا کہ ہم میں یہ طاقت نہیں کہ ہم اس امانت کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھا سکیں مگر انسان نے اُٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے اور جلد باز ہے۔''

زمین، آسمان، پہاڑ سب میں عقل وشعور ہے۔ زمین کے ہر فرد کو شعور ہے۔ زمین میں اشجار کو شعور ہے۔ آسمان میں فرشتوں کو شعور ہے۔ چاہے رد کریں یا قبول کریں۔ ان سب کی بنیاد علم پر ہے۔ انسان کو یہ فضیلت حاصل ہے مگر تلاش نہیں کرتا اس لئے وہ ظالم اور جاہل ہے۔ اور اگر انسان اللہ کی دی ہوئی اس امانت سے واقف ہو جاتا ہے تو علم کی اس امانت کے تحت اشرف المخلوقات، خلیفۃ الارض اور اللہ کا نائب بن کر کائنات پر حکومت کرتا ہے۔

انسان علم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کائنات علم کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہاں سے علم کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ روحانی علم ہی دراصل ایک حقیقی علم ہے جس کی بنیاد پر ہی انسان اور یہ کائنات تخلیق ہوئی ہے اور تخلیق ہونے کے بعد نشوونما کے ساتھ پروان چڑھ رہے ہیں۔

روحانی علم کی اہمیت اس لئے بھی کم ہے کہ روحانی علم سے نوکری نہیں ملتی۔ انسان روحانی علم کو مادی تناظر میں جب دیکھتا ہے تو وہ اس کا انکار کر دیتا ہے اور آج اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے ہم ایک مردہ قوم بن چکے ہیں شرف ومنزلت کا کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ مصائب اور پریشانیوں نے ہمیں اس طرح گھیر لیا ہے کہ ان سے

رستگاری کا کوئی حل نہیں مل رہا۔

جبکہ ہم اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جس قوم سے ایسے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے کائنات کو مسخر کیا، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب کو مسخر کیا۔ روحانی علم سے جب واقفیت ہو جاتی ہے تو انسان کائناتی سسٹم سے واقف ہو جاتا ہے۔ کائنات کا یہ سسٹم وہ لوگ چلا رہے ہیں جو علم اور کائناتی سسٹم سے واقف ہیں۔ علم سیکھنے کے بعد گہرائی اور تفکر پیدا ہوتا ہے۔ جب آپ روحانی علم سے واقف ہو جاتے ہیں تو کائناتی سسٹم سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ اور جب کائناتی سسٹم سے واقف ہو جاتے ہیں تو اللہ سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اور جو بندہ اللہ سے واقف ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے۔ بندہ جب اللہ کا دوست بن جاتا ہے تو وہ یہ جان لیتا ہے کہ اللہ میرا دوست ہے اس پر حد بندی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ وقت اور اسپیس سے آزاد ہو جاتا ہے۔ زمین پر خلیفۃ الارض بن جاتا ہے۔ اشرف المخلوقات کا شرف حاصل کر لیتا ہے۔ فرشتے اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ پوری کائنات اس کے لئے مسخر ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ارادے سے کائنات میں جہاں چاہے تبدیلی پیدا کر سکتا ہے اس سے زیادہ روحانی علم کی اہمیت آپ کو کیا بتائیں۔

آپ دنیا میں کچھ بھی کر لیں یہاں سب کچھ عارضی ہے۔ ایک نہ ایک دن آپ نے یہ دنیا چھوڑ کے چلے جانا ہے۔ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ تب آپ کو پتہ چلے گا۔ لیکن اس وقت سب بے سود ہوگا۔

روحانی علم تو وہ لوگ سیکھتے ہیں جو اپنے باپ آدمؑ کا علم سیکھنا چاہتے ہیں۔ روحانی علم اب تھیوری میں بھی تبدیل ہو گیا ہے اس لئے روحانی علم تھیوری میں بھی سیکھیں اور پریکٹیکل میں بھی سیکھیں۔ کسی چیز کی تھیوری معلوم ہو تو پریکٹیکل آسان ہو جاتا ہے۔ پہلے پریکٹیکل تھا تھیوری ظاہر نہیں کرتے تھے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے روحانی علم کو تھیوری میں منتقل کر دیا ہے اس کو سمجھنا اس وقت ممکن ہے جب تھیوری لکھنے والا سمجھائے۔ پڑھنے کے بعد تبدیلی، تڑپ اور طلب پیدا ہوتی ہے۔ بندہ کتاب پڑھنے کے بعد استاد تلاش کرتا ہے۔ استاد اب ملتا ہی نہیں۔ اگر خوش قسمتی سے مل جائے تو چند لوگوں کو ملتا ہے آپ لوگ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایک ایسا استاد ملا ہے جس نے تھیوری میں روحانی علم کو تبدیل کرنے والے استاد حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے سب کچھ سیکھا ہوا ہے۔ آپ بہت خوش قسمت لوگ ہو مگر پھر بھی اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے۔ آپ لوگ روحانی علوم کو سیکھنے کے لئے پندرہ بیس منٹ کا وقت دینا بھی پسند نہیں کرتے تو ایسے میں آپ لوگ کیا حاصل کریں گے اسی طرح تہی دامن رہ کر دنیا سے چلے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان

سب باتوں سے بے پرواہ ہے۔

بات ہو رہی تھی تھیوری کی، تبدیلی اور تڑپ کی۔ حضور داتا گنج بخشؒ نے بھی اسی تڑپ، طلب کے لئے بہت کام کیا۔ انہوں نے کتاب ''کشف المحجوب'' لکھی۔ کتاب پڑھنے کے بعد ہمارے اندر تجسس کی صلاحیت ابھری کہ یہ علوم سیکھیں۔ جن لوگوں نے اس تجسس کی بنیاد پر ان علوم کو سیکھنے کی کوشش کی اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیاب بھی کیا۔ لیکن ان کامیاب ہونے والے افرد کی تعداد بہت کم ہے۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے روحانی علم کو تھیوری میں تبدیل کر دیا ہے۔ قلندر بابا اولیاءؒ کے ذریعے علم کی تھیوری ہوئی۔ اس کے دو فائدے ہوئے ایک تڑپ دوسرے طلب اور ان کے نتیجے میں پریکٹیکل ہے۔

تھیوری کے علم سے یہ ہے کہ اس کے اندر لاشعور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جب وہ لاشعور کی اس کیفیت کے ساتھ پریکٹیکل کرتا ہے تو اس کی وہ نظر جو مظاہر میں دیکھتی رہتی ہے غیب میں بھی دیکھنے لگتی ہے۔

غیب میں کیا ہے؟

زمین اور زمین کے اندر کے حقائق۔

آسمان اور آسمان کے اندر جو کچھ ہے۔

آسمانوں میں کیا ہے؟

آسمانوں میں کہکشانی نظام ہیں، مختلف اور بے شمار سیاروں کے اوپر مخلوق آباد ہے، ان سیاروں کے احوال و آثار، فرشتے ہیں ان سب کو ڈھونڈیں۔

فرشتوں کو ڈھونڈیں۔

سات سو جگہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ غور وفکر کرو، تدبر کرو، تفکر کرو، کیا تم شعور نہیں رکھتے، کیا تمہیں عقل نہیں ہے۔

یا اولوالالباب۔

کیا تفکر نہیں کرتے۔

آپ لوگ بتائیں، خواب میں کون سی آنکھ دیکھتی ہے؟

بتائیں بھئی.........

ہاں دوسری آنکھ دیکھتی ہے جسے روح کی آنکھ یا جسمِ مثالی کی آنکھ کہتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ تو اندر دیکھ رہی ہے آپ کو بس اس کیفیت سے واقف ہونا ہے جو اندر دیکھتی ہے۔

اس کے لئے چوبیس گھنٹوں میں سے روزانہ ۸،۱۰ گھنٹے یہ پریکٹس کریں تاکہ آپ اندر کی آنکھ سے واقف ہوں۔

بندہ جسمانی وجود کے بغیر آسمانوں میں پرواز کر سکتا ہے، جسمانی وجود کے بغیر ہر خواہش پوری کر سکتا ہے۔ اس کی واضح مثال خواب ہے جیسے خواب میں، اندر کی آنکھ کے تحت، جسمانی وجود کے بغیر جنسی تلذذ حاصل کیا جاتا ہے۔اس سے بھی غسل واجب ہو جاتا ہے۔جسمانی وجود کے بغیر خواب میں ڈرنا، چیخنا، دہشت زدہ ہونا، یہ سب جسمانی طور پر نہیں ہے۔آپ مافوق الفطرت خواب دیکھنے سے مسرور ہوتے ہیں۔

انسان مادی وجود کے ساتھ بھی رہ سکتا ہے اور مادی وجود کے بغیر بھی رہ سکتا ہے یہ کون سی حقیقت ہے؟

یہ امر ہے، روح ہے، باطنی علم ہے۔مادی علم کے ساتھ ساتھ اپنی اصل اپنی روح کے علم کو سیکھیں۔اور یہ علم آپ کو اپنے اندر جھانکنے سے حاصل ہوگا۔

آپ بتا سکتے ہیں کہ کیا کسی پیغمبرؑ نے کالج یا یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہو یہ بات کہیں سے ثابت نہیں ہوتی۔ہمارے لئے سب سے بڑی ذات خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے۔آپؐ باعثِ تخلیق کائنات، رحمت اللعالمینؐ ہیں۔ساری کائنات آپؐ کے تابع فرمان ہے، آپؐ نے یہ علوم کیسے حاصل کئے۔

آپؐ نے یہ علوم غارِ حرا میں، تنہائی میں بیٹھ کر اپنے اندر جھانکنے سے حاصل کئے۔یہی بات تمام انبیاءؑ کے لئے ہے۔

روحانی آدمی مادی علوم حاصل کرنے کے بغیر دنیاوی عالم فاضل سے زیادہ علم رکھتا ہے۔علم کے نئے نئے فلسفے سامنے آتے ہیں۔پیغمبر تو بن نہیں سکتا کیونکہ پیغمبری تو ختم ہو چکی ہے۔انبیاءؑ کے علوم ہمیں منتقل ہو چکے ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ان علوم کو سیکھنے کے لئے کتنی تڑپ اور طلب دکھاتے ہیں۔

مادی علوم سے سیکھنے کا پیٹرن پیدا ہوتا ہے، روحانی علوم سے دماغ بڑا ہوتا ہے۔ایک چھوٹا دماغ ہے اور ایک بڑا دماغ۔

ایک چھوٹے دماغ والا اور ایک بڑے دماغ والا قرآن کو سمجھتے ہیں تو بتائیں۔

زیادہ کون سمجھے گا؟

چھوٹے دماغ والا یا بڑے دماغ والا۔

بالکل ٹھیک۔ بڑے دماغ والا زیادہ سمجھے گا۔ اللہ کی صناعی بڑے دماغ سے ہو تو بات بنتی ہے۔

★ مادی اور روحانی دونوں علوم سیکھیں۔ یہ مت سوچیں کہ روٹی ملے گی یا نہیں۔ بلکہ دماغ بڑا ہوگا۔ علم زیادہ ہو تو ہر شعبے میں کامیابی ہوتی ہے۔ روحانی علوم کے حصول سے آپ اس طرح خود آگاہی سے واقف ہو جائیں گے۔ اور یہی سلسلۂ عظیمیہ کا مشن ہے۔ اسی مشن کی خاطر ہر شہر میں سنٹر بنائے گئے ہیں جس کی ایک کڑی یہ مراقبہ ہال برائے خواتین ہے۔ انسان سے مراد مرد نہیں ہے بلکہ مرد اور عورت دونوں ہیں، آپ سب خواتین بھی اس بات کے لئے مبارکباد کی مستحق ہیں کہ آپ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشن کے لئے، خود آگاہی کے لئے قدم اُٹھایا۔ بالخصوص خواتین سے میری گزارش ہے کہ خود آگاہی اور روحانی علوم سے بہرہ مند ہو کر بہترین مائیں بن کر اولاد کی بہترین تربیت کریں تاکہ معاشرہ میں زندہ افراد پیدا ہوسکیں اور اللہ کی طرزِ فکر معاشرے میں عام ہو سکے۔ (آمین)

السلام علیکم!

☆.....☆.....☆

کتاب ''محمد الرسول اللہؐ'' کی تقریبِ رُونمائی سے خطاب

۱۳ اکتوبر ۱۹۹۸ء بمقام آواری ہوٹل لاہور میں ممتاز بین الاقوامی روحانی اسکالر جناب خواجہ شمس الدین عظیمیؔ صاحب کی تالیف ''محمد رسول اللہؐ'' (جلد اوّل اور دوم) کی تقریب رُونمائی منعقد ہوئی۔ اس تقریب کا اہتمام انتظامیہ مراقبہ ہال لاہور نے کیا۔ اس تقریب کی صدارت جسٹس غلام محمود قریشی نے کی۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض طاہر جلیل نے انجام دیئے۔ تقریب کا آغاز محمد عزیر نے باقاعدہ تلاوت کلام پاک سے کیا۔ طاہرہ گل نے خوبصورت انداز سے دُرود پاک پڑھتے ہوئے نعت پیش کی۔ نعت کے دوران کتاب کی رونمائی کا فیتہ صاحب کتاب خواجہ شمس الدین عظیمی نے کاٹا۔ کتاب محمد رسول اللہﷺ جلد اول اور جلد دوم کو نہایت خوبصورت طریقے سے پیک کیا گیا تھا اور تازہ پھولوں کی سجاوٹ کی گئی تھی۔ فیتہ کٹنے کے بعد چاروں جانب پھول بکھر گئے اور پھولوں میں سجی ہوئی کتابیں برآمد ہوئیں۔ اس دوران اشفاق احمد اور جسٹس غلام محمود قریشی، صاحب کتاب خواجہ شمس الدین عظیمی کے ساتھ تھے۔ کتابوں کی سجاوٹ کو بہت پسند کیا گیا بعد میں پردہ کھینچ کر کتاب کے ٹائٹل کو نمایاں کیا گیا جو کہ ایک بڑے سے بورڈ پر بنایا گیا تھا رونمائی کے اس انداز کو سب نے بہت پسند کیا اور کہا اس سے پہلے کتاب کو اس خوبصورت انداز میں کبھی نہیں پیش کیا گیا۔ دیگر مہمانانِ گرامی کے نام یہ ہیں سردار اقبال موکل، ڈاکٹر مسکین علی حجازی، طاہرہ گلزار، سید ساجد علی شاہ، اشفاق احمد۔

اشفاق احمد نے کتاب کے بارے میں تعریفی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب پڑھ کر مجھے بہت روحانی سکون ملا۔ اشفاق صاحب نے بسم اللہ اور دُرود پاک سے آغاز کیا آپ نے فرمایا جب کوئی بڑی کتاب پیش نظر ہو تو بڑی بات کہنی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ ایسی کتاب کو میں اونچے میز پر رکھ کر اس کے گرد سفید کبوتر کی طرح رقص تو کر سکتا ہوں اور کچھ نہیں۔

محمدؐ رسول اللہؐ جلد اول پڑھ کر دل شکن حالات کا مقابلہ کر کے ''توحید'' پر قائم رہنے کا جرات مندانہ حوصلہ

پیدا ہوتا ہے۔ اُسوۂ حسنہ پر عمل کرنے اور اپنی روح کا عرفان حاصل کرنے کے لیے عزم و ہمت کے چراغ جل اٹھتے ہیں۔ ایک مرکز ''توحید'' منزل بن جاتی ہے۔

آپ نے کہا کہ یہ کتاب اس عہد کے قاری کو بڑی تقویت اور آسانیاں فراہم کرتی ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ عظیمی صاحب نے ایک خادم کی حیثیت سے جس آقا کے بارے میں کچھ عرض کیا ہے یہ اُن کو جانتے ہیں۔

تقریب کے آخر میں خواجہ شمس الدین عظیمی نے تقریب کی تعریف کرتے ہوئے کہا آج یہاں اتنا اچھا ڈسپلن دیکھ کر اور مقررین کا کتاب کے بارے میں تاثرات سن کر میں سُرخرو ہوگیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اور سیّدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے میری محنت کو قبول فرما کر مجھے عزت بخشی۔

سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد سورہ حشر کی آخری آیات تلاوت کی گئیں۔

ان آیات کے بعد مرشدِ کریم نے خطاب کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

السلام علیکم!

میرے بچو، بزرگو، بھائیو، اور بہنو، آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو کہ آج ہم سیّدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مشن کی پیش رفت میں ایک اہم سنگِ میل عبور کر چکے ہیں۔ جس کے نتیجے میں آج کتاب ''محمدؐ الرسول اللہؐ'' کی تقریب رونمائی منعقد کی جارہی ہے۔

میں آپ سب کا بہت شکر گزار ہوں اور آپ سب کے لئے دعا گو بھی ہوں کہ سیّدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ طیبہ کے اہم گوشے عیاں ہورہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سیرتِ طیبہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)۔

میں جنابِ مہمانِ خصوصی جسٹس غلام محمود قریشی صاحب کا، ہمارے ادب کا سرمایہ جناب محترم اشفاق احمد صاحب اور میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب کا خصوصی شکر گزار ہوں جنہوں نے مشن کی پیش رفت میں میری ہم نوائی میں اس محفل کو رونق بخشی اور اس پروگرام کو کامیاب کرنے کی بہترین سعی کی۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کے صدقے ان پر اپنا خصوصی فضل و کرم فرمائے۔ آمین۔

کتاب ''محمدؐ رسول اللہؐ'' کی رونمائی ہونا، اس کا لکھائی سے لے کر زیورِ طبع تک سے آراستہ ہونا دراصل اللہ کے فضل و کرم اور حضورؐ کے وسیلے سے میری دعاؤں کا نتیجہ ہے اور میرے مرشد کا خصوصی کرم ہے۔ میری بڑی دلی خواہش تھی کہ میں حضور نبی کریمؐ کی حیاتِ طیبہ کے وہ گوشے عیاں کروں جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکے۔ یہ

دراصل نبی کریمؐ کے مشن کی پیش رفت میں، وقت کے سمندر میں ایک کنکر ہے۔

سیرت طیبہ لکھنے کے لئے میں نے اس خیال پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میں جتنا بھی غور کرتا گیا۔ پریشان ہو گیا کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ پر دفاتر کے دفاتر لکھے جا چکے ہیں مگر ہنوز تشنگی پوری نہ ہو سکی ہے۔

میں آخر کیا لکھوں؟

چنانچہ اس خیال پر سوچنا شروع کر دیا۔

جب انسان اپنے آپ پر غور کرتا ہے۔ خود کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ماضی، حال، مستقبل کا تذکرہ کرتا ہے تو یہ بات نظر آتی ہے کہ انسان ایک کھلونا ہے۔ وقت اس میں چابی بھر دیتا ہے۔ جب تک کھلونے میں چابی رہتی ہے کھلونا چلتا، پھرتا، کودتا اور حرکت کرتا رہتا ہے۔ جب کھلونے میں چابی ختم ہو جاتی ہے تو اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ آج کل نئے نئے کھلونے ایجاد ہو گئے ہیں مگر آپ نے غور کیا ہو گا کہ جب تک ان میں چابی نہ ہو کھلونے میں حرکت زیرِ بحث نہیں آتی۔ یہی صورت انسان کی بھی ہے جب تک اس میں چابی، توانائی یا انرجی موجود رہتی ہے اس میں حرکت موجود رہتی ہے۔ لیکن جب یہ چابی ختم ہو جاتی ہے تو انسان بھی چابی کے کھلونے کی طرح ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی کھلونوں میں نہ چابی نظر آتی ہے، نہ چابی دینے والا نظر آتا ہے اور نہ ہی چابی کا کوئی سرا انسان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہے چابی کم یا زیادہ کر سکے لیکن یہ بات طے ہے کہ انسانی کھلونا چابی کے بغیر نہیں چل سکتا اور کوئی فردِ واحد بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ انسانی کھلونے میں خاص بات یہ ہے کہ اسے بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتا ہے جب پیاس لگتی ہے تو پانی پیتا ہے۔ اس کے اندر جذبات و احساسات پیدا ہوتے ہیں تو تقاضہ بن جاتے ہیں۔ وہ کبھی غمگین ہو جاتا ہے، کبھی خوش ہو جاتا ہے، کبھی امیر ہو جاتا ہے، کبھی فقیر اور کبھی بادشاہ بن جاتا ہے مگر غور کیجئے فقیری، امیری، غمی اور خوشی سب اسی وقت تک ممکن ہوتا ہے جب تک کہ انسان کے اندر چابی بھری رہتی ہے۔ یہ چابی نظر نہیں آتی۔ اس نظر نہ آنے والی چابی کا نام انسان نے خیال رکھ دیا ہے"۔

خیال آئے بغیر کوئی عمل کیا جا سکتا ہے..............؟ خیال آئے بغیر کوئی عمل بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جب خیال آتا ہے تو آدمی کھاتا پیتا، محنت مزدوری اور شادی کرتا ہے۔ دنیا کی چھ ارب آبادی کا ہر فرد یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ کسی بھی عمل کے بارے میں اگر خیال نہ آئے تو آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ جب تک کسی عمل کے بارے میں خیال نہیں آئے گا وہ کام ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ خیال کے بغیر کھا پی نہیں سکتے، دفتر اور اسکول نہیں جا

سکتے۔ یہ ہماری زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے کہ خیال کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ خیال کیا ہے اور خیال کہاں سے آتا ہے؟ ہم نے اتنی بڑی حقیقت کو کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ لاعلمی کا ایک بحر ذخار ہے۔ انسان بے بس ہے اور عقل وشعور کو اس کا سرا ہاتھ نہیں آتا کہ خیال کہاں سے آیا اور خیال درحقیقت کیا ہے؟

گذشتہ دنوں اس طرح کی باتیں سننے میں آئیں کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ عظیمی صاحب نے کتابیں تحریر کر دیں، کچھ حضرات نے کہا عظیمی صاحب تیس سال سے خدمتِ خلق کر رہے ہیں، کچھ نے کہا عظیمی صاحب نے اتنے ہزار مضامین تحریر کر دیئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عظیمی صاحب کو اگر خیال ہی نہ آتا تو وہ کیا کرتے۔ عظیمی صاحب نے جو چند کتابیں تحریر کردی ہیں اگر تحریر کرنے کا خیال ہی ذہن میں وارد نہ ہوتا تو کتاب تو درکنار ایک سطر لکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں آدمی کی حیثیت کچھ نہیں ہے۔ قدرت جس سے جو کام لینا چاہتی ہے اس کام کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے خیال کی ترسیل شروع ہو جاتی ہے کہ اُسے ہسپتال بنانا ہے، مسجد، گھر یا سینما بنانا ہے۔ خیال کو وصول کرنے میں انسان کی اپنی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔ پیدائش کے مرحلہ پر غور کیجئے کسی کو اس بات کا اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کہاں پیدا ہو، غریب کے گھر یا بادشاہ کے ہاں..... اگر اختیار ہوتا تو ہر شخص بادشاہ کے گھر ہی پیدا ہوتا غریب تو بے اولاد ہی رہ جاتا۔ یہ بھی اختیار نہیں ہے کہ مسلمان پیدا ہونا ہے، یہودی یا انگریز۔ یا دنیا کے کس خطہ میں پیدا ہونا ہے ہندوستان میں یا امریکہ میں۔ اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا کہ یہاں کوئی حرکت اپنی ذاتی نہیں ہے بلکہ خیال پر قائم ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خیال کیا ہے اور کہاں سے آتا ہے خیال کو اطلاع یا Information بھی قرار دیا جاتا ہے مگر غور کریں یہ تو خیال کے معنی ہوئے کہ اس کو اطلاع کہہ دیا لیکن خیال کیا ہے اس کا جواب نہیں ہے۔

جتنا بھی آپ غور کریں تفکر کریں تو اس تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ پوری کائنات اسٹیج ڈرامہ کی طرح ہے۔ اس ڈرامہ میں کردار متعین ہیں۔ ایک آدمی نماز پڑھتا ہے، دوسرا نماز نہیں پڑھتا تیسرا سینما دیکھتا ہے۔ دراصل ساری کائنات گروہی سسٹم میں بندھی ہوئی ہے اور گروہی سسٹم خیالات کے تابع ہے۔ کسی شخص کو تعمیر کا خیال آتا ہے تو کسی کو تخریب کا۔ ایک آدمی تخریب کے خیال کو رد کر کے تعمیر کو قبول کر لیتا ہے تو دوسرا تعمیری خیال کو رد کر کے تخریبی خیال قبول کر لیتا ہے۔ غور کیجئے خیال کو قبول کرنا یا رد کرنا بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ کہیں سے کوئی

خیال آئے۔ خیالات کی ترتیب بھی تو آخر خیال ہی ہے۔ ایک آدمی سینما میں فلم دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا۔ راستے میں اذان کی آواز آئی اس کو خیال آیا چلو نماز پڑھ لیں۔ ایک آدمی مسجد کی طرف چلا راستے میں دوست مل گیا۔ خیال آیا کیا نماز پڑھنا سینما چلتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سینما جانے والا آدمی مسجد کیوں گیا اور مسجد جانے والا آدمی سینما کیوں چلا گیا۔ صورتحال یہ ہے کہ آدمی کی حیثیت نفی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کوئی کتاب تحریر کرنی ہے۔ برابر یہی خیال آتا رہا۔ آخر کاغذ قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔ دماغ میں خیالات کی نہ جانے کس طرح ترتیب پیدا ہوگئی اور میں لکھتا ہی چلا گیا کہ نہ ہاتھ دُکھتا نہ دماغ تھکتا۔ کچھ عرصہ بعد دیکھا تو کتاب بن گئی۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ لکھنے کا پہلا عمل خیالات سے براہِ راست قائم تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے جسے مستقل چلانے کے لئے اللہ نے انسپائریشن کا ایک نظام بنایا ہے۔ انسپائریشن کا نظام بتاتا ہے کہ یہ کرو وہ نہ کرو۔

اسی انسپائریشن کے نظام کے تحت۔ اس عاجز بندے کو زندگی کا ایک مقصد نظر آیا۔ ہوا یوں مقصد زندگی سے واقف ایک بزرگ ہستی کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ اس بزرگ ہستی نے بتایا کہ انسان آدم کا بیٹا ہے اور قانون یہ ہے کہ باپ کی وراثت بیٹے کو منتقل ہوتی ہے۔ آدم کی خلافت وہ علوم ہیں جو کائنات میں آدم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور ان ہی علوم کی بنا پر نیابت وخلافت کا شرف آدم کو حاصل ہے۔ آسمانی کتابوں اور آخری کتاب قرآن میں ان علوم کو ''علم الاسماء'' کہا گیا ہے۔ علم الاسماء میں تخلیقی راز و نیاز، فنا و بقا کے مرحلے، حیات بعد از موت، حشر ونشر، جنت دوزخ اور دونوں جہاں (دنیا و آخرت) میں پرسکون رہنے کے آداب اور طریقے موجود ہیں۔ ان طریقوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اور کائنات کے خالق کو پہچانے، بندے کو قادرِ مطلق رحمٰن ورحیم اللہ کا عرفان حاصل ہو۔ اگر اللہ کو کسی بندے نے نہیں جانا یا اللہ کی نشانیوں پر غور کر کے اللہ کی پھیلائی ہوئی آسمانی و زمینی آرائش کا مطالعہ نہیں کیا تو اس بندے نے زندگی کے مقصد سے انحراف کیا اور زندگی کے مقصد سے انحراف کرنے والا آدم کا بیٹا کبھی آدم کا وارث نہیں ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں!

''اور ہم نے آسمان کو بروج سے زینت بخشی دیکھنے والوں کے لئے...... اور چھپا لیا ہم نے اس خوبصورت آرائش اور زینت کو شیطان مردود سے''۔

قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ قرآن ہر بات کو کھول کر اور واضح کر کے بیان کرتا ہے تاکہ نوعِ انسانی کا کوئی گروہ ایسا نہ ہو جو کہے کہ ہمیں بات سمجھ میں نہیں آئی۔

قرآن پاک میں یہ بھی ارشاد ہے۔

''پس خرابی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں''۔

یعنی نماز تو وہ پڑھتے ہیں لیکن انہیں نماز میں حضوری قلب نہیں ہوتا۔

اس رہنما بزرگ ہستی کے ان کلمات نے قلب پر اثر کیا اور زندگی کا نہج بدل گیا۔ تلاش و جستجو کے جذبات گہرے ہو گئے۔

اس تلاش میں یہ عقدہ کھلا کہ زندگی کا مقصد ''عرفان الٰہی'' اس وقت نصیب ہوتا ہے جب اسوہ رسول ﷺ پر عمل کرنے کی توفیق ملے۔، رہنما ہستی نے اس کا طریقہ یہ بتایا کہ رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام کی کثرت اللہ کے محبوب سے ملاقات کا شرف عطا کرتی ہے۔ ہمت جوان تھی، شوق و جذبہ بھرپور تھا، عقیدت کا سمندر موجزن تھا، پشت پر ہادی و رہنما کا ہاتھ تھا، دل میں گداز تھا، آنکھوں میں نمی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی شامل حال تھی۔ امتی ہونے کی وجہ سے حضور ﷺ کی نسبت حاصل تھی کہ توفیق مل گئی۔

طریقہ کار یہ طے ہوا کہ عشاء کی نماز کے بعد سے صبح صادق تک درود شریف پڑھا جائے۔ مرشدِ کریم قلندر بابا اولیاءؒ کی نسبت، رسول ﷺ کی رحمت، اللہ تعالیٰ کی عنایت اور میرے والدین کی دعا نے اثر دکھایا۔ ایک دن خواب دیکھا کہ

میں سراپا تقصیر بندہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کا محتاج اور اللہ کی بے پایاں رحمتوں کا طلبگار...... دربارِ رسالت ﷺ میں ایک فوجی کی طرح Attention جانثار غلاموں کی طرح مستعد، پرجوش اور باحمیت نوجوان کی طرح آنکھیں بند کئے دربار میں حاضر ہوں۔ آہستہ روی کے ساتھ عشق و سرمستی کے خمار میں ڈوب کر دو قدم آگے آیا۔ عرض کیا!

''یا رسول اللہ ﷺ! بات بہت بڑی ہے۔ منہ بہت چھوٹا ہے۔ میں اللہ رب العالمین کا بندہ ہوں اور آپ ﷺ رحمت اللعالمین کا امتی ہوں۔ یہ جرأت بے باکانہ نہیں، ہمتِ فرزانہ ہے۔ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں۔ یا رسول اللہ ﷺ! یہ عاجز، مسکین، ناتواں بندہ آپؐ کی مبارک سیرت لکھنا چاہتا ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ! سیرت کے وہ پہلو نوعِ انسانی کے سامنے آجائیں جو ابھی تک مخفی ہیں۔ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے صلاحیت عطا فرما دیجئے کہ میں

معجزات کی تشریح کر دوں"۔

میں نے بند آنکھوں سے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے میری درخواست قبول فرمالی ہے چہرہ انور پر مجھ عاجز بندے کو مسکراہٹ نظر آئی۔

میں اس سرمستی میں سالوں مدہوش رہا، خیالوں میں مگن گھنٹوں تحریریں لکھتا رہا۔ ہر وہ کتاب جو سیرت سے متعلق مجھے دستیاب ہوئی اللہ نے پڑھنے کی توفیق عطا کی اور بالآخر ایک دن ایسا آیا کہ قبولیت کی گھڑی آ گئی اور مجھ جیسے عاجز مسکین بندے نے محمد رسول اللہ ﷺ جلد اول لکھنی شروع کر دی۔

الحمد للہ! محمدؐ رسول اللہ ﷺ جلد اول اور جلد دوئم جلوہ گر ہے۔ بہت جلد اس کے بعد کتاب محمدؐ رسول اللہ ﷺ جلد سوئم جلوہ نما ہوگی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ اپنے برگزیدہ بندوں پیغمبرانِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان میں مجھ عاجز مسکین کی مدحت کو قبول فرمائے اور یہ کتاب میرے بچوں اور میرے لئے توشہ آخرت بنے۔ آمین یا رب العالمین۔

کتاب محمدؐ الرسول اللہ ﷺ جلد اوّل میرے اس خیال کا مظاہرہ ہے جس خیال کو میں نے یقین کے ساتھ قبول کر کے اس پر کوشش اور جدوجہد کرنا شروع کی تھی۔ جس کے نتیجے میں آج ہم اس کتاب کی تقریب رونمائی کر رہے ہیں۔

میرے اوپر جو انعامات واکرامات ہیں وہ بڑے عجیب ہیں۔ یہ کتاب "محمدؐ رسول اللہ ﷺ" اسی دعا کی قبولیت کا مظہر ہے۔ شرک کو ختم کرنے، توحید کو عام کرنے کے مشن میں شرک کے نمائندوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کیں لیکن اللہ کے رسول محمد ﷺ ہر قسم کے مشکل حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے نوع انسانی کو مرکزِ توحید کی طرف بلانے میں مصروف رہے۔

پیر و مرشد حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا۔ "ساری کائنات یقین کے اوپر قائم ہے۔ انسان جب کسی بات کا یقین کر لیتا ہے اور اس یقین کو بار بار دہراتا ہے بار بار دہراتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اس یقین کا مظاہرہ لازماً ہوتا ہے"۔

لوحِ محفوظ کے قانون کے مطابق ہم اس لئے زندہ ہیں کہ زندہ رہنے پر ہمارا یقین ہے۔ جب زندگی کی خواہش بدل کر ہوا میں معلق ہو جاتی ہے آدمی موت کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا جب آدمی بوڑھا

ہو جاتا ہے تو کہتا ہے اب آخری وقت ہے دعا کرو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟..... دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس آدمی میں زندہ رہنے کے یقین کے اندر اب شگاف پڑ گیا ہے۔ قانون یہ ہے کہ اگر آپ کسی بات پر جم جائیں اور اس کو بار بار دہرائیں اور اتنا دہرائیں کہ آپ کے شعور سے وہ بات نکل کر لاشعور میں داخل ہو جائے تو لازماً اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کے تصرّف کا طریقہ بھی یہی ہے۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ ایسا یقین پیدا کر دیتا ہے کہ جب وہ کوئی بات کہتے یا سوچتے ہیں تو لوحِ محفوظ کے قانون کے مطابق اس کا مظاہرہ ہو جاتا ہے۔

اس یقین کی بنیاد پر آج ہم نبی کریمؐ کے مشن میں کتاب محمدؐ الرسول اللہ ﷺ کے ذریعے نوعِ انسانی کو آپؐ کے پیغام سے آگاہ کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔

زمین کے اندر جتنی مخلوقات ہیں، اُن پر غور کرنے سے ہمیں اس بات کا علم حاصل ہوتا ہے کہ یہاں کوئی ایک بھی مخلوق ایسی نہیں ہے جو علم نہ رکھتی ہو۔ مثلاً پرندوں کو اس بات کا علم ہے کہ پیاس لگتی ہے اور پانی پینے سے پیاس بجھ جاتی ہے۔ چوپایوں کو اس بات کا علم ہے کہ بھوک لگتی ہے اور کچھ کھانے سے بھوک رفع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح درختوں کو بھی اس بات کا علم حاصل ہے کہ اگر اُنہیں پانی میسّر نہ آئے اور درختوں کی جڑیں پانی سے سیراب نہ ہوں تو درخت سوکھ کر مُرجھا جاتے ہیں، اب اس بات کو یوں کہا جائے گا کہ کائنات میں جتنی بھی موجودات ہیں، چھوٹی سے چھوٹی مخلوق ہو مثلاً چیونٹی یا بڑی سے بڑی مخلوق مثلاً اونٹ یا ہاتھی... ہر مخلوق کو اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کا علم حاصل ہے۔ اُنہیں اس بات کا بھی ادراک حاصل ہے کہ ہم ایک مخلوق ہیں۔ مثلاً اونٹ اس بات سے واقف ہے کہ وہ اونٹ ہے، بھینس اس بات سے واقف ہے کہ وہ بھینس ہے۔ اگر بھینس اس بات سے واقف نہ ہو کہ وہ بھینس ہے تو وہ اپنے گروپ میں جا کر نہیں بیٹھے گی۔ فرض کریں کسی جگہ بہت ساری بھیڑیں جمع ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں...... اور قریب ہی دس پندرہ بکریاں بھی ہیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ بھیڑ، ہمیشہ بھیڑوں میں جا کر بیٹھتی ہے اور بکری بکریوں میں جا کر بیٹھتی ہے... کیوں؟..... اس لئے کہ بکری کو اپنے بکری ہونے کا علم حاصل ہے اور بھیڑ کو اس بات کا ادراک ہے کہ میں بھیڑ ہوں۔ تب ہی وہ بھیڑوں میں جا کر بیٹھتی ہے.... اور جب علم کی بات آتی ہے تو اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کا علم تو ہر مخلوق ہی جانتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔

''میں نے انسان کو وہ علوم سکھا دیئے جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

یہ بہت زیادہ غور طلب بات ہے کہ وہ کون سے علوم ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو سکھائے۔ علم تو سب ہی کے پاس ہے۔ چیونٹیوں میں بھی علم ہے۔ تمام جاندار حتیٰ کہ بے جان اشیاء میں بھی علم ہے۔ پھر وہ کون سا علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ انسان کو سکھایا؟......

یہ وہ علوم ہیں جو اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو سکھائے۔ آپ غور کیجئے!...... جتنی بھی مخلوقات ہیں ان میں کوئی پیغمبر نہیں ہوتا۔ اگر کسی مخلوق میں پیغمبر ہوتے ہیں تو صرف انسانوں میں...... لہٰذا اب انسان کی دو مختلف قدریں ہمارے سامنے ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک قدر یہ ہے کہ آدمی اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ بھیڑ کو بھی پیاس لگتی ہے تو آدمی کو بھی پیاس لگتی ہے۔ آدمی کو بھی سردی لگتی ہے اور کبوتر کو بھی سردی لگتی ہے، کبوتر بھی آدمی کی طرح سردی سے بچاؤ کی کوشش کرتا ہے۔ آدمی کی سوچ اور حیوانوں کی سوچ برابر برابر ہے۔ ایک بلی کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کے بچے پیدا ہوں، انسان کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ میرے بچے پیدا ہوں۔ بلی بھی اپنے بچوں کی رکھوالی کرتی ہے، اُن کی حفاظت کرتی ہے اور اُن کو زندگی میں جدوجہد کی تعلیم دیتی ہے، شکار کرنا سکھاتی ہے۔ انسان بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کرتا ہے۔

یعنی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر پیغمبروں کا علم انسان کو حاصل نہیں ہے تو وہ حیوانات کی صف سے باہر نہیں نکل سکتا۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو وہ خاص علم سکھا دیا جو دوسری کسی مخلوق کے پاس نہیں ہیں اور اگر انسان وہ خصوصی علم نہیں سیکھتا تو اُس کی حیثیت حیوانات سے کسی بھی طرح ممتاز نہیں ہے۔

پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے زیادہ ہو، ہوسکتا ہے کم ہو۔ ایک تسلسل کے ساتھ پیغمبر آتے رہے...... آپ جب پیغمبروں کی تعلیمات پڑھیں گے تو آپ کو کہیں نہ کہیں، ایک دو، دس بیس جگہ یہ ضرور لکھا ہوا ملے گا کہ ہمارے بعد ایک نجات دہندہ آئے گا۔ بالآخر سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے۔ ساری باتیں حضور ﷺ نے وہی فرمائیں جو دیگر پیغمبران علیہم السلام آپ ﷺ سے پہلے کہہ چکے تھے۔ لیکن ایک تسلسل یہ قائم رہا کہ ہمارے بعد ایک اور نجات دہندہ آئے گا۔ لیکن حضور ﷺ نے وہ بات نہیں فرمائی، حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ اب میرے بعد اور کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور اس کی تصدیق قرآن پاک سے اس طرح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

حضرت ابراہیمؑ سے پیغمبرانہ تعلیمات رسول اللہ ﷺ تک مسلسل اور تواتر کے ساتھ جاری رہیں تمام پیغمبروں نے نوعِ انسانی کو یہی پیغام پہنچایا کہ اللہ ایک ہے..... حضرت محمدؐ الرسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا نچوڑ بھی یہی ہے کہ اللہ کو ایک مانو. ...

ہمارے اندر اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ ہمارا خالق و مالک اللہ ہے، پیدا بھی اللہ کرتا ہے، حیات بھی اللہ عطا کرتا ہے اور موت بھی اللہ دیتا ہے..... یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو آپ کا ذاتی شعبہ ہو..... مثلاً ہم کھا پی کر ہی جوان ہوتے ہیں..... سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھوک ہی نہ لگے تو ہم کھائیں گے کیسے؟..... نیند نہ آئے تو آدمی سوئے گا کیسے؟..... نیند سے بیدار نہ ہو تو آدمی اپنے اختیار سے جاگ ہی نہیں سکتا..... اپنی زندگی کا جب ہم محاسبہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہی بات آتی ہے کہ ہم سو فیصد حالتِ مجبوری میں ہیں..... ہمیں کوئی بھی اختیار کسی بھی صورت میں حاصل نہیں..... مثلاً ہم اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہو سکتے، اتنی بھی چوائس ہمارے پاس نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ اللہ میاں! ہمیں کسی بادشاہ کے گھر پیدا کر دے، ہم غریب کے ہاں پیدا نہیں ہونا چاہتے..... پیدائش کے بعد آپ کی زندگی کتنی ہے؟..... وہ بھی اللہ جانتا ہے..... دس سال کی ہو، پچاس سال کی ہو، ہوسکتا ہے آپ سو سال زندہ رہیں..... آپ جوان ہوتے ہیں آپ کو جوان ہونے میں کیا کرنا پڑتا ہے؟..... اور اگر آپ کھا پی کر، کھیل کود کر جوان ہو جاتے ہیں تو پھر بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں؟..... جوانی میں آپ نے کھایا پیا، ورزش کی، حفظانِ صحت کا خیال رکھا، کراٹے سیکھے..... یہ سیکھا وہ سیکھا چنانچہ آپ کے اعصاب مضبوط ہو گئے..... اس لئے جوان ہو گئے!..... لیکن پھر بوڑھے کیوں ہو گئے؟..... دنیا کا کوئی آدمی خوشی سے بوڑھا نہیں ہونا چاہتا..... جو آدمی بوڑھا ہونا چاہتا ہے وہ ہاتھ اُٹھائے..... کیوں جی!..... کوئی بوڑھا نہیں ہونا چاہتا؟..... تو پھر بتایئے آپ بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں؟..... بچپن سے گزر کر آپ جوانی کے سسٹم میں آ جاتے ہیں اور جوانی سے گزر کر آپ بڑھاپے کے سسٹم میں چلے جاتے ہیں، اچھا یہ بھی ضروری نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو کر ہی مرے..... جوان بھی مر جاتے ہیں اور بچے بھی مر جاتے ہیں۔

انسان درو بست اللہ کے نظام میں بندھا ہوا ہے اور یہی تمام پیغمبروں کی تعلیمات ہیں۔ جب کوئی بندہ پیغمبرانہ علوم حاصل کرتا ہے۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ کے نور سے اُسے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ برملا کہتا ہے کہ میں دیکھتا ہوں ہمہ وقت، یہاں ہر چیز منجانب اللہ ہے، ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے..... ہمارا جینا مرنا، سانس

لینا، کھانا پینا سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے......

پیغمبرانہ تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی طرزِ فکر قائم ہو جائے کہ انسان ہمہ وقت اللہ کی طرف متوجہ رہے، وہ کچھ بھی کرے Care of Allah کرے۔ پیغمبر آخر الزماں سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ انسان کا ذہن اِس طرح بنا دیا جائے کہ وہ کوئی بھی کام کرے پہلے اُس کا ذہن اللہ کی طرف جائے پھر کام کی طرف... مسلسل اس مشق سے وہ بندہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور اُس کے اوپر سے خوف و غم ختم ہو جاتا ہے۔ جب خوف و غم ہی ختم ہو گیا تو زندگی جنت کے سوا اور کیا ہو گی؟......

آدم و حوا کا پہلا مسکن جنت ہے!......

جنت ایک ایسی اسپیس Space پر آباد ہے جہاں مکانات عالیشان محلات نہریں مرغزار...... نیلے پیلے اودے پیراہن سے آراستہ پھولوں کے تختے...... خوبصورت لان...... حور غلمان...... پھلدار اور سایہ دار درخت ہیں...... باغات، پانی سے اُبلتے فوارے، کل کل کرتے جھرنے اور آبشاریں، ندی نالے، دریا، گلستان و نخلستان......

یہ سب چیزیں ہماری زمین پر بھی موجود ہیں......

زمین ایک اسپیس Space ہے!...... اسپیس Space کا مطلب ہے بہت بڑی جگہ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر دینا......

جب ہم اپنی زمین کا تذکرہ کرتے ہیں تو زمین سے مُراد کوئی ایک ملک یا کسی ملک کے کئی شہر مراد نہیں ہوتے......

زمین سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اتنا بڑا رقبہ کے جو اعداد و شمار میں نہ آئے......

ہماری زمین کے اعداد و شمار جو بھی بیان کئے جاتے ہیں...... زمین کا وہ حصہ ہے جو معلوم زمین ہے!......

بتایا جاتا ہے کہ زمین پر تین حصے پانی ہے، ایک حصہ خشکی ہے...... زمین کی یہ صورت بھی نظر آتی ہے کہ زمین کے اوپر کنڑوں یا چھلوں کی شکل میں پہاڑ ایستادہ ہیں اور اُن پہاڑوں کے درمیان خالی جگہ Vallies، ملک، شہر اور محلوں میں تقسیم ہوتی ہے۔

زمین کا رقبہ جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ محض قیاس پر مبنی ہے...... زمین کا پورا ناپ تول ابھی تک ممکن نہیں ہوا...... سائنسی ترقی کے اِس دور میں بھی ایسے علاقے ہیں جو ابھی دریافت نہیں ہوئے اور اُن علاقوں کو Uncivilized

کہا جاتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ زمین واحد سیارہ ہے جس پر زندگی کے آثار نظر آتے ہیں، جبکہ ایسا نہیں ہے!...... ہر سیارے پر آبادیاں ہیں...... بالکل اسی طرح جیسے ہماری زمین آباد ہے......

ہر سیارے کی زمین پر چاند، سورج، ستارے اور کہکشائیں نظر آتی ہیں......

ہم شعوری طور پر مانتے ہیں کہ آکسیجن پر زندگی کا دارومدار ہے!......

جبکہ یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی......

عقل رہنمائی کرتی ہے کہ ایک گھر میں چھ آدمی ہیں اور یہ چھ آدمی آکسیجن کے اوپر زندہ ہیں...... لیکن ہوتا یہ ہے کہ اُن چھ آدمیوں میں سے ایک آدمی کا انتقال ہو جاتا ہے...... اگر ہم گھر کو ایک غبارہ سمجھ لیں اور اُس غبارے کے اندر کلیتاً آکسیجن کا عمل دخل مان لیں تو یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ غبارے میں آکسیجن موجود ہے...... غبارے میں آکسیجن موجود ہونے کے باوجود پانچ آدمی زندہ رہتے ہیں اور ایک آدمی مر جاتا ہے...... اگر زندگی کا دارومدار آکسیجن پر نہیں ہے تو آکسیجن ایک آدمی کے لئے کیوں زندگی کا سہارا نہیں بن رہی؟...... باقی پانچ آدمی آکسیجن سے کیوں مستفید ہو رہے ہیں؟......

اور آکسیجن کے ذریعے مرنے والے فرد کو زندہ کیوں نہیں کر لیا جاتا؟......

جس طرح زمین پر حیات و ممات ہے...... اِسی طرح دوسرے سیاروں میں بھی موت اور زندگی کا سلسلہ جاری ہے......

ہماری زمین پر بلڈنگیں تعمیر ہوتی ہیں، کھیتی باڑی ہوتی ہے، فیکٹریاں لگتی ہیں، ہوائی جہاز اُڑتے ہیں، بڑے بڑے پانی کے جہاز سمندر کی سطح پر تیرتے ہیں...... بادبانی کشتیاں سمندر کی منہ زور لہروں کا مقابلہ کر کے سفر کرتی ہیں......

اسی طرح دوسری دنیاؤں میں بھی سب کچھ ہو رہا ہے......

زمین جس طرح سے بھی بنی لیکن زمین کے اوپر فضا اور زمین کے اندر موجود تہوں میں بے شمار گیسز Gasses کام کر رہی ہیں...... دوسرے سیاروں کا بھی یہی حال احوال ہے......

زمین کی ایک خصوصیت ہے...... وہ خصوصیت یہ ہے کہ زمین اپنے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے ...... تزئین و آرائش کے لئے اپنے اندر سے تخلیق کرتی ہے...... اس تخلیق میں رنگینی ہے...... کائنات میں نافذ تخلیقی قانون کے

مطابق زمین پر کوئی ایک شے ایسی نہیں ہے جو بے رنگ ہو... کھیت کھلیان دیکھئے تو وہاں رنگ ہیں..... پھول پھلواری پر توجہ کیجئے!......رنگ رنگ......سینکڑوں رنگ ہیں...... درخت کے سراپا پر نظر ڈالئے... درخت میں ہر چیز رنگین ہے.... درخت کی جڑوں کا رنگ الگ ہے... تنے کا رنگ الگ ہے..... درخت کے لباس کا رنگ الگ ہے ....لباس سے مُراد درخت کی چھال ہے.... پتوں کا رنگ الگ ہے..... درخت میں لگے ہوئے پھولوں کا رنگ منفرد ہے.... اور درخت میں لگنے والے پھل بھی بے رنگ نہیں ہوتے..... یہ رنگینی دراصل زمین کی زیبائش ہے.... اس زیبائش سے مخلوق کو آسائش ملتی ہے...

زمین پر تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار نوعیں آباد ہیں... ہر نوع میں کم سے کم دو سو مخلوقات شمار کی جا سکتی ہیں... اور کتنی زیادہ ہو سکتی ہیں... اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے..... مچھلی ایک نوع ہے....

بہت بڑے ایکیوریم Aquarium کے اندر رنگ رنگ مچھلیوں میں کوئی سُرخ ہے.....کوئی Purple ہے .....مچھلی کی کوئی مخلوق ٹرانسپیرنٹ ہے.... کوئی چھوٹی ہے.....کوئی بہت بڑی ہے......

کوئی مچھلی اتنی بڑی ہے کہ اُس کی خوراک کا ایک لقمہ کئی ہزار مچھلیاں بن جاتی ہیں......

یہی مثال درختوں، پرندوں، چوپایوں کے اوپر بھی صادق آتی ہے....

ہماری زمین! .... کائناتی تخلیقی قوانین کے مطابق دو حصوں میں تقسیم ہے ...

ایک حصہ وہ زمین ہے جس پر آدم زاد چلتا پھرتا، سوتا جاگتا اور کھاتا پیتا ہے......

زمین کا دوسرا حصہ خلاء میں واقع ہے.... خلاء میں واقع زمین بھی ہماری زمین کی طرح ہے..... اس زمین پر جنات کی آبادیاں ہیں..... جنات کی آبادی میں مذکر مونث دونوں افراد ہیں.... نسلی سلسلہ بھی انسانی آبادیوں کی طرح قائم ہے..... جنات کی دنیا میں لہلہاتی کھیتیاں ہیں، باغات ہیں، جمادات، نباتات، معدنیات، دریا، سمندر سب ہیں۔

جنات کی مخلوق انسانوں کی طرح کھاتی پیتی ہے، کاروبار کرتی ہے.... اور اُن کے یہاں سائنسی ایجادات و ترقی کا گراف انسانوں کی ترقی سے زیادہ ہے...

ہم نے بات شروع کی تھی کہ آدم وحوا کا پہلا مسکن جنت تھا..... اور اب بھی ہے......

باشعور انسان اُسے کہتے ہیں جو گرد و نواح کی صورتحال سے واقف ہو..... باشعور انسان وہ ہے جو اپنے آپ سے واقفیت رکھتا ہو.....

ذی شعور اُسے کہا جاتا ہے جو اپنے اندر کی دنیا سے باخبر ہو.....

میرے بچو!.....

یہ ساری تمہید اس لئے ہے کہ ہمیں غور کرنا ہے......

آدم و حوا جب جنت میں رہتے تھے تو اُن میں کون سے حواس یا شعور کام کرتا تھا؟......

اس لئے کہ ہم جنت کے شعور کو رد نہیں کر سکتے!......

جنت!..... ایک لامحدود رقبہ ہے..... علمِ الٰہی سے منکشف ہوتا ہے کہ وہاں باغات ہیں...... انار اور کھجور کے درخت ہیں...... انگور کی بیلیں..... خوشنما قطار در قطار درخت ہیں..... پھولوں کے تختے ہیں..... ایسے پھول جن میں کئی کئی رنگوں کی آمیزش ہے...... ہوا چلتی ہے تو ساز بجتے ہیں..... پھول ہلتے ہیں تو جل بُجھ روشنیوں کا ادراک ہوتا ہے..... خوشبو کا یہ عالم ہے کہ فضا میں سے پھولوں کی مہک گھونٹ گھونٹ اندر اُتر جاتی ہے......

حوریں!..... اتنی خوبصورت ہیں کہ آدمی دیکھ لیتا ہے تو اُس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے......

غلمان!..... عنفوانِ شباب کی مکمل تصویر ہیں......

پانی!..... دودھ جیسا سفید اور میٹھا ہوتا ہے......

شہد!...... شہد کا سنہری پن اور ذائقہ ہماری زمین کے شہد کے ذائقے سے ہزار گنا افضل ہوتا ہے......

جب قطار در قطار درخت، انار، کھجور اور انگور کا تذکرہ آتا ہے تو شعور ایک قدم آگے نہیں بڑھتا...... لیکن وہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ جنت میں شعور اور حواس دونوں موجود ہیں......

اب سوچنا یہ ہے کہ جنت کے شعور سے آدم و حوا کو عارضی محرومی کیوں ہوئی!......

یہ عام بات ہے کہ جب کوئی شخص کسی پر انعام و اکرام کرتا ہے تو اُس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ آدمی انعام و اکرام کرنے والی ہستی کا شکر گزار ہو اور اُس کے احکامات کی تعمیل کرے...... جو ضابطے اُس نے متعین کر دیئے ہیں اُن کی خلاف ورزی نہ کرے......

جنت میں ایسا نہیں ہو سکا...... آدم و حوا کے لئے جو احکامات صادر ہوئے تھے اُن پر عملدرآمد نہیں ہو سکا...... ان احکامات میں بنیادی بات یقین کا درجہ حاصل کرنا تھا..... اور یہ بات ذہن نشین کر دی گئی تھی کہ اگر تعمیل حکم میں سرِ مو انحراف ہوا، چاہے وہ سہواً ہی کیوں نہ ہو..... تو جنت کے شعور پر پردہ آ جائے گا...... جیسے ہی

جنت کے شعور پر پردہ آ گیا...... آدم وحوا کا پہلا مسکن جنت نہیں رہی..... اور لامحدود شعور پر محدود شعور کا غلبہ ہو گیا......

محدود شعور کا مطلب احساسِ محرومی، اضطراب اور گھٹن ہے......

اِس دنیا میں رہتے ہوئے اگر آدم وحوا کی اولاد محدود شعور سے نکل کر جنت کے لامحدود شعور میں داخل ہو جائے تو یہ دنیا اُس کے لئے جنت بن جاتی ہے۔ جتنی دیر اِس دنیا میں قیام رہے گا جنت کی کیفیات اُس کے اوپر غالب رہیں گی......

اور جب اِس دنیا کا سفر ختم ہو گا...... تو جنت کا ابدی سکون اُسے حاصل ہو جائے گا...... انسان اس حقیقت سے واقف ہے کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے کہیں موجود تھا اور جب وہ یہاں پیدا ہو جاتا ہے تو کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا..... بچہ پیدا ہوتا ہے تو پہلے دن سے ہی وہ تغیرات میں ردّ و بدل ہونے لگتا ہے اور چھوٹے معصوم بچے سے وہ دن بہ دن بڑھتا ہوا ایک خوبصورت جوان بن جاتا ہے پھر یہ جوانی بھی چند روزہ ہوتی ہے اور وہ بڑھاپے کی طرف بڑھنے لگتا ہے..... شادی کے بعد ماں اور باپ کی آرزو ہوتی ہے کہ ان کے یہاں اولاد ہو...... یہ آرزو اتنی گہری ہوتی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی خیال ہی نہیں آتا...... اللہ تعالیٰ ماں باپ کی یہ آرزو دیکھ کر ان کے اندر اس تشنگی کو اپنی محبت اور رحمت کے ساتھ دور کرتے ہیں اور انسان کی ابتداء شروع ہو جاتی ہے جو اتنی مختصر ہوتی ہے کہ خوردبین سے ہی دیکھی جا سکتی ہے...... پھر اس نطفے میں اللہ تعالیٰ کا اشارہ ہوتا ہے تو وہ پھٹکی بن جاتا ہے...... اس پھٹکی میں گوشت اور ہڈی بنتی ہے اور اِس پر کھال چڑھائی جاتی ہے پھر اس کے اندر اعضاء پیدا ہوتے ہیں اور اس کی شکل بنتی ہے۔

هُوَالَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ○

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ ماؤں کے پیٹ میں کیسی کیسی تصویریں بناتا ہے......''

ایک مرتبہ میں نے قلندر بابا اولیاءؒ سے عرض کیا...... حضور!...... یہ کیسا سسٹم ہے کہ ماں کے پیٹ میں وہ پھٹکی جس کا کوئی وزن نہیں ہوتا، آٹھ نو پونڈ کا بچہ بن جاتی ہے؟..... حضور قلندر باباؒ کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ جب وہ کچھ سمجھاتے تھے تو شاگرد کے اندر کی آنکھ کھل جاتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ سوئچ آن کر کے فلم چلا دی گئی ہو..... چنانچہ جواب میں اُنہوں نے فرمایا بھی اور دکھایا بھی کہ استقرارِ حمل کے روز سے فرشتوں کی ڈیوٹی شروع ہو جاتی ہے..... فرشتے اس پھٹکی کے اوپر پھونک مارتے رہتے ہیں...... اس پھٹکی کے اندر اضافہ

ہوتا رہتا ہے...... یہ پھٹکی دراصل انسانی خدوخال کا ایک غبارہ ہوتی ہے جو ہوا بھرنے سے مسلسل بڑا ہوتا جاتا ہے اور آنکھ کان ناک سب توازن کے ساتھ بڑھنے لگتے ہیں... اسی طرح فرشتے پھونکیں مارتے رہتے ہیں اور اس سے تغیر ہونے لگتا ہے..... چنانچہ وہ نطفہ جس کا ابتداء میں کوئی وزن نہیں تھا وہ آٹھ نو پونڈ کا بچہ بن جاتا ہے..... اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں کہ میں نے انسان کو گوندھے ہوئے گارے، سڑی ہوئی کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔

پھر اس پتلے کے اندر اپنی روح پھونک دی تو وہ چلنے، پھرنے، بولنے اور دوڑنے لگا......تو انسان کی زندگی اور مسافت کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو اس کا نام تغیر ہے..... پیدا ہونے کے بعد اگر بچے کے اندر تغیر نہ ہو تو بچہ بیٹھ نہیں سکتا...... اللہ تعالیٰ ہمارے بچوں کو صحت و تندرستی عطا فرمائے (آمین)......آپ نے دیکھا ہوگا، سنا تو ضرور ہوگا کہ بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ریڑھ کی ہڈی ہی نہیں ہوتی... ماں باپ انہیں بھی پال ہی لیتے ہیں.... ایک صحت مند بچے کے اندر تغیر ہوتا ہے تو وہ بیٹھنے لگتا ہے.. گھٹنوں پر چلنے لگتا ہے .. انتہا یہ کہ پیروں سے چلنا شروع کر دیا، مزید بڑا ہوا تو دوڑنے لگا یہاں تک کہ نشوونما کے بعد جوان ہو گیا پھر بڑھاپے کی طرف بڑھنے لگا یہاں تک کہ بڑھاپے کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُس کا وجود ہماری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو جاتا ہے.....

یہ سب کیا ہے؟......

اس کا ایک ہی نام ہے......تغیر!...... انسان کی پوری زندگی تغیر ہی کا دوسرا نام ہے اور تغیر سے مراد ہے تبدیل ہونے والی شے......

جنت میں تغیر نہیں......

جب یہ طے ہو گیا کہ انسان تغیر کے علاوہ کچھ نہیں تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ پیدا ہونے سے پہلے ہم جہاں موجود تھے جب وہاں تغیر ہوا تو ہم عالمِ ناسوت میں پیدا ہو گئے . .ہم یہاں سے جائیں گے تو عالمِ اعراف میں پہنچ جائیں گے...... پھر اُس عالم میں بھی تغیر ہوگا تو آدمی نفخ صور میں چلا جائے گا.... جب وہاں تغیر ہوا تو عالمِ حشر نشر میں پہنچ جائے گا.... عالم حشر نشر کے بعد دو عالمین سامنے آتے ہیں ایک جنت اور دوسرا دوزخ... جب اللہ تعالیٰ جنت کا تذکرہ کرتے ہیں تو فرماتے ہیں ''خَالِدِیْنَ فِیْهَا'' یعنی جنت میں ہمیشگی ہے.... ہمیشہ کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم جنت میں چلے جائیں گے تو وہاں تغیر ختم ہو جائے

گا...... اب مسئلہ حل ہوا.... یعنی تغیر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اتنا ٹوٹے گا بکھرے گا اور اتنا تقسیم ہوگا کہ وہ اُس مقام پر جا ٹھہرے گا جہاں مزید تقسیم نہیں ہوگی اور وہ مقام جنت ہے...... اس سے یہ ثابت ہوا کہ تغیر کا پورا انتظام اور سسٹم اس لئے ہے کہ انسان ایسے مقام پر جا کر ٹھہر جائے جہاں تغیر نہیں ہے...... قرآنِ مجید، سیّدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث اور اولیاء اللہ کی تعلیمات یہ ہیں کہ آدم کا مسکن جنت ہے.... قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں...... اے آدم جنت میں جا کر رہو...... ہم نے جنت تمہیں الاٹ کر دی...... اے آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو جسے ہم نے تمہارا ٹھکانہ بنا دیا ہے...... کھاؤ پیو کوئی پابندی نہیں.... جنت کا لاکھوں کروڑوں میل کا رقبہ تمہیں دے دیا گیا لیکن جنت میں رہنے کی ایک شرط ہے.... اور وہ شرط یہ ہے کہ خوش ہو کر رہو.... جنت میں کھانا پینا، رہنا اور بسنا سب Free of Charge ہے...... سب بالکل مفت ہے...... انسان کا اصل گھر، مکان، وطن اور مقام جنت ہے...... وہاں کوئی محنت مزدوری نہیں کرنی پڑتی...... یہاں آپ کو روٹی چاہیے تو اس کے لئے ہل چلانا پڑے گا آٹا پسوانا پڑے گا، میاں پوٹلی میں آٹا لائیں گے اور پھر بیوی صاحبہ روٹی پکائیں گی لیکن جنت میں ایسی کوئی پابندی نہیں...... روٹی چاہیئے اور وہ موجود ہو جائے گی۔......

جنت میں رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو شرائط رکھی ہیں پہلی یہ کہ خوش ہو کر رہیں دوسری یہ کہ اس درخت کے قریب چلے گئے تو تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا اور ظالم لوگ جنت میں نہیں رہ سکتے.... تابعدار اور فرمانبردار لوگ ہی جنت میں رہتے ہیں...... جنت کے وسیع وعریض رقبے کو حاصل کرنے کے لئے بھی دو شرائط ہیں...... ایک خوش رہنا دوسرا فرمانبرداری کرنا .... جب آدم اور ان کی بیوی نے نافرمانی کی تو اُن کے اندر ایک تغیر پیدا ہوا اور اُنہوں نے خود کو عریاں محسوس کیا.... چنانچہ تغیر کا مطلب نافرمانی ہوا...... جب تک آدمی نے نافرمانی نہیں کی وہ جنت میں مقیم رہے۔ اب اگر ہم اس تغیر کو ختم کرنا چاہیں تو کیا کریں؟..... سب لوگ جواب دیں!..... (حاضرین نے بیک آواز ہو کر کہا "نافرمانی چھوڑ دیں")۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آدم تو بنا ہی سڑی ہوئی مٹی سے ہے اور مٹی کی نیچر ہی نافرمانی ہے تو آخر وہ نافرمانی سے باز کیسے رہ سکتا ہے؟...... میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور حواؑ سے کہا تم زمین پر اُتر جاؤ تو انہیں یہ ادراک ہو گیا کہ جنت جیسی بے مثال جگہ سے ہمیں نکال دیا گیا ہے، آدم فوراً اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور احساسِ ندامت کے ساتھ اللہ کو پکارا...... اپنی غلطی کا اعتراف کیا......

ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخٰسرینo

اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا..... اگر آپ نے ہمیں معاف نہیں کیا اور رحم سے پیش نہ آئے تو ہمارا شمار سخت خسارے میں مبتلا لوگوں میں ہو جائے گا.....

اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا..... اور فرمایا اب چونکہ سسٹم تبدیل ہو گیا ہے..... تم جنت سے زمین پر آ گئے ہو اس لئے اب صورت یہ ہے کہ ہم اپنے پیغمبر بھیجتے رہیں گے... تم پیغمبروں کی طرزِ فکر پر چلنا تو ہم تمہارا وطن (جنت) تمہیں واپس کر دیں گے..... اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر تغیر کی وجہ سے کبھی بھول چوک ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اس کا حل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی مانگ لو .....

استغفر اللّٰہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہo

اپنے اصل وطن جانے کے لئے تغیر پذیر زندگی کی اس Chain کو ختم کرنا ہوگا..... اگر آپ کو جنت میں جانا ہے تو ضروری ہے کہ توبہ استغفار کرتے رہیں..... انسان کی زندگی کیا ہے؟..... انسان کی زندگی کا مفہوم تغیر ہے..... یہ تغیر جنت میں ہی ختم ہوگا..... جنت میں ہم کب جائیں گے؟..... جب ہم جنت میں رائج قانون اور ضابطے سے واقف ہوں گے..... جنت کے Immigration Laws سے واقف ہوں گے..... جنت کا قانون اور ضابطہ یہ ہے کہ ''خوش رہو اور نافرمانی مت کرو''..... پھر تو جنت میں جانا کون سا مشکل ہوا بھئی.....؟

خوش رہو اور فرمانبرداری کرو جنت تمہارے گھر پر رکھی ہے ..... یہ کون سا مشکل نسخہ ہے؟.....

اب سوال یہ ہے کہ ہم خوش کیسے رہیں؟ کہا یہ جاتا ہے کہ دنیا میں تین چیزیں لازمی ضرورت ہیں..... کھانا، چھت اور کپڑے..... مجھے بتایئے چھ ارب آبادی میں کون ایسا ہے جسے یہ تین چیزیں نصیب نہیں؟ پھر ہر ایک کیوں ناخوش ہے... آپ میں سے کوئی شخص کھڑا ہو کر بتائے کہ ہم کس بات پر ناخوش ہیں؟ (حاضرین میں سے ایک خاتون کھڑی ہو کر کہتی ہیں ''جب ہماری خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو ہم ناخوش ہوتے ہیں)۔

مجھے یہ بتایئے کہ زندگی کی بنیادی ضرورت کیا ہے؟ ہوا، پانی، غذا، زمین، چاند، سورج اور درخت... کیا یہ چیزیں آپ سب کو حاصل نہیں؟... اگر یہاں آکسیجن ختم ہو جائے تو کیا ہم زندہ رہ سکتے ہیں؟ دراصل

بات یہ ہے کہ آپ وہ چیزیں چاہتے ہیں جن کی فی الواقع آپ کو ضرورت ہی نہیں...... آپ ایسی چیزوں کی ڈیمانڈ کرتے ہیں جن کے بغیر بھی آپ خوش وخرم زندگی گزار سکتے ہیں...... خواہشات کیا ہیں؟، ہمارے پاس مرسڈیز گاڑی نہیں!...... عالیشان بنگلہ اور بہت سارا بینک بیلنس نہیں!...... حالانکہ ہم ان چیزوں کے بغیر بھی آرام وسکون سے رہ سکتے ہیں...... اگر واقعی آدمی پریشان ہے تو اسے مرجانا چاہیئے...... وہ مرتا بھی نہیں ہے جیتا بھی نہیں ہے...... خواہشات کا ایک انبار لگا ہوا ہے اور ہر آدمی اپنے جیسے مجبور اور محتاج آدمی سے خواہش کرتا ہے...... اس سے توقعات لگاتا ہے اور یہ توقعات ٹوٹتی بکھرتی رہتی ہیں...... پھر وہ کہتا ہے کہ میں ناخوش ہوں...... مجھے سکون نہیں ہے......

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک مرتبہ فرمایا ''اگر اللہ چاہے تو آپ کی ایک لاکھ خواہشات روز پوری کردے'' ...... اتنے بڑے اللہ میاں سے کوئی نہیں مانگتا...... کوئی افسر سے خواہش کرتا ہے، کوئی ابا سے توقعات وابستہ کرلیتا ہے اور کسی کو اپنا دوست نظر آتا ہے ...... خوش رہنے کا ایک ہی اُصول ایک ہی فارمولا ہے کہ تمام خواہشات اور توقعات دروبست اللہ سے وابستہ کرلیں...... اللہ ہی ہر چیز کا واحد کفیل ہے...... اللہ سے ہی ہر چیز طلب کی جائے آپ خوش بھی رہیں گے اور سکون کی دولت بھی حاصل ہوگی...... اب یہ اللہ کی مصلحت، مرضی اور منشاء ہے کہ مطلوبہ چیز آپ کو عطا کرتا ہے یا کوئی دوسرا انتظام کردیتا ہے۔ پیغمبروں نے اسی بات کی تعلیم دی۔

پیغمبروں کی تعلیمات پر غور وفکر ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ سارے پیغمبروں نے مشترکہ طور پر نوع انسانی کو اچھائی اور برائی کے تصور سے نہ صرف آگاہ کیا ہے بلکہ خود اس پر عمل کرکے یہ تصدیق باہم پہنچائی ہے کہ انسان' اچھائی اور برائی میں تفریق کرکے ہی بامقصد زندگی گزارتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے ایک اللہ وحدہ لاشریک کا تعارف کروایا ہے اور بتایا ہے کہ یہی وہ ہستی ہے جس کی پرستش کی جاتی ہے اور کی جانی چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں بھائی چارہ چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا بے سکون رہنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن پیدائش کے بعد کھلے میدان میں نہیں چھوڑ دیتے۔ زندگی کے جتنے وسائل ہیں۔ پیدا کرتے ہیں، مہیا کرتے ہیں اور اتنے زیادہ پیدا کرتے ہیں کہ ان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ اور برگزیدہ بندوں کو تعلیم کا حکم دیتے ہیں۔ ان کے راستے پر چلنے کو اپنا راستہ قرار دیتے ہیں۔

پیغمبران علیہم السلام کی زندگی کو مشعلِ راہ بتاتے ہیں۔

پیغمبروں کی زندگی پر تفکر کیا جائے تو ان میں صراطِ مستقیم پر قائم رہنے اور صراطِ مستقیم کی دعوت دینے کا بھرپور عزم ہوتا ہے۔

پیغمبر عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔ پیغمبر حق تلفی نہ کرنے کا درس دیتے ہیں۔

اَنبیاء کرامؑ کی تعلیمات یہ ہیں کہ پوری کائنات میں دو طرزیں کام کر رہی ہیں۔ ایک طرز اللہ کے لیے پسندیدہ ہے اور دوسری طرز اللہ کے لئے ناپسندیدہ ہے۔ وہ ناپسندیدہ طرز جو بندے کو اللہ سے دور کرتی ہے اس کا نام شیطنت ہے اور وہ پسندیدہ طرزِ فکر جو اللہ سے بندے کو قریب کرتی ہے اس کا نام رحمت ہے۔

جتنے بھی پیغمبرانِ کرام علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے سب کی طرزِ فکر یہ تھی کہ اللہ کے ساتھ ہمارا رشتہ قائم ہے۔ یہی روحانی طرزِ فکر ہے اور یہی رشتہ کائنات کی رگِ جان ہے۔

روحانی طرزِ فکر مسلسل ایک عمل ہے جو سالک کے اندر خون کی طرح دَور کرتی رہتی ہے۔ اس عمل میں بڑی رکاوٹ صدیوں پرانی وہ روایات ہیں جن کا مطمعِ نظر مادیت ہے۔ آدمی جس ماحول میں جوان ہوتا ہے وہ ماحول خاندان اور قبیلوں کی روایات بن جاتی ہیں۔ روایات کے امین والدین ہوتے ہیں، بھائی بہن ہوتے ہیں، کنبہ برادری کے لوگ اور تمام قرابت دار ہوتے ہیں۔

انسانی برادری میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ اوّل وہ جو خاندانی روایات میں زندہ رہتے ہیں، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور اگر ہو رہا ہے تو کیوں ہو رہا ہے...... ان کے لیے اتنا کافی ہے کہ ہمارے باپ دادا اس طرح کرتے تھے۔

جبکہ دوسرا گروہ سوچتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے...... کیا صحیح اور کیا غلط ہے......!

مشرکین مکہ جانتے تھے کہ تین سو ساٹھ 360 بت ہمارے جیسے آدمیوں نے پتھروں سے تراشے ہیں۔ یہ آدمیوں کی طرح بول نہیں سکتے، سن نہیں سکتے ... لیکن اس کے باوجود خاندانی روایات کا اتنا زیادہ غلبہ تھا کہ وہ ان بے جان پتھروں کے مجسم ٹکڑوں کو خدا کا درجہ دیتے تھے۔ نا صرف خود خدا مانتے تھے بلکہ کوئی اس حقیقت کو بیان کرتا تھا کہ ہمارے خدا پتھروں کے بے جان مجسمے ہیں تو اس کے درپے آزار ہو جاتے تھے۔ شرمناک حد تک سزائیں دینا ان کے نزدیک بہترین عمل تھا۔ صدیوں پرانی روایات اور جہالت کی گرد سے اٹا ہوا ماحول ان کے اندر سے فہم و بصیرت کا چشمہ خشک کر چکا تھا۔

اُس دور میں دوسری اقوام اور مذاہب کے افراد کو بھی اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بیت اللہ میں عبادت کر سکیں۔ وہاں اہلِ کتاب بھی آتے تھے جو بتوں کو نہیں مانتے تھے اور اپنی عبادت کرتے لیکن ان لوگوں میں بھی اتنی ہمت اور جرأت نہیں تھی کہ وہ ان بتوں کا انکار کر سکیں اور اس بارے میں کوئی آواز اُٹھا سکیں۔

مکہ مکرمہ میں چالیس سال کی عمر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو اہلِ مکہ کو یہ دعوتِ توحید سخت ناگوار گزری۔ ... چنانچہ حضور ﷺ نے جس قدر تکلیفیں اُٹھائیں اور جس قدر انہیں صدمے پہنچائے گئے وہ بیان سے باہر ہیں......

آج اُمتِ مسلمہ کو اس طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دین اسلام کو پھیلانے کے لئے کتنی اذیتیں اور تکالیف برداشت کیں۔ سیرتِ طیبہ کے اس پہلو کا مطالعہ کرنے سے اسلام کی خاطر قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تاکہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پرچار کرنے کے لیے ہمت اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضور پاک ﷺ کے جانثاروں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے اپنی جان اور مال غرض سب کچھ قربان کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود ہمت و حوصلہ کی چٹان بن کر مستقل مزاجی سے توحید کا پیغام عام کرنے کے لیے ناقابلِ بیان حالات کا مقابلہ کیا۔ آپ ﷺ کی ولادت سے قبل ہی والد محترم کا انتقال ہو گیا تھا۔ چند سال بعد والدہ ماجدہ انتقال فرما گئیں ... اس کے بعد دادا بھی اس دنیا سے چلے گئے ۔ یہ صدمات ہی کیا کم تھے کہ اہلِ خاندان نے بے شمار اذیتیں پہنچائیں .... آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کا بائیکاٹ کر دیا گیا......

مشرکینِ مکہ نے جب حضور پاک ﷺ کے مشن کو کامیاب ہوتے دیکھا تو انہوں نے قریش مکہ کے چیدہ چیدہ سرداروں کی مشاورت سے ایک جماعت بنائی اور ان قریشی سرداروں نے طے کیا کہ محمد (ﷺ) اور ان پر ایمان لانے والوں پر اتنا زیادہ ظلم و تشدد کیا جائے کہ وہ ہمارے راستے سے ہٹ جائیں۔

طائف کے سفر میں دعوتِ تبلیغ کے لیے آپ ﷺ نے وہاں اپنے رشتہ دار کے گھر قیام کرنا چاہا تو انہوں نے مہمان نوازی کی بجائے طائف کے غنڈے اور بدمعاش آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیئے اور ان لوگوں نے حضور پاک ﷺ کو اتنے پتھر مارے کہ آپ ﷺ لہولہان ہو گئے اور آپ ﷺ کے نعلین مبارک خون سے

بھر گئے۔

رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ روحانی علوم کے متلاشی افراد کے لیے ضروری ہے کہ سیرت پاک ﷺ کو بار بار پڑھیں اور اس بات پر تفکر کریں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پرچار کرنے کے لیے کتنی تکالیت اُٹھاتے ہوئے ہمت اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھے اور مشن کو عام کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضور پاک ﷺ کے جانثاروں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے اپنی جان اور مال غرض سب کچھ قربان کر دیا۔

مسلمان جب رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ اور سنت پر خلوصِ نیت، اتحاد، یگانگت اور تفرقہ سے بالاتر ہو کر عمل پیرا ہوں گے تو انہیں قدم قدم پر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا تعاون ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے سے جرأت مندانہ قدم اُٹھانے، دل شکستہ حالات کا سامنا کرنے، مخالفین کی الزام تراشیوں کو نظر انداز کرنے اور بلاتفریق لوگوں تک صحیح بات پہنچانے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔

سوا ارب مسلمان جیسے بھی ہیں رسول اللہ ﷺ پر جان سے فدا ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی محبت مسلمانوں کے قلوب میں داخل کی ہوئی ہے لیکن اکثر مسلمانوں کی محبت کا اظہار صرف زبانی کلامی ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ہر عمل خود کر کے دکھایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات رہنمائی کرتی ہیں کہ تخریب انسانی عمل نہیں ہے، تخریب ایک غیر فطری، غیر انسانی اور شیطانی عمل ہے...... تخریب کو چھوڑ کر تعمیری پہلو اختیار کیا جائے...... تعمیری پہلو یہ ہے کہ انسان کے اندر نفرت اور حقارت نہ ہو بلکہ آپس میں بھائی چارہ اور محبت ہو۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مومن کی پہچان یہ ہے کہ جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لیے پسند کرتا ہے''......

حضور پاک ﷺ نے فرمایا ''کسی کالے کو گورے پر اور کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں...... اصل چیز وہ اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں''......

اس وقت اُمتِ مسلمہ کا حال یہ ہے کہ سابقہ اُمتوں کے جن جن اعمال و کردار کی وجہ سے عذابِ الٰہی نازل ہوا، وہ سب کے سب اُمت مسلمہ میں مشترکہ طور پر موجود ہیں...... جس طرح دوسری اُمتوں نے اپنے پیغمبر سے

اوراپنے پیغمبروں کی تعلیمات سے روگردانی کی اور برائیوں پر اصرار کیا تھا..... کیا آج مسلمان قوم بھی ایسے ہی کردار میں مبتلا نہیں ہے.....؟

جھوٹ عام ہو گیا ہے..... کم تولنا ..... ملاوٹ..... بلیک مارکیٹنگ..... نفرت..... حسد..... اور قتل و غارت گری زندگی میں اس طرح سرائیت کر گئی ہے کہ اب اس سے رستگاری کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی.....

ایک کلمہ گو دوسرے مسلمان کو نا صرف کافر کہتا ہے بلکہ اس کے قتل سے بھی گریز نہیں کرتا.....
موت کے بعد کی زندگی بے وقعت ہو گئی ہے..... احساسِ گناہ ختم ہو گیا ہے.....
ہر شخص مایہ جال میں گرفتار ہونے کو خوش قسمتی سمجھنے لگا ہے..... قرآن کہتا ہے کہ:

”جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے لیے خرچ نہیں کرتے ان لوگوں کے لیے عذابِ الیم کی بشارت ہے“۔(سورۂ توبہ: آیت ۳۴)

اللہ کا قانون اٹل ہے، اتمامِ حجت کی تکمیل ہونے کے بعد لازماً قانونِ قدرت حرکت میں آتا ہے۔ بے شک ہمارے نبی پاک ﷺ رحمت اللعالمینؐ ہیں مگر اللہ کا قانون بھی جاری و ساری ہے۔ اللہ اُس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو قوم اپنی اصلاح کے لیے جدوجہد نہیں کرتی۔ اگر ہم رحمت اللعالمین ﷺ کی رحمت کے سہارے آپس میں اتحاد و اتفاق کے ساتھ اُن برائیوں کو جن برائیوں سے دوسری اُمتیں عذابِ الٰہی سے ہلاک ہو چکی ہیں، چھوڑ دیں، تفرقہ سے باز آجائیں تو اللہ کی ناراضگی سے بچ سکتے ہیں۔

اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے لئے ہمیں حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا۔ حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات ہماری راہنمائی کرتی ہیں کہ پیدائش کے بعد انسان کا تعلق تین نظاموں سے ہے۔ پہلا نظام وہ ہے جہاں اس نے خالقِ حقیقی کو دیکھ کر اس کے منشاء کو پورا کرنے کا عہد کیا۔ دوسرا نظام وہ ہے جس کو ہم عالمِ ناسوت، دارالعمل یا امتحان گاہ کہتے ہیں۔ اور تیسرا نظام وہ ہے جہاں انسان کو امتحان کی کامیابی یا ناکامی سے باخبر کیا جاتا ہے۔

انسان کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ یہ جان لے کہ اس نے اللہ کے سامنے عہد کیا ہے کہ اللہ اس کا خالق اور ربّ ہے۔ علمائے باطن کہتے ہیں کہ انسان ستر ہزار پرت کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق انسان جب عالمِ ناسوت میں آتا ہے تو اس کے اوپر ایک پرت ایسا غالب آجاتا ہے جس میں سرکشی، بغاوت، عدم

تحفظ، عدم تعمیل، کفرانِ نعمت، ناشکری، جلد بازی، شک، بے یقینی اور وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ یہی وہ ارضی زندگی ہے جس کو قرآنِ پاک نے اسفل السافلین کہا ہے۔

اس اسفل السافلین کے شعور سے نکلنے کے لئے شعور کو وسیع کرنا پڑے گا۔ یعنی اپنے شعور میں وسعت لانی ہوگی، اس کی سکت بڑھانی ہوگی۔

یہ دنیا جو ہمارے سامنے ہے اس پر جب غور کریں تو یہ ذہنی وسعت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ جس آدمی میں جتنی زیادہ وسعت ہوگی وہ آدمی اسی مناسبت سے ذہین بھی ہوگا اور اسی مناسبت سے عالم فاضل بھی .

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ذہنی سکت اتنی ہوتی ہے کہ اخبار کھولنے کی آواز سے وہ چونک کر اُچھل جاتا ہے… غور و فکر کرنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ بچے کے شعور میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ کاغذ کھولنے کی آواز کو بھی برداشت کر سکے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی کبھی زور سے بولنے سے بھی بچہ ہماری آواز کو برداشت نہیں کرسکتا۔

بچہ جب پڑھنا شروع کرتا ہے تو ۳ سال میں ۲۸ حروف سیکھ سکتا ہے۔ میں نے جب حساب لگایا تو یہ بات سامنے آئی کہ لفظ A ایک بچہ ۴۰ گھنٹوں میں سیکھتا ہے۔ یعنی ماں باپ یا استاد کو مسلسل ۴۰ گھنٹے بچے کے سامنے ایک نقطہ کو Repeat کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر بچہ اُسے سیکھ پاتا ہے۔ اِس کے بعد وہ دس سال میں دس کلاسیں پڑھتا ہے۔ اس طویل عرصے کے بعد اُسے جو شعور حاصل ہوتا ہے، اس شعور کی بنیاد پر بھی وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ اُسے زندگی میں کون سا شعبہ اختیار کرنا ہے۔ زیادہ تر والدین ہی اس کا انتخاب کرتے ہیں یا اگر اُس کا شعور اِس قابل بھی ہو گیا تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے لئے کسی ایک مضمون کا انتخاب کرلے گا۔ اب اس کے بعد بچے کے شعور میں جو اضافہ ہوتا ہے اس کا حساب کتاب یہ ہے کہ ۳۵ ہزار چھ سو گھنٹوں کے بعد وہ اِس بات کا انتخاب کرسکتا ہے کہ اُسے ڈاکٹر بننا ہے یا انجینئر بننا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بن بھی سکے گا یا نہیں ......

ذرا سوچئے! انسانی شعور کا یہ حال ہے۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کی شعوری سکت ناقابل بیان ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے ماحول کا اثر ہوتا رہتا ہے اسی مناسبت سے اُس کے شعور میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ہم نے رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے اُن پہلوؤں پر غور کیا جس سے ہم پر یہ واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا مشن کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جس مشن کی ترویج کے لئے مبعوث فرمائے گئے، اُس مشن کی افادیت کیا ہے...... رسول اللہ ﷺ کا مشن یہ ہے کہ مخلوق کو خالق سے متعارف کرایا جائے۔ جب مخلوق کو اس بات کا علم ہو جائے گا کہ میں مخلوق ہوں تو ظاہر ہے کہ اُس کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ اُس کو تخلیق کرنے والا کون ہے؟...... پھر جب یہ بات ذہن میں آ جائے گی کہ ہم مخلوق ہیں اور ہمارا پیدا کرنے والا اللہ خالق ہے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں پیدا کیوں کیا گیا؟......

جب ہم نے سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کیا تو ہمارے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ایک واحد ہستی اللہ ہے جو بندے کو پیدا کرتی ہے اور رزق کا انتظام کرتی ہے۔ ،، اپنی مرضی سے پیدا کرتی ہے اور مارتی ہے۔ یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ کیا ہم اس دنیا میں محض اس لئے آئے تھے کہ کھائیں پئیں، شادیاں کریں، اپنی نسل کو آگے بڑھائیں یا پھر رنگ رلیاں منائیں اور جب اس دنیا سے جائیں تو پھر اگلی دنیا میں ہمارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا؟......

پیغمبران علیہم السلام کی تعلیمات جب ہمارے سامنے آتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہاں اعمال کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگلی دنیا میں بھی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ ہم اِس دنیا میں جو عمل کرتے ہیں اسی کے مطابق وہاں ہماری جگہ کا تعین ہوتا ہے یہ ایک سلسلہ ہے اس پر جتنا بھی آپ سوچیں گے، نئی سے نئی بات آپ کی سمجھ میں آئے گی، ایک بات یہ ہے کہ انسان ایک معاشرتی یونٹ ہے۔ معاشرہ میں رہنے کا طریقہ، کھانے پینے کا طریقہ، زندگی کے آداب، والدین کی محبت، اولاد کی محبت، نیک اعمال کی کوشش، بُرائیوں سے بچنا یہ سب انسانی معاشرے کی بنیادی ضروریات ہیں۔ اب اِن بنیادی ضروریات پر خود بھی عمل کرنا اور رسول اللہ ﷺ کے مشن کو سامنے رکھ کر دوسروں تک بھی اچھائی کا علم پہنچانا...... اور دوسرے لوگوں کو بھی عمل کروانا...... میرے خیال میں اس پروگرام کا یہی منشاء تھا۔ الحمد للہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر غور و فکر کے لئے کئی گھنٹے گزارے اور اِن کئی گھنٹوں میں ہم سب کا ذہن مسلسل اس نقطے پر مرکوز رہا کہ ہمارے آقا ہمارے مولا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لئے کیا تعلیمات چھوڑیں اور اِن تمام تعلیمات کو ہم اپنے اوپر کیسے لاگو کریں اور اپنے اوپر اِن تعلیمات کو لاگو کر کے دوسروں تک کیسے پہنچائیں......

اس کے لئے ایک ایسے استاد کی ضرورت ہے جو خود بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلبی و باطنی تعارف رکھتا ہو اور دوسروں کو بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے متعارف کرا سکے۔

ایسا استاد وہ ہوتا ہے......جس کی خالص دنیاوی ماحول میں رائج طرزِ فکر سے منفرد طرزِ فکر ہوتی ہے۔ روحانی استاد میں توکل اور استغناء ہوتا ہے، دنیا طلبی نہیں ہوتی۔ اس کی مرکزیت ''توحید'' ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے۔ (آمین)

السلام علیکم!

☆......☆......☆

تقریب رونمائی کتاب محمد رسول اللہ ﷺ سے مرشد کریم آواری ہوٹل میں خطاب فرما رہے ہیں

مرشد کریم اور سہیل مشتاق محمد عظیمی کتاب محمد رسول اللہ ﷺ کی رونمائی میں تشریف لاتے ہوئے

روحانی سیمینار سے خطاب

۱۹ مارچ ۱۹۹۹ء بروز جمعۃ المبارک مراقبہ ہال برائے خواتین لاہور میں ایک روحانی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ جس کی صدارت ممتاز روحانی اسکالر حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے کی۔ T.I.A کے چیئرمین اور چیف ایڈیٹر پاکستان میڈیا انٹرنیشنل ڈاکٹر ابراہیم غزنوی اور پاکستان بوائز اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کے کمشنر، ریٹائرڈ جنرل منیجر پاکستان ریلوے، اور ڈائریکٹر چلڈرن انسٹی ٹیوٹ فاؤنڈیشن ہاؤس مرزا محمد اکرم نے بطور مہمانانِ گرامی شرکت فرمائی۔

مرشدِ کریم الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

یہاں پر تین موضوعات پر مقالات پیش کیے گئے۔ ان سب کا لب لباب اللہ تعالیٰ سے دوستی کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دوستی کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَلا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

اللہ کے دوستوں کی تعریف یہ ہے کہ ان کی زندگی میں نہ خوف ہوتا ہے اور نہ حزن و ملال ہوتا ہے اور نہ غم ہوتا ہے۔

اور جن لوگوں کے اندر غم ہوتا ہے اور خوف ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے دوست نہیں ہو سکتے اور جو اللہ کے دوست نہیں ہوتے، جنت کی فضا انہیں قبول نہیں کرتی۔ وہ دوزخ کا ایندھن ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے اندر غم اور خوف ہے تو اللہ کے بیان کردہ قانون کے مطابق وہ جنتی نہیں ہے۔ روحانی قدروں میں کسی شاگرد یا راہ سلوک پر چلنے والے مسافر کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کے دل سے خوف اور غم نکل جائے۔ خوف اور غم اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک آدمی کے اندر قناعت اور استغناء موجود نہ ہو۔

قناعت اور استغناء کوئی لفظی معمہ نہیں ہے یا کوئی حساب کا ہیر پھیر نہیں ہے۔ استغناء فی العمل ایک کیفیت ہے، ایک حقیقت ہے۔ ایسی حقیقت جو حقیقت مطلق سے متصل ہے جب تک کوئی بندہ حقیقت سے متعارف نہیں

ہوتا، مشاہدہ نہیں کر لیتا اس وقت تک اس کے اندر استغناء پیدا نہیں ہوتا اور اگر استغناء ہوتا ہے تو وہ اتنا ہوتا ہے کہ محض اس کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ جس آدمی کے اندر جس مناسبت سے قناعت اور استغناء موجود ہے اس آدمی کے اندر اسی مناسبت سے ڈر، خوف اور غم بھی کم ہوتا ہے۔ اسی طرح موت ہے۔ موت کا بھی خوف ہوتا ہے۔ موت یا مرنا آخر ہے کیا؟

مرنے کی حالت کو عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ...... روح نکل گئی مرنے کے بعد جس عالم میں آدمی منتقل ہوتا ہے اس کے بارے یہ کہا جاتا ہے کہ مرنے والا اپنے دوستوں اور عزیزوں کی روحوں کے پاس عالم اعراف میں چلا گیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اعراف میں آدمی کھانا بھی کھاتا ہے، پانی بھی پیتا ہے، سوتا جاگتا بھی ہے، وہاں اپنے رشتہ داروں سے ملتا بھی ہے، دکھ درد، سکون راحت اور اطمینان سے آشنا بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مرنے والے آدمی کی روح نکل گئی ہے تو روح نکلنے سے مراد یہ ہوگی کہ اب آدمی نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم جس کو مرنا کہتے ہیں دراصل وہ ایسی حالت ہے جس کو ہم روشنی کے ہالے کا مٹی کے جسم سے رشتہ منقطع کر لینے کا نام دے سکتے ہیں۔

عام حالات میں جب استغناء کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے اوپر کتنا توکل اور بھروسہ ہے۔ توکل اور بھروسہ کم و بیش ہر آدمی کی زندگی میں داخل ہے۔ لیکن جب ہم توکل اور بھروسہ کی تعریف بیان کرتے ہیں تو ہمیں بجز اس کے کچھ نظر نہیں آتا کہ ہماری دوسری عبادات کی طرح بھروسہ اور توکل بھی دراصل لفظوں کا ایک خوش نما جال ہے۔ توکل اور بھروسہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے لیکن جب ہم فی العمل زندگی کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ بات محض نعرہ اور غیر یقینی لگتی ہے اور یہ ایسی بات ہے کہ ہر آدمی کی زندگی میں اس کا عمل دخل جاری و ساری ہے۔ مثلاً ایک آدمی کسی فرم میں ملازمت کرتا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ بات رہتی ہے کہ فرم کا مالک یا سیٹھ ساہوکار اگر مجھ سے ناراض ہو گیا تو ملازمت سے برخاست کر دیا جاؤں گا یا میری ترقی نہیں ہوگی یا ترقی تنزلی میں بدل جائے گی۔ ظاہر ہے یہ بات بھروسہ اور توکل کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے برعکس ہم زندگی میں یہ بات بار بار دہراتے ہیں کہ اگر کوئی کام نہیں کریں گے تو کھائیں گے کہاں سے۔ یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ جب کسی کام کا نتیجہ اچھا مرتب ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ نتیجہ ہماری عقل اور ہماری فراست وفہم سے مرتب ہوا ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کے اوپر توکل اور بھروسہ محض مفروضہ ہے۔ جس بندے کے اندر توکل اور

بھروسہ پیدا نہیں ہوتا اور اس کے اندر استغناء بھی نہیں ہوتا۔ استغناء سے مراد یہ ہے کہ ضروریات زندگی گزارنے میں بندے کا اپنا ذاتی ارادہ یا اختیار شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اگر مرغی کھلاتے ہیں اس میں خوش رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اگر چٹنی سے روٹی دیتے ہیں اس میں بھی خوش رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کھدر کے کپڑے پہناتا ہے بندہ اس میں بھی خوش رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے ہر عمل اور حرکت کو اللہ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے۔ پہلے بندے کے اندر توکل اور بھروسہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ استغناء کے دائرے میں قدم رکھتا ہے۔ توکل اور بھروسہ دراصل ایک خاص تعلق ہے جو بندے اور اللہ کے درمیان براہ راست قائم ہے اور جس بندے کا اللہ کے ساتھ یہ رابطہ قائم ہو جاتا ہے اس بندے کے اندر سے دنیا کا تمام لالچ نکل جاتا ہے۔ ایسا بندہ دوسرے تمام بندوں کی امداد اور تعاون سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس بندے کی حیثیت ایسی ہو جاتی ہے کہ جس حیثیت کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ اخلاص کی پانچ آیتوں میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ اخلاص میں پانچ حتمی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ اخلاص میں اپنی ذات پر سے پردہ اٹھا دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کے اندر موجود ہیں یا جو صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ صفات مخلوق کے اندر موجود نہیں ہیں۔ سورۃ اخلاص کی پانچ آیتیں ہمیں خالق اور مخلوق کا امتیاز سکھاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ''اے پیغمبرؐ! آپؐ فرما دیجئے اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے کسی سے احتیاج نہیں رکھتا۔ اللہ نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ اللہ کسی کا باپ ہے، اللہ تعالیٰ کوئی خاندان بھی نہیں رکھتا''۔

ان صفات کی روشنی میں جب ہم مخلوق کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مخلوق کبھی ایک نہیں ہوتی۔ مخلوق ہمیشہ بکثرت ہوتی ہے۔ مخلوق زندگی کے اعمال و حرکات پورے کرنے پر کسی نہ کسی احتیاج کی پابند ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوق کسی کی اولاد ہو۔ مخلوق کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کوئی خاندان ہو۔ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ ان پانچ صفات میں جب لاشعوری تفکر سے کام لیا جاتا ہے تو ہمیں ایک بات ایسی ملتی ہے کہ ہم ان صفات کو جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں ان میں سے ایک صفت اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر وارد کر سکتے ہیں۔ مخلوق کے لئے یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ کثرت سے بے نیاز ہو۔ مخلوق اس بات پر بھی مجبور ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اسی طرح مخلوق کا خاندان ہونا بھی ضروری ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ پانچ صفات میں سے چار صفات میں مخلوق اپنا اختیار استعمال کرنے کے لئے بے بس اور مجبور ہے۔ صرف ایک ایجنسی ایسی ہے کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفت کو اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے اوپر وارد کر سکتی ہے اور وہ ہے 'اللہ احتیاج سے ماوراء ہے۔ مخلوق

یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دنیاوی تمام وسائل سے اپنی ضروریات اور احتیاج کو توڑ کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کر لے۔ یہی وابستگی توکل اور بھروسہ ہے۔ اگر بندے کے اندر مخلوق کے ساتھ احتیاجی عوامل کام کر رہے ہیں تو وہ توکل اور بھروسہ کے اعمال سے دور ہے۔ راہِ سلوک کے مسافر کو سب سے پہلے اس بات کی مشق کرائی جاتی ہے کہ زندگی کے تمام تقاضے اور زندگی کی تمام حرکات و سکنات جب سالک پیر و مرشد کے سپرد کر دیتا ہے تو وہ اس کی تمام ضروریات کا کفیل بن جاتا ہے' بالکل اس طرح جس طرح ایک دودھ پیتے بچے کے کفیل اس کے والدین ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی کفالت زیرِ بحث آتی ہے جنہوں نے ابھی تک شعور کے دائرے میں قدم نہیں رکھا ہے۔ جب تک بچہ شعور کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا والدین چوبیس گھنٹے اس کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔

مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں' چاہتے ہیں تو آدمی صحت مند پیدا ہوتا ہے نہیں چاہتے تو آدمی کی نشوونما میں ایسا سقم واقع ہو جاتا ہے کہ اس کے نہ اعضاء صحیح ہوتے ہیں نہ اس کا دماغ صحیح ہوتا ہے۔ اس کی نظر بھی صحیح کام نہیں کرتی۔ ہاتھ پیروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو پکڑ نہیں سکتا اپنی مرضی سے چل پھر نہیں سکتا۔ سائنس کتنی بھی ترقی کر لے پیدائشی اپاہج اور معذور بچوں کا علاج اس کے پاس نہیں ہے اور اس قسم کے معذور بچوں کو یہ کہہ کر رد کیا جاتا ہے کہ یہ پیدائشی معذور مریض ہیں۔ یہاں بھی انسان کی بے بسی اور بے اختیاری اظہر من الشمس ہے' سورج کی طرح عیاں ہے۔ قدرت جب بچوں کو پیدا کرتی ہے تو مختلف صورتوں میں پیدا کرتی ہے۔ قد کاٹھ مختلف ہوتا ہے' یہ نہیں دیکھا گیا کہ کوئی بنیادی طور پر کوتاہ قد آدمی ۷ فٹ کا بن گیا ہو۔ ایسی بھی دنیا میں کوئی مثال نظر نہیں آتی کہ ۷ فٹ کا آدمی گھٹ کر دو ڈھائی فٹ کا ہو گیا ہو۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ قد و قامت کے معاملے میں بھی آدمی بے اختیار ہے۔ اب مسئلہ ذہنی صلاحیت اور عقل و شعور کا آتا ہے۔ لوگوں میں جب ہم عقل و شعور کا موازنہ کرتے ہیں تو کوئی آدمی ہمیں زیادہ باصلاحیت ملتا ہے کوئی آدمی ہمیں کم صلاحیت والا ملتا ہے اور کوئی آدمی بالکل بے عقل ملتا ہے۔ سائنس خلاء میں چہل قدمی کا دعویٰ کرتی ہے لیکن ایسی کوئی مثال سامنے نہیں آئی کہ بے عقل آدمی کو عقل مند کر دیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی مرضی سے عقل و شعور بخشتے ہیں۔ آدمی کے اندر اللہ تعالیٰ فکر و گہرائی عطا کرتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ فکر اور گہرائی پیدا کر دیتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری اپنی چیز ہے لیکن جب وہی فکر اور شعور اور گہرائی ان سے چھین لی جاتی ہے اس وقت وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ زندگی کے تمام اجزائے ترکیبی کسی ایک طاقت کے پابند ہیں.... وہ طاقت جس طرح چاہے چلاتی ہے اور جب چاہے ساکت کر دیتی ہے۔ مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ لوگ نادان ہیں۔ کہتے ہیں کہ

ہماری گرفت حالات کے اوپر ہے انسان اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق حالات میں ردو بدل کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ انسان ایک کھلونا ہے۔ حالات جس قسم کی چابی اس کھلونے میں بھر دیتے ہیں اسی طرح یہ کودتا ہے ناچتا ہے آوازیں نکالتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر فی الواقع حالات پر انسان کو دسترس حاصل ہوتی تو کوئی آدمی غریب نہ ہوتا۔ اپنی مرضی سے نہ مرتا۔

دنیا میں غرور و تکبر اور خود پرستی کے کردار، شداد، نمرود اور فرعون کو جو سمجھتے تھے کہ ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کی بھی موت کے پنجے نے گردن مروڑ دی اور دنیا پر ان کا نام و نشان نہیں رہا۔ یہ شداد و نمرود اور فرعون کی مثالیں ایسی نہیں ہیں کہ جس کو ہم تاریخی باتیں کہہ کر گزر جائیں۔ تاریخ ہر زمانے میں خود کو دہراتی ہے۔ البتہ رنگ' روپ' نام اور شکل بدل جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں شہنشاہ ایران کی مثال سامنے ہے جس نے ڈھائی ہزار سال کی سالگرہ منائی' موت کے پنجے نے اس کو اس قدر بے بس اور ذلیل کر دیا کہ اس کے لئے اس کی سلطنت کی زمین بھی تنگ ہو گئی وہ دیار غیر میں مر گیا اور کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں تھا اگر حالات انسان کے بس میں ہیں تو اتنا بڑا بادشاہ غریب الدیار نہیں ہو سکتا تھا یہ اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہمارے ساتھ ہر روز پیش آتی رہتی ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم ان باتوں پر غور نہیں کرتے اور ان سب باتوں کو اتفاق کہہ کر گزر جاتے ہیں جبکہ کائنات میں اتفاق اور حادثہ کو ہرگز کوئی دخل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو مربوط ہے۔ ہر نظام کی دوسرے نظام کے ساتھ وابستگی ہے۔ اس نظام میں نہ کہیں اتفاق ہے نہ کہیں حادثہ ہے نہ کوئی قدرتی مجبوری ہے۔ اللہ کا ایک نظام ہے اور اس نظام کو چلانے والے کارندے اللہ کے حکم اور اللہ کی مشیت کے مطابق اسے چلا رہے ہیں۔ آدمی کیا ہے؟ کٹھ پتلی ہے...... جس طرح کائنات کا نظام چلانے والے کارکن ڈوریوں کو حرکت دیتے ہیں آدمی چلتا رہتا ہے۔ ڈوریاں ہلنا بند ہو جاتی ہیں آدمی مر جاتا ہے۔ یہ باتیں اس لئے عرض کی گئی ہیں کہ میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ استغناء اس وقت تک کسی شخص کے اندر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے یقین میں یہ بات راسخ نہ ہو جائے کہ ہر چیز من جانب اللہ ہے۔ جب کسی بندے کے اندر یہ بات یقین بن جاتی ہے کہ نظام میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی حرکت اور بڑی سے بڑی شے اللہ کے بنائے ہوئے ایک مربوط نظام کے تحت قائم ہے تو اس کے اندر ایک ایسا (Pattern) بن جاتا ہے جس کا اصطلاحی نام استغناء ہے اس (Pattern) کو جب تحریکات ملتی ہیں اور زندگی میں مختلف واقعات پیش آتے ہیں تو ان واقعات کی کڑیاں اس قدر مضبوط' مستحکم اور مربوط ہوتی ہیں کہ آدمی کی عقل یہ سوچنے اور ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی چیز کے اوپر یقین کا کامل ہو جانا اسی وقت ممکن ہے۔ جب وہ چیز یا عمل جس کے بارے میں ہم نہیں جانتے کہ یہ کس طرح واقع ہو گی بغیر کسی ارادے اور اختیار اور وسائل کے پوری ہوتی رہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں کمرے میں بیٹھا ہوا لوح وقلم کے صفحات دوبارہ لکھ رہا تھا۔ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ لاہور سے کچھ مہمان آ گئے۔ عام حالات میں چونکہ تھوڑی دیر کے بعد کھانے کا وقت تھا اس لئے ذہن میں یہ بات آئی کہ ان مہمانوں کو کھانا کھلانا چاہیئے۔ یہ اس دور کا واقعہ ہے جب میں حیرت کے مقام پر سفر کر رہا تھا اور نہ صرف یہ کہ کوئی کھانے پینے کا انتظام نہیں تھا لباس بھی مختصر ہو کر ایک لنگی اور ایک بنیان رہ گیا تھا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ اس لباس میں گرمی سردی اور برسات کس طرح گزری۔ جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو ہمت اور توفیق عطا کر دیتے ہیں تو بڑی سے بڑی مشکلات اور پریشانیاں پلک جھپکتے گزر جاتی ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ذہن میں یہ بات آئی کہ پڑوس میں سے ۵ روپے ادھار مانگ لئے جائیں اور ان روپوں سے خورد ونوش کا انتظام کیا جائے۔ خیال آیا کہ اگر ۵ روپے دینے سے انکار کر دیا گیا تو بڑی شرمندگی ہو گی پھر خیال آیا کہ جھونپڑی والے ہوٹل سے کھانا ادھار لے لیا جائے۔ طبیعت نے اس بات کو بھی پسند نہیں کیا یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ اللہ چاہے گا تو کھانے کا انتظام ہو جائے گا اور میں کمرے سے باہر آیا جیسے ہی دروازے سے قدم باہر نکالا چھت میں سے ۵ روپے کا ایک نوٹ گرا۔ نوٹ اس قدر نیا تھا کہ زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ فرش پر جب ایک نوٹ نیا پڑا ہوا دیکھا تو نہ معلوم طریقے سے میرے اوپر دہشت طاری ہو گئی لیکن یکایک ذہن میں ایک آواز گونجی یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وہ نوٹ اٹھا لیا گیا اور کھانے پینے کا بہ فراغت انتظام ہو گیا۔

اب آپ لوگ بتائیں کہ انسان اپنی ضروریات کا کفیل ہے یا اللہ؟

اگر انسان اپنی ضروریات کا خود کفیل ہے تو اس کے پاس ایسی کون سی طاقت ہے ایسا کون سا علم ہے کہ وہ دھوپ کو حاصل کر سکے پانی کو حاصل کر سکے۔ زمین کے اندر اگر پانی کے سوتے خشک ہو جائیں تو انسان کے پاس ایسا کون سا علم ہے' طاقت ہے' عقل ہے کہ وہ زمین کے اندر پانی کی نہریں جاری کر دے۔ یہی حال ہوا کا ہے۔ ہوا اگر بند ہو جائے اللہ تعالیٰ کا نظام وہ نظام جو ہوا کو تخلیق کرتا ہے اور ہوا کو گردش میں رکھتا ہے اس بات سے انکار کر دے کہ ہوا کو گردش نہیں تو زمین پر موجود اربوں کھربوں مخلوق ایک منٹ میں تباہ و برباد ہو جائے گی۔ یہ کیسی بے عقلی اور ستم ظریفی ہے کہ بنیادی ضروریات کا جب تذکرہ آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے اور جب روٹی' کپڑے اور مکان کا تذکرہ آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر اپنا اختیار استعمال نہ کریں تو یہ چیزیں ہمیں کیسے فراہم

ہوں گی؟ ان معروضات سے منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان یہ سمجھ کر کہ میں بے اختیار ہوں ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہے' اس کے اعضاء منجمد ہو جائیں منشاء صرف یہ ہے کہ زندگی میں ہر عمل اور ہر حرکت کو من جانب اللہ سمجھا جائے۔ جدوجہد اور کوشش اس لئے ضروری ہے کہ اعضاء منجمد نہ ہو جائیں آدمی اپاہج نہ ہو جائے۔ آدمی جس مناسبت سے جدوجہد کرتا ہے جس مناسبت سے عملی اقدام کرتا ہے بے شک اسے وسائل بھی اسی مناسبت سے نصیب ہوتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قانون قدرت پر اسے دسترس حاصل ہو گئی۔ قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے زمین آسمان اور زمین آسمان کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب مسخر کر دیا ہے۔ مگر طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس تسخیر کو صرف اور صرف مادی حدود میں استعمال کیا جائے اور دوسرا احسن طریقہ یہ ہے کہ وسائل کو اس لئے استعمال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام وسائل انسان کے لئے پیدا کئے ہیں۔

رزق کی فراہمی کا بندوبست درو بست اللہ کے ذمہ ہے۔ اب اللہ تعالیٰ رزق پہنچانے کا کوئی بھی طریقہ اختیار کریں۔ ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش' بچے کی زندگی اور بچے کو مستقل طور پر غذا پہنچانے کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ غور طلب بات یہ کہ ماں کے پیٹ میں بچہ غذا حاصل کرتا ہے اور اس غذا سے مسلسل اور متواتر اعتدال کے ساتھ توازن کے ساتھ پرورش پاتا رہتا ہے یہاں یہ بات بھی عجیب ہے کہ بچے کو غذا پہنچانے کا جو ذریعہ ہے یعنی ماں' اس ذریعے کو بھی غذا پہنچانے میں کوئی ذاتی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ایک ماں غذا کھاتی ہے۔ اس غذا سے بالکل غیر اختیاری اور غیر ارادی طور پر خون بنتا ہے اور یہ خون شریانوں اور رگوں میں دوڑنے کی بجائے بچے کی غذا بنتا رہتا ہے۔ شریانوں اور رگوں کو خون کی جتنی ضرورت ہوتی ہے اس مقدار میں شریانوں اور وریدوں کو بھی خون فراہم ہوتا رہتا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کی پرورش کس ارادے اور کس اختیار کے ساتھ ہو رہی ہے؟ بندے کا اس میں ذرا سا بھی عمل دخل نہیں ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد بچے کو غذا فراہم ہونے کا طریقہ یکسر بدل جاتا ہے۔ وہی خون جو بچے کو ماں کے پیٹ میں براہ راست منتقل ہو رہا تھا اب دوسرا صاف شفاف طریقہ اختیار کرتا ہے اور یہی خون ماں کے سینے میں بہترین غذا دودھ بن جاتا ہے۔ یہ بات پھر اپنی جگہ اہم ہے کہ خون دودھ کیسے بنا' کس نے بنایا؟ اس میں آدمی کا کون سا اختیار کام کر رہا ہے؟ اور یہ بات کیا عجیب نہیں ہے کہ بچے کی پرورش جب مقصود نہیں ہوتی تو ماں کے سینے میں دودھ نہیں اترتا۔ اس کے بعد بچہ دودھ کی منزل سے ذرا آگے بڑھتا ہے تو اسے دودھ کی مناسبت سے کچھ بھاری غذاؤں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ان بھاری غذاؤں کو چباتے اور پینے کے لئے قدرت دانت فراہم کرتی ہے۔ دنیا میں کون سا ایسا علم ہے۔ ایسی کون سی سائنس' ایسا کون سا بندہ ہے جو اسے

ارادے اور اختیار کے ساتھ ایسا کر سکے۔ جیسے جیسے بچے کی نشوونما بڑھتی ہے اور بچے کے جسمانی نظام کو بھاری اور قوت بخش غذاؤں کی ضرورت پیش آتی ہے اس کی آنتیں' معدہ اور دوسرے اعضاء اسی مناسبت سے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ عقل وشعور کے پاس ایسا کون سا علم ہے جس علم کی بنیاد پر وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین کی نقالی کر سکے یعنی وہ آنتیں بنا دے' معدہ بنا دے' دل' پھیپھڑے تخلیق کر دے۔ چونکہ غذاؤں میں کثافت ہے اور یہ غذائیں وہ غذائیں نہیں ہیں جن غذاؤں کو اللہ تعالیٰ نے لطیف کہا ہے تو ان غذاؤں سے نکلی ہوئی کثافت کے اخراج کا بھی اہتمام ہے۔

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ توکل اور استغناء کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین اس وقت کامل ہوتا ہے جب آدمی کی اندر وہ قوت متحرک ہو جائے جس قوت کا نام تصوف نے شہود رکھا ہے۔

شہود کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) علم الیقین (۲) عین الیقین (۳) حق الیقین۔

علم الیقین کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد انسان پر پہلی بات جو منکشف ہوتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ ہمارا خالق اللہ ہے ایسا اللہ جس نے ہماری تمام ضروریات کی کفالت اپنے ذمہ لے لی ہے۔ ضروریات پورا ہونا اور مسلسل پورا ہونا اور بغیر کسی مادی قانون کے پورا ہونا آدمی کو بالآخر یہ سوچنے پر اور یقین کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ فی الواقع رازق اللہ ہے۔ فی الواقع رب اللہ ہے۔ فی الواقع زندگی دینے اور زندگی لینے والا اللہ ہے۔ اللہ ہی عزت دیتا ہے' اللہ ہی ذلت دیتا ہے' اللہ ہی ابتداء ہے' اللہ ہی انتہا ہے۔ اللہ ہی ظاہر ہے اللہ ہی باطن ہے اور اللہ ہی ہر شے کو محیط ہے۔ اس منزل میں داخل ہوئے بغیر آدمی کے اندر کبھی استغناء پیدا نہیں ہوتا اور جس بندے کے اندر استغناء پیدا نہیں ہوتا وہ راہ سلوک کا بھٹکا ہوا مسافر ہوتا ہے اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جنہوں نے اپنی باطنی قوتوں کو بیدار اور متحرک کر کے ایسے کمالات اور خرق عادات کا اظہار کیا ہے کہ لوگ حیران ہیں' پریشان ہیں۔ بعض باتیں ان سے اس قسم کی بھی سرزد ہوتی ہیں کہ بڑے بڑے صاحب علم لوگ ان کی اس روحانی قوت پر ایمان لے آتے ہیں اور راستہ بھٹک جاتے ہیں۔ میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آدمی اپنی استطاعت اپنی صلاحیت اپنی استعداد اپنے ارادے سے خرق عادت تو پیدا کر سکتا ہے لیکن ایسے بندے کے اندر استغناء پیدا نہیں ہوتا۔ کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے کہ جو جادو ٹونے کا کام کرتے ہیں' لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور لوگوں کے بنے ہوئے کاموں کو خراب کر دیتے ہیں لیکن فیس لیتے ہیں کیا آپ نے ایسے عامل نہیں دیکھے کہ پیر کی گدی پر بیٹھے ہوئے ہیں صورت شکل فرشتوں جیسی بنائی ہوئی ہے قال اللہ اور قال رسولؐ کا چرچا ہے لباس بھی عین اسلام کے

مطابق ہے جبے قبے میں ڈھکے ہوئے ہیں لیکن لوگوں سے پیسے وصول کر رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں میرے پاس ایک خاتون تشریف لائیں انہوں نے جو عامل صاحب کا نقشہ کھینچا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی بہت ہی عابد' زاہد' زندہ' شب بیدار ہے۔ مسائل اور مشکلات کا حل یہ بتایا کہ صدقہ کر دو۔ خاتون نے پوچھا کس چیز کا صدقہ کروں؟ پیر صاحب نے بتایا کہ اونٹ کا صدقہ کر دو اور تین ہزار روپے لے لئے۔ میرے مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک سائل کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ پیر اور فقیر میں فرق ہے فقیر کی تعریف یہ ہے کہ اس کے اندر استغناء ملے گا اس کے اندر دنیاوی لالچ نہیں ہوگا وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اس کا کفیل صرف اور صرف اللہ ہے۔ اللہ اس کو اطلس وکمخواب پہنا دیتا ہے وہ خوش ہو کر پہن لیتا ہے' اللہ اس کو کھدر پہنا دیتا ہے۔ اس میں بھی وہ خوش رہتا ہے۔ اللہ اس کو لنگوٹی پہنا دیتا ہے۔ وہ اس میں بھی خوش رہتا ہے۔ اللہ اس سے لنگوٹی چھین لیتا ہے وہ اس میں بھی خوش رہتا ہے اور دوسری پہچان یہ فرمائی کہ جب تک بندہ فی الواقع کسی فقیر کی صحبت میں رہتا ہے اس کا ذہن صرف اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے شاذ و نادر ہی اسے دنیا کے کام کا خیال آتا ہے۔

خرقِ عادات کے ضمن میں آج کل سائنسی نقطہ نظر سے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان اپنی ذاتی کوششوں سے اور متعینہ مشقوں سے اپنے اندر ماورائی صلاحیتوں کو بیدار کر لیتا ہے۔ ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کے سلسلے میں یورپ اور بالخصوص روس میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے انسان اس بات کو یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر ہم عبادات و ریاضت کو ماورائی علوم کے حصول کا ذریعہ سمجھیں تو یہ بات بظاہر کمزور نظر آتی ہے کیونکہ روس جس کا مذہب پر کوئی عقیدہ نہیں ہے ماورائی علوم کے حصول میں قابلِ تذکرہ حد تک ترقی کر چکا ہے۔ تصوف میں ایک تذکرہ آتا ہے تصرّف کرنا یعنی شیخ اپنے مرید پر توجہ کر کے اس کے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ یہ تصرف آج کی دنیا میں ایک سائنس دان بھی کر لیتا ہے اور وہ ٹیلی پیتھی کے ذریعے اپنے حسب منشاء دوسرے آدمی کو متاثر کر کے اس کو وہ کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو اس کے ذہن میں ہوتا ہے۔ تصوف میں دوسری بڑی اور اہم چیز اندر دیکھنا ہے یعنی آدمی کے اندر ایسی باطنی نظر کام کرنے لگتی ہے جس نظر سے وہ اس سیارے سے باہر کی دنیا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ آج کے دور میں یہ بات بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ مراقبہ بھی ایک سائنس بن چکا ہے۔ یورپ میں لاکھوں کی تعداد میں ایسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو مراقبہ اور مراقبے کی کیفیات پر سیر حاصل بحث کرتی ہیں۔ تیسری چیز جو روحانیت' تصوف اور مذہب میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ ایسے علوم کا اظہار کرتا ہے جو علوم بظاہر

کتابوں میں نہیں ملتے۔ سائنس نے اس سلسلے میں بھی کافی پیش رفت کی ہے اور ایسے علوم کا اظہار ہو چکا ہے کہ جن پر شعور انسانی نے یقین بھی نہیں کیا اور بالآخر وہ چیزیں وجود میں آئیں اور انسان ان پر یقین کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ان حالات میں تصوف کی اصطلاحیں توجہ، تصرف، باطنی نگاہ کا کھلنا، (Time and Space) یا زمان و مکان سے آزادی ایک معمہ بن گئی ہے۔ اب تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ماورائی نظر کا متحرک ہونا صرف ذکر وفکر اور اشغال سے ممکن ہے۔ ان حالات میں یہ سمجھنا بہت ضروری ہو گیا ہے کہ جب ایسے لوگ جو مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتے تصرف کر سکتے ہیں۔ ان کے اندر باطنی نگاہ بیدار ہو سکتی ہے وہ نئے نئے علوم کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں پھر یہ تصوف کیا ہے؟ تصوف کے ساتھ ساتھ مذہب کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ مذہب کی بنیادیں بھی انہی اصولوں پر رکھی گئی ہیں کہ آدمی مذہبی فرائض پورے کرنے کے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی یا دوسروں کی زندگی میں تصرف کر سکے۔ اس کی باطنی نگاہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے لگے لیکن جب ہم مذہب کے پیروکاروں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہزاروں لاکھوں میں ہمیں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملتا جس کی تصرف کی طاقت بحال ہو گئی ہو اور جس کے اندر باطنی نگاہ کام کرتی ہو۔ یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے کہ مذہبی لوگ ان علوم سے بے خبر ہیں جن علوم کی نشان دہی ایسے لوگوں نے کی ہے جو مذہب پر عقیدہ نہیں رکھتے یا مذہب کو ایک مجبوری سمجھتے ہیں ان حالات میں ہر سنجیدہ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے تو پھر تصوف اور مذہب کیا ہے؟ اس بات کو ہم یہاں مختصر کر کے پھر اپنے اصل موضوع استغناء کی طرف لوٹتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں وضاحت کے ساتھ فرعون اور جادوگروں کا تذکرہ کیا ہے۔ فرعون نے جب یہ دیکھا کہ اس کی خدائی پر حرف آ رہا ہے اور حضرت موسیٰ اس کی تباہی اور بربادی کا ذریعہ بن رہے ہیں تو اس نے اپنی مملکت کے تمام جادوگروں کو دعوت دی کہ وہ آئیں اور حضرت موسیٰ سے مقابلہ کریں۔ اس دعوت میں جادوگروں کے لئے جو متوجہ کرنے کی سب سے بڑی چیز تھی وہ یہ تھی کہ اگر تم نے موسیٰ کو شکست دے دی تو تمہیں انعام واکرام سے مالا مال کر دیا جائے گا۔

ایک میدان اور تاریخ مقرر ہوئی۔ جادوگر جمع ہو گئے۔ موسیٰ بھی تشریف لائے۔ جادوگروں نے لاٹھیاں، بانس اور رسیاں میدان میں پھینکیں وہ سانپ بن گئے، اژدھے بن گئے۔ لگتا تھا کہ میدان بڑے بڑے سانپوں اور اژدھوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار اور سانپوں کی پھنکار تھی۔ صورت حال جب بہت نازک ہو گئی اتنی نازک کہ حضرت موسیٰ بھی گھبرا گئے۔ حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ ڈر مت! اپنا عصا پھینک۔ موسیٰ نے اپنا عصا زمین پر پھینک دیا۔ وہ عصا ایک بہت بڑا اژدھا بن کر میدان میں دوڑتے ہوئے

تمام سانپوں اور اژدھوں کو نگل گیا اور اس طرح فرعون جس کو اپنی دنیاوی دولت اور مال و اسباب پر گھمنڈ تھا ذلیل و خوار ہوا اور وہ جادوگر جو دولت اور انعام و اکرام کے لالچ میں دور دراز سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینے آئے تھے وہ بھی نامراد لوٹ گئے۔ اس واقعہ میں اگر تفکر کیا جائے تو بہت سادہ بات یہ ہے کہ جادوگروں نے جب بانس پھینکے تو ان سے خرق عادت کا ظہور ہوا اور وہ سانپ بن گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب عصا پھینکا وہ بھی اژدھا بن گیا اور تمام سانپوں کو نگل گیا۔ ابھی ہم نے عرض کیا ہے کہ آدمی اپنی کوششوں اور متعین طریقوں پر مشقیں کرنے کے بعد اس قابل بن جاتا ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے خرق عادت کا اظہار کر سکے جیسا کہ جادوگروں نے اپنے ارادے اور اختیار سے خرق عادت کو ظاہر کیا کہ ایک مخلوق نے اس کا مشاہدہ کیا لیکن اس میں ایک بنیادی فرق ہے جادوگر لاتعداد ہیں بانس اور رسیاں جو اژدھے اور سانپ بنے وہ بے شمار ہیں جادوگروں کو ایک بہت بڑے بادشاہ کا تعاون بھی حاصل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہا ہیں ان کا تکیہ' ان کا بھروسہ اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس بات کو اس طرح سمجھا جائے کہ جادوگروں کے دلوں میں چونکہ مال و دولت کی خواہش موجود ہے اس لئے ان میں استغناء نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر چونکہ استغناء تھا اس لئے استغناء کی قوت اور یقین نے جادوگروں کے تمام جادو کو برباد اور ختم کر دیا۔ یہی صورت حال تصوف میں توجہ' تصرف اور باطنی نگاہ کی بھی ہے۔ اگر کسی بندے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق خاطر پیدا نہیں ہوا اور اس کے اندر استغناء کی قوتیں نہیں ابھریں تو اس سے جو کچھ خرق عادت صادر ہو گی وہ استدراج ہے' جادو ہے۔ مذہبی عبادت کا بھی یہی قانون ہے۔ مذہب نے جو عبادتیں فرض کر دی ہیں ان فرائض کی ادائیگی میں اگر بندے کا ذہن اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہے تو یہ عبادت ہے ورنہ یہ عبادت نہیں ہے۔ کلمہ' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ یہ سب ارکان اس بنیاد پر قائم ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس طرح چاہتے ہیں اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی میں ہم کوئی کوتاہی نہ کریں لیکن اگر فرض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقین قائم نہ ہو تو یہ فرض کی ادائیگی نہ ہو گی اور بندہ بالآخر نقصان اور خسارے میں ہو گا۔

زندگی میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ عید کا چاند دیکھنے کے بعد بچوں کی عیدی کے سلسلے میں فکر لاحق ہوئی اور میں اپنے ایک دوست کے پاس کچھ روپے ادھار لینے کے لئے چلا گیا۔ دوست نے مجھ سے کہا۔ یہ روپے تو میرے پاس موجود ہیں لیکن کسی کی امانت ہیں۔ طبیعت نے اس بات کو گوارہ نہ کیا کہ دوست کو امانت میں خیانت کرنے کا مجرم قرار دیا جائے۔ وہاں سے چلتا ہوا میں بازار میں آ گیا۔ وہاں مجھے ایک دوست ملے۔ بہت اچھی طرح پیش آئے اور انہوں نے پیش کش کی کہ آپ کو عید کے سلسلے میں کچھ روپے پیسے کی ضرورت ہو تو لے لیں میرے پاس

کافی رقم موجود ہے۔ نہ معلوم طریقے پر میں نے ان کی اس پیشکش کو نامنظور کر دیا۔ انہوں نے کہا' صاحب میں نے آپ سے کسی زمانے میں کچھ روپے ادھار لئے تھے وہ میں ادا کرنا چاہتا ہوں اور انہوں نے میری جیب میں ساٹھ روپے ڈال دیئے۔ میں گھر چلا آیا اور ان ساٹھ روپوں سے عید کی تمام ضروریات پوری ہوگئیں۔ اس واقعہ پر بہت زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ دوست سے میں ۳۰ روپے ادھار لینے گیا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنے پیسے دلوا دیئے جو میری ضروریات کے لئے پورے تھے۔ ظاہر ہے اگر ۳۰ کروپے قرض مل جاتے تو ضرورت پوری نہ ہوتی۔ یہ پیسے اور روپے کے سلسلے میں دو واقعات میں نے گوش گزار کئے ہیں اس قسم کے بے شمار واقعات زندگی میں پیش آئے۔ ان بے شمار واقعات پیش آنے کے نتیجہ میں یہ یقین مستحکم اور پختہ ہوگیا کہ ضروریات کے واحد کفیل اللہ تعالیٰ ہیں' اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ ہم رازق ہیں تو وہ بہرحال رزق پہنچاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وہ کارندے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فی الارض خلیفہ کہا ہے اس بات پر کاربند ہیں کہ وہ مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے وسائل فراہم کریں۔ بہت عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں۔ جب تک وہ چاہتے ہیں آدمی زندہ رہتا ہے اور جب وہ نہیں چاہتے تو آدمی سیکنڈ کے ہزارویں حصہ میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن آدمی یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اپنے اختیار سے زندہ ہوں۔ معاشی سلسلہ میرے اپنے اختیار سے قائم ہے۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا' کسان جب کھیتی کاٹتا ہے تو جھاڑو سے ایک ایک دانہ سمیٹ لیتا ہے اور جو دانے خراب ہوتے ہیں یا گھن کھائے ہوئے ہوتے ہیں ان کو بھی اکٹھا کر کے جانوروں کے آگے ڈال دیتا ہے جس زمین پر گیہوں بالیوں سے علیحدہ کر کے صاف کیا جاتا ہے وہاں اگر آپ تلاش کریں تو مشکل سے چند دانے نظر آئیں گے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پرندے اربوں اور کھربوں کی تعداد میں دانہ چگتے ہیں ان کی غذا ہی دانہ ہے تو یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ کسان تو ایک دانہ نہیں چھوڑتا ان پرندوں کے لئے کوئی مخصوص کاشت نہیں ہوتی پھر یہ پرندے کہاں سے کھاتے ہیں؟ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا کہ قانون یہ ہے کہ پرندوں کا غول جب زمین پر اس ارادے سے اترتا ہے کہ ہمیں یہاں دانہ چگنا ہے۔ اس سے پہلے کہ ان کے پنجے زمین پر لگیں قدرت وہاں دانہ پیدا کر دیتی ہے۔ اگر پرندوں کی غذا کا دارومدار حضرت انسان یعنی کسان پر ہوتا تو سارے پرندے بھوک سے مر جاتے۔ دوسری مثال حضور بابا صاحبؒ نے یہ ارشاد فرمائی کہ چوپائے بہرحال انسانوں سے بہت بڑی تعداد میں زمین پر موجود ہیں۔ بظاہر وہ زمین پر اگی ہوئی گھاس کھاتے ہیں درختوں کے پتے چرتے ہیں۔ لیکن جس مقدار میں گھاس اور درختوں کے پتے کھائے جاتے ہیں۔ زمین پر کوئی درخت نہیں رہنا چاہیئے۔ قدرت ان کی غذا کی کفالت پوری کرنے کے لئے اتنی

بھاری تعداد میں درخت اور گھاس پیدا کرتی ہے کہ چرندے سیر ہو کر کھاتے رہتے ہیں۔ گھاس اور پتوں میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ ان درختوں اور گھاس کا تذکرہ ہے جس میں انسان کا کوئی تصرف نہیں ہے قدرت اپنی مرضی سے پیدا کرتی ہے' اپنی مرضی سے درختوں کی پرورش کرتی ہے' اور اپنی مرضی سے انہیں سرسبز و شاداب رکھتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جو زمین پر پھیلی ہوئی ہیں۔

آپ لوگ دیکھیں کہ جتنی بھی دنیاوی ترقی ہوئی ہے اس ترقی کا ماحصل صرف اور صرف دنیاوی لالچ ہے۔ جتنی بھی سائنس نے ترقی کی اس ترقی سے نوع انسانی مستفیض ہوئی لیکن جن لوگوں نے یہ ایجادات کیں ان کے پیش نظر مالی اور دنیاوی منفعت رہی۔ ہم طرز فکر کے بارے میں بہت واضح طور پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ موجود ہے اس کا تعلق براہ راست طرز فکر سے ہے۔ ایک طرز فکر وہ ہے جس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے اور ایک طرز فکر وہ ہے جس طرز فکر کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرز فکر کا مشاہدہ ہر آن اور ہر گھڑی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔ ''ہماری نشانیوں پر غور کرو تفکر کرو اور عاقل' بالغ' باشعور' سمجھ دار اور فہیم لوگ وہ ہیں جو ہماری نشانیوں پر غور کرتے ہیں'' اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں ظاہری' حواس سے دیکھی جانے والی نشانیاں جن سے ہم ہر وقت مستفیض ہوتے رہتے ہیں وہ ہوا' پانی' دھوپ اور رنگ ہیں۔ زمین میں نشوونما اور نئی نئی چیزیں تخلیق کرنے کی صلاحیت ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کی کوکھ سے ایسی ایسی چیزیں پیدا کیں جن چیزوں پر نہ صرف یہ کہ نوع انسانی بلکہ زمین کے اوپر جتنی بھی مخلوق موجود ہے اس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ہوا ایک ایسی نشانی ہے کہ جس سے زمین پر رہنے والا ایک متنفس بھی محروم نہیں ہے۔ پانی ایک ایسی نشانی ہے جو انسان کی زندگی کو فیڈ (Feed) نہ کرے تو زندگی ختم ہو جائے گی۔ نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی ختم ہو جائے گی۔ پورا سیارہ زندگی سے محروم ہو جائے گی۔ یہی حال دھوپ کا ہے۔ یہی حال چاندنی کا ہے۔ یہی حال درختوں کے سرسبز و شاداب ہونے کا ہے اور یہی حال رنگ برنگے پھولوں کا ہے۔ یہ ساری چیزیں براہ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہیں۔ ان تخلیقات پر جب تفکر کیا جاتا ہے تو بجز اس کے کوئی بات سامنے نہیں آتی کہ ان تمام تخلیقات سے اللہ تعالیٰ کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کو فائدہ پہنچے ایسا فائدہ کہ جس فائدہ کے پیچھے کوئی غرض' کوئی صلہ' کوئی مقصد' کوئی لین دین اور کوئی کاروبار نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام چیزیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ بندے اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں تو پھر ہم یہ کیسے تسلیم کریں گے کہ جو لوگ اللہ کی ذات و صفات کا انکار کرتے ہیں اور برملا کفر کی زندگی بسر کر رہے ہیں' ہوا ان کو بھی زندگی دے رہی ہے'

پانی سے وہ بھی سیراب ہو رہے ہیں۔ دھوپ میں جو حیاتین اور توانائی موجود ہے ان سے بھی انہیں فائدہ پہنچ رہا ہے۔ نوعِ انسانی سے ہٹ کر سانپ' بچھو' کنکھجورے اور بے شمار حشرات الارض بھی اللہ تعالیٰ کے اس مفت انعام سے مالا مال ہیں۔ اس مختصر سی تمہید سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر یہ ہے کہ وہ جب انعام فرماتے ہیں تو مخلوق کو بلا تخصیص اس سے فائدہ پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی طرف سے کسی صلہ یا ستائش کی غرض نہیں ہوتی۔ بس یہ ان کی شانِ کریمی ہے کہ انہوں نے مخلوق کو پیدا کیا اور اس مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے اتنے وسائل فراہم کر دیئے کہ فی الواقع مخلوق اس کا شمار بھی نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس جب ہم سائنسی ترقیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں سائنس کی ہر ترقی میں ذاتی منفعت اور دنیاوی لالچ ملتا ہے۔ یہ وہ طرزِ فکر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر کے متضاد ہے۔ ظاہر ہے جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر کے مطابق نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے پسندیدہ نہیں ہے۔ جتنا قربِ اللہ تعالیٰ سے بندے کو ہوتا ہے اسی مناسبت سے بندے میں اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس سے ایسے اعمال سرزد ہوتے رہتے ہیں جن سے مخلوق کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن اس بندے کا اپنا ذاتی فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔ تمام اولیاء کرام کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ انہوں نے نوعِ انسانی کی جو بھی خدمت کی اس خدمت کے پیچھے ان کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا اور اگر کسی بندے کا ذاتی فائدہ ہے تو وہ ہرگز اولیاء اللہ کی صف کا بندہ نہیں ہے۔ کوئی آدمی اپنی کوشش اپنی ریاضت سے اپنے اندر روحانی صلاحیتوں کو بیدار کر کے یقیناً خرقِ عادات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن اگر اس کی طرزِ فکر اللہ تعالیٰ کی طرزِ فکر سے ہم آہنگ نہیں ہے تو یہ تصوف نہیں ہے۔ ایک سائنس ہے۔ ایسی سائنس جو لامذہب لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں اور جیسا کہ اس زمانے میں ہو رہا ہے۔ انبیائے کرامؑ کی تعلیمات پر روحانی نقطۂ نظر سے اور قلبی مشاہدے کے ساتھ غور کیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انبیاءؑ کی ساری تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ بندے کی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ دیا جائے یعنی اگر بندہ انفرادی طور پر زندہ رہتا ہے تو اس لئے زندہ نہ رہے کہ اس کو اس کی مرضی کے بغیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہے اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر صلاحیتوں کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے تو جب اللہ تعالیٰ اسے توفیق دیں اور وہ ان صلاحیتوں کو استعمال کرے تو اس کے ذہن میں یہ بات رہے کہ میری صلاحیتوں کا اظہار اس لئے ہو رہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو فائدہ پہنچے۔ یہ کہنا کہ استغناء کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی خواہشات کو ختم کر دے' ہرگز صحیح نہیں ہے۔ یہ سراسر کوتاہ عقلی کی دلیل ہے اس لئے کہ زندگی بجائے خود خواہشات کا نام ہے۔ زندگی سے خواہشات کو نکال دیا جائے تو زندگی روشنیوں میں تحلیل ہو جائے گی کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ کیا پانی پینا' بھوک لگنا' سونے اور جاگنے کا تقاضا

بچوں کی خواہش پیدا ہونا' بچوں کی تربیت کرنا' اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کا تقاضا پیدا ہونا خواہشات نہیں ہیں۔ یہ سب خواہشات ہیں مراد یہ ہے کہ تمام خواہشات پوری کی جائیں لیکن خواہشات کو پورا کرنے میں انسان کا ذہن یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ چونکہ یہ چاہتے ہیں لہٰذا ہم یہ کر رہے ہیں۔ استغناء سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ آدمی ساری زندگی روزے رکھتا رہے۔ استغناء سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ وسائل عطا فرمائیں اور آدمی سوکھی روٹی کھاتا رہے۔ استغناء سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کرے اللہ کے لئے کرے اللہ تعالیٰ اگر اطلس وکمخواب کے کپڑے پہناتا ہے تو وہ کپڑے اس لئے پہنے کہ اللہ تعالیٰ نے پہنائے ہیں' اللہ تعالیٰ اگر ٹاٹ کے کپڑے پہنائے تو آدمی اس سے بھی اتنا ہی خوش رہے جتنا وہ اطلس وکمخواب کے کپڑے پہن کر خوش ہوتا۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ مرغی کھلائے تو وہ مرغی کھائے۔ لیکن اگر حالات کے تقاضے کے تحت آدمی کو چٹنی سے روٹی ملے یا ایک وقت روٹی ملے تو اس میں بھی اتنا ہی خوش رہے جتنا وہ مرغی کھا کر خوش ہوا تھا اور یہ صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ ہماری زندگی کی ہر حرکت ہر عمل ہماری گفتار کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بولنے کی صلاحیت دی ہم بولتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے ہمیں سننے کی صلاحیت عطا کی ہم سنتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوچنے سمجھنے اور تفکر کرنے کی صلاحیت دی ہے ہم سوچتے ہیں تفکر کرتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں اس لئے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ایسا کیا جائے۔

اسی قسم اور اسی قبیل کے لوگوں کے لئے ارشاد خداوندی ہے۔ ''وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ '' اور وہ لوگ جو راسخ فی العلم ہیں کہتے ہیں کہ یہ بات یقین اور مشاہدے میں ہے کہ ہر بات ہر چیز من جانب اللہ ہے۔ اس آیت کے مفہوم پر غور کیا جائے تو سوچنے اور سمجھنے کے کئی رخ متعین ہوتے ہیں۔ تفصیل میں جانے کی بجائے ہم دو رخوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''وہ لوگ علمی اعتبار سے مستحکم ذہن رکھتے ہیں یعنی ایسا ذہن جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا ذہن جو شیطانی وسوسوں سے پاک ہے' ایسا ذہن جس کے اندر کثافت اور علمی آلودگیاں نہیں ہیں۔ علمی کثافت اور علمی آلودگی سے مراد یہ ہے کہ اس علم سے بندوں کو تکلیف پہنچے۔ جس کو عرف عام میں تخریب کا عالم کہا جاتا ہے اور وہ لوگ جو علمی اعتبار سے ایسی مسند پر قیام فرما ہیں جس پر شکوک وشبہات کی چھاپ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا یقین اور ایمان ہے کہ ہر چیز اس کی دنیا میں کوئی بھی حیثیت ہو' چھوٹی ہو' بڑی ہو' راحت ہو' تکلیف ہو' ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ اس آیت مبارکہ میں مختصر دو رخوں کا ذکر اس طرح ہے کہ کچھ لوگ ہیں جو راسخ فی العلم ہیں اور ان لوگوں کا کہنا یہ ہے یا ان لوگوں کی پہچان یہ ہے یا ان لوگوں کی طرز فکر یہ ہے کہ

یہ بات ان کے مشاہدے میں ہوتی ہے کہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے' جو ہو چکا ہے' ہو رہا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے' اس کا براہ راست تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ہے اسی طرح اس چیز کا یا اس عمل کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ یا فلسفیانہ طرز فکر کو نظرانداز کرتے ہوئے عام سطح پر ہم اس بات کو چند مثالوں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

طرز فکر کے بارے میں یہ بات واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ زندگی کا ہر عمل اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے' اس حیثیت میں معانی پہنانا دراصل طرز فکر میں تبدیلی ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ ہر چیز جس کا وجود اس دنیا میں ہے یا آئندہ ہوگا۔ وہ لوح محفوظ پر لکھی ہوئی ہے۔ یعنی دنیا میں کوئی چیز اس وقت تک موجود نہیں ہو سکتی جب تک کہ پہلے سے لوح محفوظ پر موجود نہ ہو۔ کوئی آدمی اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیدا ہونے سے پہلے لوح محفوظ پر موجود ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے اس لئے گزرتا ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز دن اور ماہ و سال کے وقفے لوح محفوظ پر موجود ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان وقفوں میں ٹائم کی حیثیت کیا ہے؟ ایک آدمی جب عاقل بالغ اور باشعور ہوتا ہے تو اس کو زندگی گزارنے کے لئے وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے اور وسائل کو حاصل کرنے کے لئے روپیہ پیسہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ بات کچھ اس طرح ہے کہ ایک آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ روپے متعین کئے اور وہ ایک لاکھ روپے لوح محفوظ پر لکھے گئے۔ جس طرح ایک لاکھ روپیہ کسی بینک میں جمع کر دیا جاتا ہے اسی طرح ایک لاکھ روپیہ پہلے سے لوح محفوظ پر جمع ہے۔ وسائل کو استعمال کرنے کے لئے آدمی کوشش اور جدوجہد کرتا ہے۔ جیسے جیسے کوشش اور جدوجہد کے مراحل طے کرتا ہے اس کو روپیہ ملتا رہتا ہے اور ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ اگر لوح محفوظ پر اس کے حصہ کا زرمبادلہ متعین نہ ہو تو اسے اس دنیا میں کچھ نہیں مل سکتا۔ ایک طرز فکر یہ ہے کہ آدمی باوجود اس کے کہ ضمیر ملامت کرتا ہے اپنی روزی کو حرام طریقے سے حاصل کرتا ہے۔ دوسرا آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ روزی حلال ہو۔ رزق حلال سے بھی وہ دو روٹی کھاتا ہے اور رزق حرام سے بھی وہ شکم سیری کرتا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اس دنیا میں اسے جو کچھ مل رہا ہے وہ لوح محفوظ سے مل رہا ہے اور لوح محفوظ میں وسائل اس کے لئے پہلے سے متعین ہیں۔ ایک آدمی محنت مزدوری کر کے ضمیر کی روشنی میں روپیہ حاصل کرتا ہے۔ دوسرا آدمی ضمیر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اسے اتنا ہی روپیہ مل رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کے لئے جمع کر دیا ہے اس لئے کہ جب تک لوح محفوظ پر کوئی چیز نقش نہیں ہوتی دنیا میں اس کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے اور انتہائی درجہ نادانی اور بے وقوفی ہے کہ

آدمی اپنی ہی چیز کو حرام کر دیتا ہے اور اپنی ہی چیز کو حلال کر دیتا ہے۔ قانون یہ ہے کہ جو چیز لوح محفوظ پر نقش ہو گئی اس کا مظاہرہ لازم بن جاتا ہے۔ راسخ فی العلم لوگ اس بات کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ ہر مظہر کا تعلق' ہر عمل کا تعلق' ہر حرکت کا تعلق لوح محفوظ سے ہے۔ اس لئے وہ برملا اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے اور اس اعلان کے ساتھ ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے لئے جو کچھ متعین کر دیا وہ ضرور ملے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظروں کے سامنے یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ ہمارے لئے لوح محفوظ پر اتنا سرمایہ یا اتنے وسائل مخصوص کر دیئے گئے ہیں بالکل اس طرح جیسے کسی آدمی کو یہ معلوم ہو کہ بینک میں میرے نام سے ایک کروڑ روپیہ جمع ہے۔ چونکہ مظاہراتی طور پر یہ بات اس کے یقین میں ہے کہ میرے نام سے ایک کروڑ روپیہ جمع ہے وہ اس بات سے مطمئن رہتا ہے۔ راسخ فی العلم لوگ چونکہ لوح محفوظ کے نقوش کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ اس لئے وہ کسی تکلیف کو یا کسی آرام کو عارضی تکلیف یا عارضی آرام سمجھتے ہیں اور اس مشاہدے کے بعد ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں مخصوص کر دی ہیں وہ ہمیں ہر حال میں میسر آئیں گی اور یہ یقین ان میں استغناء کی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھ سے فرمایا کہ استغناء بغیر یقین کے پیدا نہیں ہوتا اور یقین بغیر مشاہدے کے تکمیل نہیں پاتا اور جس آدمی میں استغناء نہیں ہے اس آدمی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے کم اور مادیت سے زیادہ رہتا ہے۔ تصوف اور روحانیت دراصل ایسے اسباق کی دستاویز ہے جن اسباق میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ سکون کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر استغناء ہو۔ استغناء کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکل ہو۔ توکل کو مستحکم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر ایمان ہو اور ایمان کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر وہ نظر کام کرتی ہو جو نظر غیب میں دیکھتی ہے۔ بصورت دیگر کسی بندے کو کبھی سکون میسر نہیں آ سکتا۔

آج کی دنیا میں عجیب صورت حال ہے کہ ہر آدمی دنیا کے پیچھے بھاگ رہا ہے' ہر آدمی دولت کے انبار اپنے گرد جمع کرنا چاہتا ہے اور یہ شکایت کرتا ہے کہ سکون نہیں ہے' سکون نہیں ہے۔ سکون ہرگز کوئی عارضی چیز نہیں ہے۔ سکون ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو یقینی ہے اور جس کے اوپر کبھی موت واقع نہیں ہوتی۔ ایسی چیزوں سے جو چیزیں عارضی ہیں' فانی ہیں اور جن پر ہماری ظاہری آنکھوں کے سامنے بھی موت وارد ہوتی رہتی ہے ان سے ہرگز سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ مراقبہ اس سلسلے میں ایک ایسی کوشش ہے جس کوشش پر یہ طرزیں متعین ہیں کہ آدمی فانی اور مادی چیزوں سے اپنے ذہن کو ہٹا کر حقیقی اور لافانی چیزوں میں تفکر کرے۔ یہ تفکر جب قدم قدم چلا کر غیب کی دنیا میں کسی

بندے کو پہنچاتا ہے تو سب سے پہلے اس کے اندر یقین پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہی یقین کی کرن دماغ میں پھوٹتی ہے وہ نظر کام کرنے لگتی ہے جو نظر غیب کا مشاہدہ کرتی ہے۔ غیب میں مشاہدے کے بعد کسی بندے پر جب یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات کی باگ ڈور ایک واحد ہستی کے ہاتھ میں ہے تو اس کا تمام تر ذہنی رجحان اس ذات پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ اور اس مرکزیت کے بعد استغناء کا درخت آدمی کے اندر شاخ در شاخ پھیلتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

السلام وعلیکم!

حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ کے مزار پر حاضری

مرشدِ کریم کی یادوں میں سے لاہور کی فضاؤں میں ایک یاد وہ ہے جب مرشدِ کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے اہالیانِ لاہور کے ہمراہ بڑے حضرت جی یعنی حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ کے مزار پر حاضری دی۔

مزار پر مرشدِ کریم نے پھولوں کی چادر چڑھائی۔ مراقبہ کرایا اور مراقبے کے بعد اجتماعی دعا کرائی گئی۔

دعا کے بعد مرشدِ کریم فرمانے لگے کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ سے ملاقات بھی میری وجہ سے ہوئی تھی۔ ہوا ایسے کہ میں حضرت ابوالفیض قلندر صاحب کی لکھی ہوئی ایک کتاب لے کر گیا اور قلندر بابا اولیاءؒ کو دی۔ انہوں نے کتاب کو بے حد پسند فرمایا اور فرمانے لگے کہ ''خواجہ صاحب! اگر ایک خاص زاویۂ نگاہ سے کسی کتاب کو پڑھا جائے تو کتاب لکھنے والے کا ذہن سامنے آ جاتا ہے کہ اس نے یہ کتاب کس غرض سے اور کس نسبت سے لکھی ہے''۔

اس کے بعد کافی دیر تک مرشدِ کریم اپنے ماضی کی باتیں دہراتے رہے جنہیں ہم یہاں بیان کرنے کی حتی المقدور کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کو یہ دلچسپ تحریر ضرور پسند آئے گی۔

آخر میں مزار پر لنگر تقسیم کیا گیا۔ لنگر تقسیم کرنے کے بعد مرشدِ کریم کی مزار سے واپسی ہوئی۔

مرشدِ کریم فرمانے لگے کہ جب میری باطنی نظر کھل گئی تو اللہ تعالیٰ نے مرشدِ کریم کے صدقہ میں مجھ پر بڑا کرم کیا اور بہت روحانی فیض جاری ہو گیا۔

میرا ذہن شروع سے ہی مذہب میں خوف اور ڈر سے متعلق خیالات سے باغی تھا۔ میرا تو ایک ہی عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا نہیں چاہیئے بلکہ محبت کرنی چاہیئے۔ ہمارے ہاں مولوی حضرات بندے کو خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ سے ڈراتے رہتے ہیں۔ مجھے ان کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ یا تو ان کے خلوص میں کمی ہے اور عقیدت میں وہ جذبہ نہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے تو

بندہ کیوں نہ کرے۔ میں اپنے اندر کھلنے والی باطنی آنکھ کے مقصد کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا کہ ان کیفیات کا وارد ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور پھر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس کے لیے میں مرشد کامل کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

مرشدِ کریم فرمانے لگے کہ میں سلسلہ عالیہ چشتیہ کے ایک بزرگ حافظ صاحب کے بہت قریب تھا۔ حافظ صاحب میرے دادا حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے خلیفہ تھے اور ان کے روحانی ورثہ کو مجھ تک پہنچانے پر مامور کیے گئے تھے۔ حافظ صاحب نے چند وظائف تعلیم کیے اور ان کے ورد کی تلقین فرمائی۔ میں نے وظائف اور روحانی اسباق کا آغاز کیا۔ ان دنوں میرے معاشی حالات نہایت ابتر تھے۔ میرے شریک کار نے مجھے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ میں روحانی اسباق چھوڑ دوں۔ جب میں کسی طرح راضی نہ ہوا تو ایک حکیم صاحب کو میرے پیچھے لگا دیا۔ میں ان کو بزرگ مانتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک بات ہی کہا کرتے تھے کہ یہ سب کام بڑھاپے میں کیے جاتے ہیں۔ تم کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ ادھر حالات اتنے خراب ہو گئے کہ روٹی کپڑا چلانا مشکل ہو گیا۔ میں نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور سبق پڑھنا ترک کر دیا۔

چشتیہ سلسلے کے اسباق چھوڑنے کے چھ ماہ بعد مجھے اطلاع ملی کہ حافظ صاحب وصال فرما گئے ہیں' تو میرے دل و دماغ پر گہری چوٹ لگی۔ میں اسی کرب میں مبتلا تھا کہ سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ چودھری صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔

ان کے توسط سے حضرت ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ سے بھی ملاقات ہوئی جو حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے مرشد ہیں۔

ایک بار پھر کسی دوست سے ملنے ڈان اخبار کراچی کے دفتر گیا تو وہاں حضرت قلندر بابا ولیاءؒ سے ملاقات ہو گئی۔ میں ان کے حسنِ سلوک سے بے حد متاثر ہوا۔ حضرت قلندر بابا اولیاءؒ ڈان میں سب ایڈیٹر کے عہدے پر فائز تھے۔

حضرت قلندر بابا اولیاءؒ کا اصل نام سیّد محمد عظیم برخیاؔ تھا۔ آپ سلسلہ عظیمیہ کے بانی ہیں۔ ۱۸۹۸ء میں قصبہ خورجہ ضلع بلند شہر (یوپی) بھارت میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے تھے۔ آپ درویش اور قلندر تھے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے بیعت ہونے سے پہلے ایک روز میں میکلوڈ روڈ (کراچی) پر جا رہا تھا کہ مجھے

آسمان سے آواز آئی۔ ''حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کو سوا لاکھ مرتبہ درود شریف' تین لاکھ مرتبہ کلمہ طیبہ اور پانچ قرآن پڑھ کر بخش دے''۔

پھر آواز آئی......

''پانچ قرآن حضرت اویس قرنیؒ اور پانچ قرآن حضرت خضرؑ کو پڑھ کر ایصالِ ثواب کرو۔''

میں نے ہاتف غیبی کی اس آواز کی تعمیل میں عمل شروع کر دیا۔ اوقات یہ مقرر کئے ظہر کی نماز کے بعد سے مغرب تک کلمہ طیبہ اور عشاء کی نماز کے بعد سے تہجد تک درود شریف۔

جب کلمہ طیبہ تین لاکھ مرتبہ پورا ہوا تو میرے اوپر غیب منکشف ہونے لگا اور دل میں وقفہ وقفہ سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وقت گزرتا رہا اور میں دیوانہ اپنے کام میں مشغول رہا۔

ایک روز بس میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرا دل بڑا ہوتے ہوتے بھینس کے دل جتنا ہو گیا۔ اور ایک آواز کے ساتھ پھٹ گیا اور کٹے ہوئے انار کی طرح اس میں قاشیں بن گئیں۔ ان قاشوں میں سے تیز اور روشن لہریں نکلنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ جہاں تک یہ لہریں جا رہی ہیں مجھے گرد و نواح اور اطراف میں سب چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ میں نے یورپ کے بہت سے شہر' برفانی پہاڑ' کشمیر اور آسام کے پہاڑ اور زعفران کے کھیت دیکھے۔ جیسے ہی زعفران کے کھیتوں پر نظر پڑی' زعفران کی خوشبو پوری بس میں پھیل گئی۔ لوگ حیران ہو ہو کر آگے پیچھے دیکھے جا رہے تھے۔ دو ایک حضرات نے کہا کسی کے پاس زعفران ہو گا۔ یا کسی نے زعفران کا سینٹ لگا رکھا ہو گا۔ میں ان تمام باتوں کو سنتا رہا اور مشاہدات میں مگن رہا۔ میں نے پہلی مرتبہ دل کی ان شعاعوں میں فرشتوں کا مشاہدہ کیا۔ ناظم آباد میں جب بس سے اترا تو حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بس سے میرے ساتھ حضرت حافظ صاحب بھی اترے اور میرے بائیں طرف خاموش چلنے لگے۔ انہیں دیکھ کر میں دہشت زدہ ہو گیا۔ حافظ صاحب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر خود اوپر اٹھے اور میرے سر کے اوپر فضا میں چلنے لگے۔ میں گھر پہنچ کر بے سدھ لیٹ گیا۔ دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہی اور مجھے نیند آ گئی۔

اگلے روز صبح سہروردی سلسلے کا سبق پڑھ رہا تھا کہ میرے دادا' حضرت حافظ صاحب اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی تشریف لائے اور تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھ کر چلے گئے۔

رات کو پھر درود شریف پڑھ رہا تھا کہ دیکھا میرے منہ سے جیسے ہی درود شریف پورا ہوتا ہے' ایک بہت ہی خوبصورت سنہرے تھال میں اسے رکھ لیا جاتا ہے اور اس کے اوپر بہت عمدہ خوان پوش ڈھک کر آ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تک

پہنچایا جا رہا ہے۔ میرے گھر سے مدینہ منورہ تک فرشتوں کی ایک جماعت کھڑی ہوئی ہے۔ جیسے ہی درود شریف ختم ہوتا ہے' وہ فرشتے میرے منہ کے سامنے گول تھال کر دیتے ہیں اور درود شریف تھال میں رکھا جاتا ہے اور وہ تھال دوسرے فرشتے کو بڑھا دیتا ہے۔ دوسرا تیسرے کو اور تیسرا چوتھے کو۔ اسی طرح فرشتوں کی یہ جماعت ایک ہاتھ سے دوسرے کو پہنچا کر دربار حضورﷺ میں پہنچا رہی ہے اور حضورﷺ ہاتھ لگا کر قبول فرما رہے ہیں۔ تقریباً تین گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

میں نے دل پھٹنے اور مشاہدات کی ساری واردات چوہدری صاحب سے بیان کی تو چوہدری صاحب نے فرمایا۔ ''حافظ صاحب میرے معاملہ میں دخل دینے والے کون ہوتے ہیں؟''

پھر میرے پاس تین مرتبہ آ چکے ہیں مگر میں اپنے معاملات میں کسی کا دخل پسند نہیں کرتا۔

چوہدری صاحب نے تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کیں اور ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی آنکھوں کو زور سے دبایا اور میرا دل پھر بند ہو گیا۔ اب میں پھر اندھا تھا اور غیب نظر آنا بند ہو گیا۔

رات کو پھر حافظ صاحب تشریف لائے۔ چہرے سے زبردست جلال ٹپک رہا تھا۔ آپ نے میرے سر کے بالکل بیچ میں زور سے پھونک ماردی۔ اس پھونک کے اثر سے میں زمین سے اچھل پڑا اور میرا دل پھر کھل گیا۔

غصہ کی آواز میں فرمایا۔ ''اب دیکھوں گا کیسے بند کرتے ہیں''۔

جب میں آسمانوں میں فرشتوں کو دیکھنے لگا۔ صبح بس میں بازار جا رہا تھا کہ لسبیلہ کے پل پر جب بس چڑھی تو دیکھا کہ چوہدری صاحب بابا غلام محمد صاحب کو ساتھ لے کر آ گئے بابا غلام محمد صاحب نے میرے دل پر انگلی رکھ دی اور میرا دل پھر بند ہو گیا اور غیب میں کام کرنے والی نظر ختم ہو گئی۔

اب حافظ صاحب حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے پاس آئے اور ان سے فرمایا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کیا ہو رہا ہے۔ اب اس معاملہ میں' میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا: ''چوہدری صاحب میرے پیر بھائی ہیں۔ میں اپنے شیخ کے احترام کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا''۔

اس افتاد کے بعد میری یہ کیفیت ہو گئی کہ مجھے ہر وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرے سر پر کئی ٹن وزن رکھا ہوا ہے۔ سڑک پر چلتے چلتے بیٹھ جاتا تھا۔ بار بار ایسا ہوتا کہ میں چکرا کر زمین پر گر جاتا تھا۔ جسم تیزی کے ساتھ لاغر ہوتا

چلا گیا اور اس حد تک لاغر ہوا کہ پنڈلیوں کا گوشت خشک ہو گیا اور میں ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے ''سوکھے'' کی بیماری ہو گئی ہے۔

چھ مہینے اسی حال میں گزر گئے۔ ایک روز میں بازار سے واپس آ رہا تھا کہ میرے پیر کے اوپر سے ٹرک کا پہیہ گزر گیا اور میں ٹرک کے نیچے آتے آتے بچا۔ جی میں آیا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں ٹرک کے نیچے آ کر ختم ہو جاتا۔ موت کے روٹھ جانے پر گھر آ کر میں بہت رویا اور میری ہچکیاں بندھ گئیں اور میں نے اپنے آقا قلندر بابا اولیاءؒ سے عرض کیا۔ ''میرے لیے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔ میں اب بالکل زندہ نہیں رہنا چاہتا''۔

حضور نے تسلی دی اور فرمایا۔ میں حافظ صاحب سے بات کروں گا اور بڑے حضرت جی کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ اس معاملہ کو کسی نہ کسی صورت سے حل کریں۔

روئداد طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ سلسلہ سہروردیہ اور سلسلہ چشتیہ کے بزرگ آپس میں مل کر بیٹھے۔ حضرت چوہدری صاحب سے کہا گیا کہ اپنے اس مرید کو فارغ کر دیں۔ مگر چوہدری صاحب نے فرمایا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اس کو اپنے ذہن کے مطابق تیار کرنا چاہتا ہوں۔

جب کوئی بات طے نہ ہو گی' تو اس پر حافظ صاحب نے فرمایا۔ ''یہ بڑی ہی عجیب بات ہے کہ ایک آدمی محض اس لیے انتظار کرے کہ اسے ایک مخصوص ذہن کے مطابق تیار کیا جائے جب کہ اس کے دادا اس کے لیے ورثہ چھوڑ گئے ہیں اور سیدنا حضورﷺ سے اس کو منظور بھی کرایا ہے۔ اب میں اس کو عدالت عالیہ میں پیش کروں گا۔''

حضرت حافظ صاحب نے حضور حسن بصری کو اپنا وکیل مقرر فرمایا اور تائید میں جن حضرات نے عدالت عالیہ میں پیش ہونا منظور فرمایا وہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ' حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، حضرت معروف کرخیؒ، حضرت امام موسیٰ'' رضا'' حضرت امام حسینؓ اور حضرت اویس قرنیؓ تھے۔

میں رات کے وقت درود شریف پڑھ رہا تھا۔ میرے پاس ایک فرشتہ آیا اور کہا کہ چلو بڑی سرکار میں آج تمہاری پیشی ہے۔

میں نے دیکھا دو جگ کے سرتاج فخر انبیاء رحمۃ اللعالمین تخت پر تشریف فرما ہیں۔ بائیں جانب حضرت اویس قرنیؓ ایستادہ ہیں اور دائیں جانب حضرت حسن بصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ،

حضرت معروف کرخیؒ، حضرت امام موسیٰ رضاؒ، حضرت امام حسینؓ، حضرت امام حسنؓ اور بڑے حضرت جی ہیں اور بالکل سامنے چوہدری صاحب اور میں ہوں۔

سیدنا حضورعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔

حضرت حسن بصری صف میں سے نکل کر نگاہیں نیچی کئے ہوئے سامنے آ گئے اور درود و سلام کے بعد عرض کیا۔"یا رسول اللہ! میرے موکل کے دادا نے آپ کی منظوری سے اپنے پوتے کے لئے ورثہ چھوڑا ہے اور اس ورثہ کو حاصل کرنے کی جو شرط انہوں نے عائد کی تھی وہ میرے موکل نے پوری کر دی ہے اور میرے موکل نے سلسلہ چشتیہ میں بیعت بھی حاصل کی ہے اور اس کے شیخ نے چشتیہ' سہروردیہ' نقشبندیہ' قادریہ میں اپنے اس مرید کو بیعت کیا تھا۔ بیعت کے بعد مرید کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ تو ان چاروں سلسلوں میں سے بیعت ہو گیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ شیخ کے انتقال کے بعد مرید سہروردیہ سلسلہ میں پھر بیعت ہو گیا۔ عرض یہ کرنا ہے کہ حضور کی منظوری کے بعد جب کہ مرید نے شرط پوری کر دی ہو اس کا ورثہ اسے قانوناً ملنا چاہیئے۔ مگر سہروردیہ سلسلہ کا ایک فرد جو سلسلہ سہروردیہ میں مقام رکھتا ہے، اس بات پر آمادہ نہیں ہے۔"

حضورعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دائیں طرف ایستادہ بزرگوں کو دیکھا۔ سب نے تائید کی۔ پھر حضرت چوہدری صاحب کی طرف دیکھا۔ حضرت چوہدری صاحب دو قدم آگے آئے اور کہا۔"یا رسول اللہ! قانون یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا مرید ہو جاتا ہے تو وہ پیر کا حق بن جاتا ہے۔ مجھے قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ میں جس طرح چاہوں اپنے مرید کی تربیت کروں اور اس قانون پر آپ کے دستخط ہیں"۔

حضورعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر دائیں صف کی طرف دیکھا (جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کوئی تائید کرتا ہے یا نہیں)۔

بڑے حضرت جی صف میں سے باہر آ گئے اور حضرت چوہدری صاحب کے ساتھ جا کھڑے ہوئے اور حضورعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت چوہدری صاحب کے حق میں فیصلہ دے کر دربار برخاست فرما دیا۔

میرے حالات اب مزید دگرگوں ہو گئے۔ ہر وقت سینہ سے دھواں اٹھتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایک بڑی مصیبت یہ ہو گئی کہ ہر شب بلا ناغہ بدخوابی ہو جاتی۔ جس سے رہی سہی جان بھی جواب دے گئی۔ ساتھ ہی پیچش میں بھی مبتلا ہو گیا۔ کھانا کھاتے ہی اجابت کی ضرورت ہو جاتی۔ نیند کوسوں دور۔ ہر وقت یاس اور ناامیدی کا غلبہ۔ لوگ ہنستے تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ میں سوچا کرتا کیا دنیا میں ہنسی بھی کوئی شے ہے۔ مجھے چپ لگ گئی۔ دل ہر وقت اداس اور بے چین رہتا۔ دنیا کی ہر چیز میرے لیے ناخوشی اور عذاب کا پہلو رکھتی۔ رات

کو اندھیرے میں اٹھ کر روتا۔ مر جانے کی دعائیں مانگتا اور سوچتا کہ موت بھی مجھ سے کنارہ کر گئی ہے۔ معمولی سے شور سے دل دہل جاتا۔ کوئی زور سے بات کرتا تو دماغ پر ہتھوڑے کی ضرب پڑتی۔ اس نشتر زدہ زندگی میں تین سال گزر گئے۔ ایک روز میں نے حضور قلندر بابا اولیاءؒ سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں ان کی مدد فرمائیں تاکہ وہ اس تکلیف سے نجات پا سکیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا دیکھیں اللہ کو کیا منظور ہے۔ اس کے چند روز بعد ایک روز تہجد کی نماز کے بعد میں نے درود خضری پڑھنے کے دوران خود کو سرکارِ دو جہاں سرورِ کائنات حضورعلیہ کے دربار اقدس میں حاضر پایا اور مشاہدہ کیا کہ حضورعلیہ تخت پر تشریف فرما ہیں۔ میں نے حضورعلیہ کے تخت کے سامنے دو زانو بیٹھ کر درخواست کی۔

''یا رسول اللہ! اے اللہ کے حبیبؐ، اے باعثِ تخلیقِ کائناتؐ محبوب پروردگارؐ، رحمت للعالمینؐ، جن و انس اور فرشتوں کے آقاؐ، حالِ کون و مکاںؐ، مقام محمودؐ کے مکین، اللہ تعالیٰ کے ہم نشینؐ علمِ ذات کے امینؐ، خیر البشرؐ، میرے آقا! مجھے علم لدنی عطا فرما دیجئے۔ میرے ماں باپ آپؐ پر نثار...... آپ کو حضرت اویس قرنیؒ کا واسطہ' حضرت ابو ذر غفاریؓ کا واسطہ' آپ کو آپؐ کے رفیق حضرت ابو بکرؓ کا واسطہ، آپ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا واسطہ، آپ کو حضرت بی بی فاطمہؓ ' علیؓ اور حسینؓ کا واسطہ اپنے اس غلام پر نظر کرم فرما دیجئے!

میرے آقا! آپ کو قرآن کریم کا واسطہ، آپ کو اسم اعظم کا واسطہ، آپ کو تمام پیغمبروں کا واسطہ، آپؐ کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کا واسطہ اور ان کے ایثار کا واسطہ! میرے آقا! میں آپؐ کے در کا بھکاری ہوں۔ آپؐ کے سوا کون ہے جس کے سامنے دست سوال دراز کروں۔ میں اس وقت تک در سے نہیں جاؤں گا جب تک آپؐ میرا دامن مراد نہیں بھر دیں گے۔

آقا! میں غلام ہوں، غلام زادہ ہوں۔ میرے جد امجد حضرت ابو ایوب انصاریؓ پر آپ کی خصوصی رحمت و شفقت کا واسطہ مجھے نواز دیجئے!

دریائے رحمت جوش میں آ گیا۔

فرمایا۔ کوئی ہے؟

دیکھا کہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ دربار میں آ کر مؤدب ایستادہ ہیں اس طرح جیسے نماز میں نیت باندھے کھڑے ہوں۔ نہایت ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں آپ کا غلام حاضر ہوں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا۔ تم اس کو کس رشتہ سے وراثت دینا چاہتے ہو؟

حضور قبلہ نے فرمایا۔ اس کی والدہ میری بہن ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا۔ ''خواجہ ایوب انصاریؓ کے بیٹے ہم نے تجھے قبول کیا''۔ میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے پاس ۱۶ سال قیام پذیر رہا۔ دن رات کے اس ساتھ میں قلندر بابا اولیاءؒ نے تربیت کا فریضہ بطریق احسن پورا فرمایا۔ تربیت کے مراحل پورے ہونے پر حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے علم لدنی اور اپنا ذہن منتقل فرما دیا۔

مزار شریف حضرت سید ابوالفیض قلندر علی سہروردیؒ ملتان روڈ لاہور

مرشد کریم پنجاب یونیورسٹی میں خطاب کے بعد واپس آ رہے ہیں

لاہور بار ایسوسی ایشن سے خطاب

مورخہ فروری ۲۰۰۰ء میں خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے لاہور بار ایسوسی ایشن سے خطاب کیا۔ اس پروگرام کا انعقاد ایوانِ عدل میں کیا گیا تھا۔ جب خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب بار روم میں آئے تو لاہور بار ایسوسی ایشن کے صدر ایڈووکیٹ شاہد مقبول شیخ، نائب صدر چوہدری لیاقت علی، میاں محمد سعید اور عابد حسین جعفری ایڈووکیٹ نے آپ کا نہایت گرم جوشی اور عقیدت سے استقبال کیا۔ اس موقع پر لاہور مراقبہ ہال کے نگران میاں مشتاق احمد عظیمی اور عبدالمجید عظیمی صاحب بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ آخر میں بار کی طرف سے ریفرشمنٹ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

الشیخ عظیمی صاحب نے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ٥

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ. كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْد. اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ. كَمَا بَرَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْد.

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ٥ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ٥ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ٥ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ٥ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ ٥ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ٥ (آمین)

السلام علیکم!

آپ حضرات نے میری عزت افزائی فرمائی یہ بلاشبہ اللہ کا انعام ہے۔ میں جو آپ حضرات کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مادی جسم اور روحانی جسم کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ مادی جسم کیا ہے اور روحانی جسم کیا ہے؟

اصل مادی جسم ہے یا روحانی جسم؟

اگر اصل مادی جسم ہے تو انسان مر کیوں جاتا ہے؟

مرنے کے بعد مادی جسم فنا کیوں ہو جاتا ہے؟

روح جسم سے نکلنے کے بعد کہاں جاتی ہے؟

روح سے واقف ہوا جا سکتا ہے یا نہیں؟

انسانی کا یہ جو مادی وجود ہے یہ کسی طور پر بھی (Independent) نہیں ہے اس کی مثال یہ ہے کہ پیدائش پر ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخصوص نظامِ پیدائش بنایا ہے۔ اس نظام کے تحت کوئی بچہ کسی بادشاہ کے گھر پیدا ہو یا فقیر کے گھر پیدا ہو جائے، اس میں اس کی اپنی خواہش اور چوائس کا عمل دخل نہیں ہے۔

روح کیا ہے؟

اس بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے۔

''یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے روح میرے ربّ کے امر سے ہے''۔

چونکہ روح امر ہے اللہ کا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میرے بندے مجھے یاد کرتے ہیں تو میں ان کا ہاتھ، کان، زبان اور آنکھیں بن جاتا ہوں۔ میرے سچے بندے جب میرے بھروسے پر میری قسم اٹھا لیتے ہیں تو میں اسے پورا کرتا ہوں۔ لیکن یہ مقام اور قربت کا احساس اجاگر کرنے کے لئے ہمیں کلام رب العالمین پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ اللہ نے ہماری رہنمائی کے لئے اور اس احساس اور پہچان کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے جو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ہماری اصل روح ہے۔ روح کے بغیر ہمارا جسم محض ایک لباس ہے۔ جسم کے تمام حرکات و اعمال روح کے محتاج ہیں۔ ہماری تمام جسمانی طاقت، ہمارا اختیار محض روح ہے روح کے نکلتے ہی جسم ایک بے حرکت لباس رہ جاتا ہے۔ جب انسان اس بات کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ دنیا مسافر خانہ ہے تو اس کا ذہن اس ذات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جس نے اسے مسافر بنا کر یہاں بھیجا ہوا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے ''مر جاؤ مرنے سے پہلے'' اس کے معنی اور مفہوم پر غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس زندگی میں ہی آخرت کی زندگی سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ گہرائی سے غور و فکر کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقفیت دراصل روح سے واقفیت ہی ہے۔ روح سے واقف ہو کر ہی اللہ کو پہچانا جا سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آواز سن کر روح کا ذہن اللہ کی طرف متوجہ ہو چکا ہے۔ روح کی آنکھ اللہ تعالیٰ کا دیدار کر چکی ہے اور روح کی زبان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر چکی ہے۔ اگر ہم اپنی اسی اصل یعنی روح سے واقف ہو جائیں تو اللہ کو دیکھ سکتے ہیں۔ روحانیت کو سمجھنا ہرگز مشکل کام نہیں بات صرف سمجھنے کی ہے۔ اللہ نے راہنمائی فرما دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''ہم نے قرآن کو سمجھنا آسان کر دیا تو ہے کوئی جو اسے سوچے سمجھے''۔ اس حقیقت کو سمجھیں۔ قرآن پاک کو غور و فکر کے ساتھ پڑھیں اور سمجھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ یہ بات یہ حقیقت قابلِ تفکر ہے کہ روح فنا نہیں

ہوتی۔جسمِ انسانی فنا ہوتا ہے۔ جو چیز فنا نہیں ہوتی اسے ہم کیوں تلاش نہیں کرتے۔ دراصل روح کی پہچان ہی اللہ کی قربت کا ذریعہ ہے۔

میں آپ لوگوں کی توجہ ایک اور نقطے کی طرف کرنا چاہتا ہوں کہ انسان کا اصل جسم اس کی رُوح ہے اور یہ روح جسم کو سنبھالنے کے لئے ایک اور جسم تخلیق کرتی ہے جسے سائنسدان (Aura) اور روحانی لوگ جسمِ مثالی کہتے ہیں۔جسمِ مثالی گوشت پوست کے جسم سے تقریباً ۹ انچ اوپر ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔

انسانی گوشت پوست کے جسم کا دارومدار اسی (Aura) کے اوپر ہے۔ (Aura) کے اندر صحت مندی موجود ہے تو گوشت پوست کا جسم بھی صحت مند ہے۔ یوں کہئے کہ جس طرح گوشت پوست کے جسم کے اوپر اللہ تعالیٰ نے دو لینز فٹ کر دیئے ہیں جن کے ذریعے مادی دنیا میں موجود تمام چیزوں کا عکس دماغ کی سکرین پر منتقل ہو کر ڈسپلے ہوتا ہے اسی طرح جسم مثالی کے اندر جو کچھ موجود ہے اس کا پورا پورا اثر گوشت پوست کے جسم پر مرتب ہوتا ہے۔ روشنیوں کا بنا ہوا یہ جسم صرف انسان کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ زمین کے اوپر جتنی مخلوق موجود ہے' روشنیوں کے جسم سے (Feed) ہوتی ہے۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے اگر بیان کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ انسانی زندگی کے اندر جتنے تقاضے موجود ہیں وہ تقاضے گوشت پوست کے جسم میں پیدا نہیں ہوتے۔ جسمِ مثالی میں پیدا ہوتے ہیں اور وہاں سے منتقل ہو کر گوشت پوست کے جسم کے اوپر ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس بات کی خواہش کرتا ہے کہ اس کو روٹی کھانی ہے تو بظاہر ہمیں یہ بات نظر آتی ہے کہ گوشت پوست کا بنا ہوا جسم روٹی کھا رہا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے جسمِ مثالی کے اندر بھوک کا تقاضا پیدا نہیں ہوگا اور جسم مثالی یا (Aura) گوشت پوست کے جسم کو بھوک یا پیاس کا عکس منتقل نہیں کرے گا آدمی کھانا نہیں کھا سکتا۔ یہ کوئی کہانی نہیں ہے اور کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو اچنبھے کی ہو۔ یہ کوئی ایسا دقیق مسئلہ بھی نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آ سکے۔ ہم جو خواب کی حالت میں دنیا بھر کی سیر کرتے ہیں اور تمام وہی اعمال و حرکات ہم سے سرزد ہوتی ہیں جو ہم گوشت پوست کے جسم کے ساتھ کرتے ہیں وہ دراصل جسمِ مثالی کی ایک ایسی حرکت ہے جو وہ گوشت پوست کے جسم کو میڈیم بنائے بغیر کرتا ہے۔ یاد رکھیئے! خواب کوئی خیالی بات نہیں ہے۔ اسی طرح حقیقت ہے جس طرح ہم مفروضہ حواس میں رہتے ہوئے بیداری کی زندگی کو حقیقی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً خواب کے دوران آدمی کے اوپر ایک ایسی کیفیت یا حالت طاری ہوتی ہے کہ اسے صبح بیدار ہونے کے بعد غسل کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ جس طرح بیداری میں اس عمل کے تاثرات قائم ہوتے ہیں اور وہ نہانے دھونے اور کپڑوں کی پاکی اور صفائی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اسی طرح خواب میں کئے ہوئے اس عمل کے بعد بھی وہ

پاکی، صفائی اور نہانے دھونے پر مجبور ہے جس طرح وہ بیداری میں اس عمل کو کرنے کے بعد بھی نہانے دھونے اور پاک صاف ہوئے بغیر نماز قائم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح خواب میں کئے ہوئے اس عمل کے بعد بھی وہ نماز قائم نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ پاک صاف نہ ہو جائے یہ ایک ایسی بنیادی مثال ہے جس سے دنیا کا ایک فرد بھی منکر نہیں ہو سکتا۔ ہر وہ شخص جو صحت مند ہے اور جوانی کو پہنچا ہے وہ ایک دو چار دس بیس مرتبہ اس عمل سے ضرور گزرتا ہے یہ کہنا کہ (Aura) یا جسمِ مثالی کی حرکات وسکنات محض واہمہ ہیں' اس لئے صحیح نہیں ہے کہ عمل کے بعد تاثرات ایک جیسے قائم ہوتے ہیں۔ یہ ہماری روزمرہ زندگی میں پیش آنے والی ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ تمام آسمانی صحائف میں خوابوں کا ایک سلسلہ موجود ہے اور تمام آسمانی صحائف نے خوابوں کو مستقبل بینی کا ایک روشن ذریعہ قرار دیا ہے۔ مستقبل سے مراد زمان و مکاں سے ماوراء اس عالم میں دیکھ لینا ہے جو عالم ظاہری آنکھ نہیں دیکھتی۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان دراصل گوشت پوست کا بنا ہوا نہیں ہے' اس کے اجزائے ترکیبی میں جہاں مٹی کے ذرات کام کر رہے ہیں وہاں مٹی کے ذرات کے اوپر روشنی کا ایک ہالہ مستقل اور مسلسل اس کو قائم رکھے ہوئے ہے روشنی کا ہالہ جسمِ مثالی (Aura) اگر مٹی کے ذرات سے اپنا رشتہ منقطع کر لے تو یہ ذرات فنا ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ آدمی جب مرتا ہے تو جسمِ مثالی یا (Aura) اس سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے' یہ مرنا یا فنا ہونے کا طریقہ انسان کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے' بلکہ ہر چیز ایک وقت معین پر مرجاتی ہے۔ ایک وقت آئے گا' اس زمین کے اوپر محیط روشنیوں کا ہالہ بھی زمین کے گلوب سے اپنا رشتہ منقطع کر لے گا۔

مرنے کے بعد یہ بات کہنا کہ آدمی کے اندر سے روح نکل گئی' صحیح نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ مرا ہوا آدمی اپنے عزیزوں اور اقربا کی ارواح سے جا ملا' یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ روحانی نقطہ نظر سے اس بات کی تشریح کی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ جسمِ مثالی نے مٹی کے ذرات سے بنائے ہوئے جسم کو نظر انداز کر کے اور قطع تعلق کر کے اپنا رشتہ اس سے منقطع کر لیا اور دوسرے عالم میں وہاں کی فضا کے مطابق ذرات یکجا کر کے اپنا نیا جسم اپنے لئے تخلیق کر لیا۔ یہ جو عالم اعراف میں ایک وسیع دنیا آباد ہے آدم سے لے کر اب تک اور قیامت تک اس دنیا کی آبادی میں برابر لوگ منتقل ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے دراصل یہ اِس عالم سے اُس عالم میں آدمی کا منتقل ہونا ہے یعنی جسمِ مثالی کی منتقلی ہے۔ عربی زبان میں اسی لئے اس عالم میں جانے کا نام انتقال کرنا ہے یعنی اس عالم سے اُس عالم میں آدمی منتقل ہو گیا۔ جسمِ مثالی زندگی میں ہمہ وقت متحرک اور سرگرم رہتا ہے۔ اس کی اپنی صفات میں سے ایک مخصوص صفت یہ ہے کہ جب تک یہ اپنے لباس سے کلی طور پر قطع تعلق نہیں کر لیتا اس کی بھرپور حفاظت کرتا ہے۔ اس کی مثال ہمیں

خواب میں ملتی رہتی ہے ایک آدمی سویا ہوا ہے نیند بہت گہری ہے۔ نیند میں وہ امریکہ سیر کر رہا ہے اور جسم یہاں پڑا ہے۔ اس کے پیر میں سوئی چبھوئی جاتی ہے تو کراچی میں سویا ہوا آدمی امریکہ سے چل کر فوراً اپنے لباس کی پاسبانی کے لئے آ موجود ہوتا ہے سوئی چبھونا' امریکہ سے جسم مثالی کا کراچی میں آ جانا اتنا قلیل وقفہ ہے کہ جس کی پیائش کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے اس پیائش کو آپ لمحے کے کھربواں حصہ کہہ سکتے ہیں اور لمحے کا کھربواں حصہ کہنا پیائش کے دائرے میں نہیں آتا۔ مقصد یہ ہے کہ جسمِ مثالی کے لئے (Time and Space) کوئی چیز نہیں ہے لیکن (Time and Space) میں بند ذرات سے جب یہ اپنے لئے ایک جسم اختراع کرتا ہے تو اس کو (Time and Space) کی حد بندیوں میں بند رکھنے کے لئے پوری پوری حفاظت کرتا ہے۔ اس عالم سے اس عالم میں منتقل ہونے کے بعد اس عالم کے اندر ہوا اور مٹی کے جن ذرات سے لباس بنتا ہے ان ذرات میں مٹی کے ذرات پر روشنیوں کا جو ہالہ موجود ہے وہ اس عالم میں ذرات پر موجود روشنیوں کے ہالے سے کم طاقتور ہے۔ ر[illegible] ہونا ہی دراصل کشش ثقل ہے۔ مرنے کے بعد جو عالم ہے اس کو عالم اعراف کہتے ہیں۔ عالم اعراف کے بعد ایک اور عالم ہے۔ اس عالم کا قانون بھی یہی ہے کہ جس طرح جسمِ مثالی عالمِ ناسوت سے اپنا رشتہ منقطع کر کے اور یہاں کا بنایا ہوا لباس چھوڑ کر عالمِ اعراف میں ایک نیا لباس بناتا ہے اسی طرح عالمِ اعراف سے نکل کر عالمِ حشر ونشر میں ایک نیا لباس بناتا ہے۔ عالمِ حشر ونشر کی جو فضا ہے وہ عالمِ ناسوت اور عالمِ اعراف سے یکسر مختلف ہے وہاں روشنیوں کا ہالہ اور زیادہ طاقتور ہے۔ عالمِ حشر ونشر میں ذہنی رفتار اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ جسمِ مثالی کی ریکارڈ کی ہوئی زندگی سامنے آ جاتی ہے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ہر آدمی کے ہاتھ میں اس کا نامہ اعمال ہوگا اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ عالم حشر ونشر کے بعد یوم المیز ان ہے۔ یوم المیز ان میں اس روشنیوں کے بنے ہوئے جسم کے اوپر نور کا ایک ہالہ آ جاتا ہے' یہی وہ نور ہے جس نور سے کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے ''کوئی آنکھ اللہ کا ادراک نہیں کر سکتی اللہ ادراک بن جاتا ہے''۔ اس آیت مقدسہ کی تفسیر یہ ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ کے ادراک سے دیکھتا ہے تو اس کی پہلی نظر یوم المیز ان پر پڑتی ہے۔ یوم المیز ان کے بعد جنت یا دوزخ کے عالم ہیں۔

زندگی عالمِ ناسوت کی ہو' عالمِ اعراف کی ہو' عالمِ حشر ونشر کی ہو یا جنت اور دوزخ کی ہو۔ اس زندگی کا دارومدار تقاضوں کے اوپر ہے۔ یہ بات قانون ہے کہ تقاضوں کے اجزائے ترکیبی یا عناصر علم ہیں۔ جب تک کسی تقاضا کی تکمیل کے لئے علم موجود نہیں ہوگا۔ تقاضہ زیر بحث نہیں آئے گا۔ زندگی کا ایک بنیادی تقاضا بھوک اور پیاس ہے اگر بھوک کے بارے میں ہمیں یہ علم حاصل نہ ہو کہ بھوک زندگی گزارنے اور زندگی کو قائم رکھنے اور زندگی کو متحرک

رکھنے کے لئے ایک عمل ہے تو ہم بھوک سے ناآشنا ہوں گے۔ ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے اور جسمانی نشوونما کے لئے کچھ کھانا ضروری ہے۔ کچھ کھانا دراصل ایک علم ہے اور اس علم کے اندر یہ بات موجود ہے کہ کن چیزوں کے کھانے سے جسمانی صحت بحال رہتی ہے اور کن چیزوں کے استعمال سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے اس علم کا مجموعی نام تقاضا ہے۔ یہی صورت حال پیاس کی ہے' غیض وغضب کی ہے' رحمت ومحبت کی ہے' نیند اور خواب کی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہنا درست ہے کہ جب تک کسی چیز کا علم ہمیں حاصل نہیں ہوتا ہم اس چیز سے واقف نہیں ہوتے۔ علم کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی سورس ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس سورس سے حاصل شدہ علوم کے لئے کوئی ایسی ایجنسی موجود ہو جہاں علم آ کر ذخیرہ ہو۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ کوئی ایسی ایجنسی موجود ہو جو اس علم کے اندر معانی پہنا سکے اور آخری حد میں ایسی ایجنسی کا موجود ہونا لازم ہے جس پر علم کا مظاہرہ ہو سکے۔ آدمی کو بھوک لگی یعنی اس کو یہ اطلاع ملی ہے کہ اب جسم کو کچھ کھانے کی ضرورت ہے۔ جس ایجنسی نے یہ اطلاع قبول کی اس نے اس علم کے اندر معانی پہنائے۔ وہ یہ ہے کہ روٹی کھانی چاہئے' پھل کھانے چاہئیں اور اس اطلاع کو جسمِ مثالی نے قبول کر کے مظاہرہ کیا اور آدمی نے یہ محسوس کیا کہ اس نے روٹی کھا لی ہے جہاں تک جسمانی تقاضے پورا کرنے کا تعلق ہے وہ عالمِ ناسوت ہو یا عالمِ اعراف ہو یا عالمِ دوزخ یا عالمِ جنت ہو ایک ہی صورت واقع ہو رہی ہے۔ جنت اس لئے جنت ہے کہ وہاں دودھ اور شہد کی نہریں ہیں۔ جنت میں پھل ہیں اور آدمی کی آسائش اور آرام کے لئے بے شمار وسائل ہیں۔ دوزخ اس لئے دوزخ ہے کہ وہاں ایسے وسائل میں آدمی زندگی گزارنے پر مجبور ہے جو تکلیف دہ ہیں۔ بات وہی علم کی ہے کہ علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اگر کوئی بندہ چاہے تو وہ اتنا پابند اور مجبور ہے کہ وہ ایک گھنٹہ میں تین میل کا سفر طے کرتا ہے اور اگر کوئی آدمی چاہے تو وہ اتنا آزاد اور خودمختار ہے کہ وہ ایک قدم اٹھا کر جب دوسرا قدم رکھتا ہے تو یہ سفر ساتوں آسمانوں پر محیط ہوتا ہے یعنی آدمی نے بیٹھے ہوئے یہ ارادہ کیا کہ عرشِ معلیٰ پر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوں اور ارادے کے ساتھ ہی اس کے سامنے یہ بات مشاہدہ بن جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفاتِ حمیدہ کے ساتھ عرش پر موجود ہیں اور بندہ ان کے سامنے سربسجود ہے یہ کہنا کہ انسان روحانی طور پر آسمانوں کی سیر نہیں کر سکتا یا اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز نہیں ہو سکتا یا کہنا کہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا اتنی بڑی جہالت اور اتنا بڑا ظلم ہے کہ جس کے سامنے کوئی بڑی جہالت اور کوئی بڑا ظلم نہیں آ سکتا۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ ایک انسان روشنیوں کے دوش پر امریکہ سے کراچی منتقل ہو جاتا ہے۔ بلا کسی فاصلہ کے بلا کسی وقفہ کے وہ بات امریکہ میں کرتا ہے ہم ٹی وی پر اسے یہاں پاکستان میں دیکھتے ہیں' سنتے ہیں۔ یہ تذکرہ ہے وسائل میں محدود رہتے

ہوئے ترقی کا۔ کوئی بندہ اگر اپنے اندر اس صلاحیت سے واقف ہو جائے جس صلاحیت نے ٹی وی ایجاد کر دیا تو اس کے لئے یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ دنیا کے اس کونے سے اُس کونے میں یا اِس عالم سے اُس عالم میں اپنے ارادہ اور اختیار سے منتقل ہو جائے۔ پہلے جو باتیں جادو اور طلسمات کے نام سے مشہور تھیں اور جن کو ہم مضحکہ خیز کہانی قرار دیتے تھے آج وہی سب چیزیں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں آدمی کس قدر عجیب ہے۔ ایک طرف اتنا بے بس اور مجبور ہے کہ سو قدم کی آواز نہیں سن سکتا اور دوسری طرف اتنا آزاد ہے کہ اپنی ہی ایجادات کے ذریعے ہزاروں میل کی آواز سن لیتا ہے۔

قرآن پاک میں تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کھانا جنت میں بھی میسر ہے اور کھانا دوزخ میں بھی میسر ہے۔ جنت کا کھانا دودھ' شہد' پھل فروٹ ہے اور دوزخ کا کھانا زقوم' تھور ایسی غذائیں ہیں جن سے آدمی کے اندر کراہت پیدا ہوتی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ کھانے کا علم دونوں جگہ موجود ہے کھانے کے اسباب اور سامان بھی دونوں جگہ موجود ہیں۔ لیکن دونوں کی معنویت الگ الگ ہے۔ جنت کا کھانا اس لئے اچھا ہے کہ اس میں معنویت اچھی ہے بھوک کا جو علم ہے اس علم کے اندر جو مفہوم ہے وہ آرام و آسائش کا ہے۔ علیٰ ہذا لقیاس دوزخ کے اندر بھوک کا جو علم ہے اس کے اندر کراہت پشیمانی' تکلیف اور آہ و بکا ہے۔ مختصر طور پر اس بات کو اس طرح کہا جائے گا کہ یہ ساری کائنات دراصل ایک علم ہے۔ علم کی طرزیں یہ ہیں کہ اس میں معانی پہنائے جاتے ہیں۔ جسمِ مثالی ایک ایسی ایجنسی ہے جو علم میں معانی پہناتی ہے۔ جب آدمی عالم ارواح سے نزول کر کے اس دنیا میں وارد ہوتا ہے تو جسمِ مثالی اس عالم کے اندر ایسے معانی اور مفہوم اخذ کرتا ہے جس میں آدمی قید ہے بند ہے گرفتار ہے ہر ہر قدم قید و بند میں بندھا ہوا ہے جسمِ مثالی جب عالمِ ناسوت سے باالفاظ دیگر اس گوشت پوست کے جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر کے دوسرے عالم میں جاتا ہے اور وہاں کی فضا اور ماحول سے اپنے لئے ایک نیا لباس بناتا ہے تو اس کے معانی اور مفہوم بدل جاتے ہیں۔

پیدائش سے موت تک اور موت کے بعد کی زندگی میں اعراف' حشر و نشر' حساب و کتاب' جنت و دوزخ اور اللہ تعالیٰ کی تجلی کا دیدار سب کا سب یقین کے اوپر قائم ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ آدمی کو سب سے پہلے اس بات کا یقین پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے وہ موجود ہے اس کے اندر عقل و شعور کام کرتا ہے وہ ایک حد تک بااختیار ہے اور بڑی حد تک اس کے اوپر غیر اختیاری کیفیات نازل ہوتی رہتی ہیں۔

علیٰ ہذالقیاس زندگی کے بنیادی عوامل اور وہ تمام محرکات جن پر زندگی رواں دواں ہے انسان کے اختیار میں

نہیں ہیں۔ اگر ہم بنیاد پر نظر ڈالیں تو زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب آدمی پیدا ہوتا ہے اور پیدائش پر انسان کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ لاکھوں سال کے طویل عرصے میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہوا جو اپنے ارادے اور اختیار سے پیدا ہو گیا ہو۔ پیدا ہونے والی ہر چیز پیدا ہونے والا ہر فرد ایک وقت متعینہ کے لئے اس دنیا میں آتا ہے اور جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو آدمی ایک سیکنڈ کے لئے بھی اس دنیا میں ٹھہر نہیں سکتا' مر جاتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جن کے بارے میں زیادہ سوچ بچار تفکر' یا ذہنی گہرائی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر لمحہ' ہر آن' ہر منٹ' ہر سیکنڈ یہ صورت حال واقع ہو رہی ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں' چاہتے ہیں تو آدمی صحت مند پیدا ہوتا ہے نہیں چاہتے تو آدمی کی نشو ونما میں ایسا سقم واقع ہو جاتا ہے کہ اس کے اعضاء صحیح ہوتے ہیں نہ اس کا دماغ صحیح ہوتا ہے۔ اس کی نظر بھی صحیح کام نہیں کرتی۔ ہاتھ پیروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو پکڑ نہیں سکتا اپنی مرضی سے چل پھر نہیں سکتا۔ سائنس کتنی بھی ترقی کر لے پیدائشی اپاہج اور معذور بچوں کا علاج اس کے پاس نہیں ہے اور اس قسم کے معذور بچوں کو یہ کہہ کر رد کیا جاتا ہے کہ یہ پیدائشی معذور ہیں' یہاں بھی انسان کی بے بسی اور بے اختیاری اظہر من الشمس ہے۔

انسان کے اس اصل جسم سے واقفیت کے لئے سلسلہ عظیمیہ کا قیام عمل آیا۔ سلسلہ عظیمیہ ایک مشن ہے جو ہمارے مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے حکم سے شروع ہوا۔ اور ہمارا مشن یہ ہے کہ آج کا انسان بے سکون ہے اسے سکون سے آشنا کیا جائے۔ ہم لوگوں کو تعلیم دیتے ہیں کہ غم، غصہ، نفرت، تفرقہ اور غیبت سے بچو۔ اپنی روح، جسمِ مثالی سے واقف ہوں تا کہ اشرف المخلوقات اور انسانیت کا شرف جو ذاتِ باری تعالیٰ کے ادراک و عرفان سے بخشا گیا ہے اس سے مشرف ہوا جا سکے۔

اس مقصد کے لئے ہم نے سب سے پہلے کراچی میں ایک سینٹر قائم کیا اور اسے مراقبہ ہال کا نام دیا۔ اس کے بعد بتدریج پورے ملک حتیٰ کہ پوری دنیا میں ایسے مراکز یعنی مراقبہ ہالز قائم کئے گئے جہاں پر لوگوں کو جسمانی اور روحانی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ سب فی سبیل اللہ ہے۔ میری آپ سب لوگوں سے درخواست ہے بلکہ تاکید ہے کہ آپ لوگ

''متحد ہو کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو''

کی تفسیر بن جائیں۔

السلام علیکم!

☆.....☆.....☆

کتاب ''ہمارے بچے'' کی تقریبِ رونمائی سے خطاب

مارچ ۲۰۰۱ء کو لاہور کے الحمراء آڈیٹوریم میں حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی کتاب ''ہمارے بچے'' کی تقریبِ رونمائی منعقد ہوئی۔ تقریب میں چیئرمین پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ محمد اظہر طاہر، ممتاز دانشور اور ادیب اشفاق احمد، ایڈیٹر نوائے وقت مجید نظامی، ڈپٹی کنٹرولر ایف۔ ایم ریڈیو لاہور عبیدہ سید، چیئرمین شعبہ ابلاغیات پنجاب یونیورسٹی محمد شفیق۔ ڈین فیکلٹی شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی جمیلہ شوکت، صدر روٹری کلب محمد عبدالوہاب اور سروسز ہسپتال لاہور کے ایم۔ ایس ڈاکٹر مظہر الدین نے خصوصی شرکت فرمائی۔ اس کے علاوہ مختلف سکولوں کے پرنسپلز، اساتذہ کرام اور بچوں کی بڑی تعداد نے بھی شرکت کی۔

مسکین حجازی، شفیق احمد جالندھری اور عبیدہ سید نے اپنے خطابات میں عظیمی صاحب کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ نگران مراقبہ ہال لاہور، میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے اس کتاب کو بچوں کے تدریسی نصاب میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی۔ عظیمیہ روحانی لائبریری برائے خواتین جوہر ٹاؤن لاہور کی لائبریرین اسماء صاحبہ نے انتظامیہ کی جانب سے تمام مہمانانِ گرامی، اساتذہ کرام اور بچوں کا بڑی تعداد میں شریک ہونے پر شکریہ ادا کیا۔

اس پروگرام میں عظیمی صاحب کو بچوں نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ مختلف سکولز کے طلباء و طالبات نے ٹیبلو پیش کئے، نعت خوانی کی گئی اور قصیدہ بُردہ شریف پڑھا گیا۔ تقریب کے آخر میں مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ مرشدِ کریم نے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم o

السلام علیکم!

آج اس تقریب میں موجود بچوں کی بڑی تعداد میرے لئے حوصلہ افزاء ہے۔ اساتذہ نے ان بچوں کی تربیت پر بھرپور توجہ دی ہے جو نہایت قابلِ تحسین ہے۔ آج کا انسان اس لئے بے سکون اور پریشان ہے کہ میرے خیال میں بچپن سے دور ہو گیا ہے۔ آپ دیکھیں کہ بچوں میں سکون اور اطمینان کی طرزیں بڑوں سے زیادہ ہوتی

ہیں۔ بچے جتنے سکون سے زندگی گزارتے ہیں اور سوتے ہیں بڑے اتنے سکون سے نہ تو زندگی گزارتے ہیں اور نہ ہی ان کو اتنی پرسکون نیند میسر ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ میرے کپڑے کیسے بنیں گے؟ میرے جوتے کیسے آئیں گے؟ میرے سکول کی فیس کس طرح ادا کی جائے گی؟ مجھے کھانا کیسے میسر آئے گا؟ میں پانی کیسے پیوں گا؟ مجھے فلاں چیز کیسے حاصل ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ وہ اپنے تمام معاملات کو اپنے والدین کے سپرد کر کے اپنی ساری توجہ زیادہ سے زیادہ سیکھنے اور حاصل کرنے پر مرکوز کر دیتا ہے۔ بچپن کے اس رویے میں بڑوں کے لئے ایک انتہائی زبردست پیغام چھپا ہوا ہے۔ وہ پیغام یہ ہے کہ ''اگر بڑے اپنا کفیل اللہ تعالیٰ کو مان لیں تو ان کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے''۔ کفیل تو سب کا اللہ ہی ہے اور اللہ ہی اپنی مخلوق کی تمام ضروریات ہر لمحہ پوری کر رہا ہے۔ لیکن جب انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ روزی تلاش کر سکے تو اکثر اس کا یقین ٹوٹ جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس کی کفالت کر رہا ہے۔ نتیجے میں وہ بے سکون ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارا یقین اللہ پر قائم ہو جائے جس طرح ہم بچپن میں اپنے والدین پر یقین رکھتے تھے تو ہمارے اندر سکون داخل ہو جائے گا۔

رواں دواں پانی کو دیکھ کر آدمی اس لیے متاثر ہوتا ہے کہ اس کے لاشعور میں یہ بات موجود ہے کہ پانی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے ایک اہم عنصر ہے۔ خنک لطیف ہوا کے جھونکوں سے آدمی اس لیے پرکیف ہو جاتا ہے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ لطیف اور خنک ہوا آدمی کی بنیادی ضرورت آکسیجن فراہم کرتی ہے۔ خوشنما لباس پہن کر آدمی اس لیے اپنے اندر فرحت محسوس کرتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات موجود ہے کہ خوشنما چیزیں دوسروں کو متاثر کرتی ہیں اور خوشنمائی خود انسان کے لیے ایک بہترین خوشی کا ذریعہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر، اس میں حیوانات یا انسان کی کوئی تخصیص نہیں آدمی کے اوپر ایک بے خودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں اس کا اپنا بچپن محفوظ ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم اس بات کو اس طرح کہیں گے کہ ایک بڑا بوڑھا آدمی بچے کو دیکھ کر اپنے ماضی کے بچپن میں لوٹ جاتا ہے کیونکہ بچے فطری اور جبلی طور پر خوش رہتے ہیں اس لیے جب ایک ساٹھ سالہ، بیس سالہ یا پچیس سالہ آدمی اپنے بچپن میں داخل ہوتا ہے تو اس کے اوپر وہی تمام تاثرات غالب آ جاتے ہیں جو بچوں کی زندگی کا خاصہ ہیں۔

حضور پاک ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اُس کے والدین اُسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں''۔...

حضور پاک ﷺ کا یہ ارشاد بہت زیادہ فکر طلب ہے

ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بچہ فطرت سے واقف ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق..... فطرت میں تبدیلی نہیں ہوتی!....

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اور جس دنیا میں نامعلوم مقام سے آتے ہیں اُس میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں

جب بچہ اس دنیا میں پہلا قدم رکھتا ہے تو وہ دراصل ایک ایسے مقام میں داخل ہوتا ہے جس کا اپنا ایک ماحول ہے.. اس ماحول کی پہلی سیڑھی محدودیت ہے

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج پیدا ہونے والا بچہ لامحدود مقام سے نکل کر محدود مقام میں داخل ہوا جب ہم لامحدودیت اور محدودیت کا ذکر کرتے ہیں تو اُس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مقام ہے جہاں پابندی نہیں ہے فاصلوں کا تعین نہیں ہے. وقت کی تنگی نہیں ہے اور کسی مخصوص منزل کا تعین نہیں ہے اور جب محدودیت کی بات کرتے ہیں.. اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب ہم چلتے ہیں تو دو قدم چلنے میں بھی محدودیت ہمارے اوپر مسلط ہوتی ہے اور پچاس قدم چلنے میں بھی ہم محدودیت کی بھول بھلیوں سے آزاد نہیں ہوتے

منزل کے تعین کے بغیر سفر نہیں ہوتا مقام کے تعین کے بغیر ہم کسی شے کا نام نہیں رکھ سکتے دن اور سال کے تذکرے کے بغیر ہم عمر کا حساب نہیں لگا سکتے نام کے بغیر ہماری شناخت نہیں ہوتی والدین کے بغیر ہمارا وجود مشکوک بن جاتا ہے. باپ بننا ماں بننا بیٹا ہونا خاندان ہونا ہر ضرورت کے لئے ذی احتیاج ہونا.. کنبہ برادری اور قوم میں شمار ہونا .. یہ سب محدودیت ہے!

بچہ جب ماں کے محدود وجود سے اپنے وجود کا ادراک کرتا ہے تو دراصل یہ ادراک محدودیت کا ادراک ہے..

پیدائش کے بعد ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بچہ جس محدود مقام سے آیا ہے اُس لامحدود مقام کو بھول گیا ہے لامحدود مقام کی لامحدود صفات اس کے اندر موجود ہوتی ہیں جیسے جیسے بچہ محدودیت میں زندگی بسر کرتا ہے... سیکنڈوں، منٹوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں میں اسی مناسبت سے محدودیت کا پردہ تہہ در تہہ موٹا ہوتا رہتا ہے. اور لامحدودیت اس پردے کے پیچھے چھپتی رہتی ہے..... محدودیت کے Behaviour سے یہ پردہ اتنا دبیز ہو جاتا ہے کہ اس کو اگر پہاڑ سے تشبیہ دی جائے تو یہ تشبیہ مناسب ہے

پردہ کتنا ہی موٹا اور دبیز ہو جائے لیکن سوچ اور فکر کی بساط لامحدود ہی رہتی ہے...... کسی بھی لمحہ لامحدودیت سے رشتہ نہیں ٹوٹتا... لیکن شعور لامحدودیت سے متصل ہونا نہیں چاہتا..... اور اُس کے اوپر لرزہ طاری ہو جاتا ہے.....

یہی وہ احساس ہے جسے ہم خوف کہتے ہیں...... اور یہی وہ خوف ہے جسے ہم موت کہتے ہیں...... حالانکہ زمین پر پیدا ہونے والا کوئی فرد اِس بات سے انکار ہی نہیں کرسکتا وہ مرے گا نہیں۔ "كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوتْ"

ڈھائی سال کے بچے کو ہم اسکول میں داخل کرتے ہیں..... صبح سویرے بچے کو گہری نیند سے زبردستی اُٹھایا جاتا ہے...... اسکول کی تیاری کے لئے..... اسکول کی بس میں بٹھا دیا جاتا ہے...... اسکول میں بچہ چار گھنٹے سے آٹھ گھنٹے تک رہتا ہے...... آٹھ گھنٹے کے بعد جب وہ گھر آتا ہے تو اُس کو تھوڑے سے آرام کے بعد ہوم ورک کرایا جاتا ہے... شام کو ٹیوٹر صاحب ٹیوشن پڑھانے آ جاتے ہیں......

ماں کی آواز بچے کے کان میں اُترتی چلی جاتی ہے کہ جلدی سو جاؤ صبح اسکول جانا ہے...... اور یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ میٹرک تک قائم رہتا ہے..... محدود دنیا کے محدود حساب کے تحت میٹرک تک کا وقت تقریباً چالیس ہزار گھنٹے بنتا ہے...... یعنی ہمارا بچہ اپنی زندگی کے چالیس ہزار گھنٹے گزار کر صرف اِس قابل ہوتا ہے کہ وہ اِس بات کا فیصلہ کر سکے کہ اُسے معاش کے لئے کون سا شعبہ اختیار کرنا ہے...... زیادہ تر شعبے کے انتخاب میں Guardian کا عمل دخل ہوتا ہے......

جب بچہ جوان ہوتا ہے..... دنیا داری کو سمجھنے لگتا ہے..... کاروبار کرتا ہے..... یا ملازمت اختیار کرتا ہے..... تقریباً بائیس سال کی محدودیت اُس کی رہنمائی کرتی ہے..... وہ اِس محدودیت کو مزید استعمال کر کے زندگی گزارتا ہے اور اس زندگی کو کامیاب زندگی قرار دیا جاتا ہے......

لامحدود حواس کے تحت مذہب یا مذاہب عالم کی تعریف یہ ہے کہ انسانی ذہن لامحدود اور محدود حواس کو سمجھتا ہو... اور آدھی زندگی لامحدود حواس میں اور آدھی محدود حواس میں گزرتی ہو......

مذہب!... دین فطرت ہے...... اور دینِ فطرت اُس لامحدود سفر کو کہتے ہیں جس کی منزلیں بندے کو لامحدود ہستی اللہ سے قریب کر دیتی ہیں... قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"میں تمہارے اندر ہوں، تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں ہو!"..

آدمی کی شان بھی نرالی شان ہے!..... وہ کہتا کچھ ہے... سمجھتا کچھ اور ہے..... ایک طالب علم کو والدین، کالج یا یونیورسٹی کے ہاسٹل میں بھیجتے ہیں.... وہ بچہ چار سال، پانچ سال، ماں باپ سے الگ.. معاشرے کی ذمہ

داریوں سے آزاد ہاسٹل میں رہ کر تعلیم حاصل کرتا ہے۔۔ کہا جاتا ہے کہ بچے نے علم حاصل کیا ہے۔۔ ایسا علم جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکتا ہے۔ پیٹ کا ایندھن اکٹھا کر سکتا ہے۔ بیوی بچوں کو پال سکتا ہے۔

دوسرے باپ نے اپنے بیٹے کو طالب علم کی حیثیت سے خانقاہ کے ہاسٹل میں بھیج دیا تا کہ وہ محدود علوم کے ساتھ ساتھ لامحدود علوم بھی حاصل کرے۔ خاندان کے افراد کہتے ہیں۔ بچے کو راہب بنا دیا ہے۔۔ جبکہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔۔۔۔

اے دانا اور عقل مند لوگو!۔۔۔ بتاؤ کہ اس بات کا کیا مطلب ہوا۔۔؟

ہماری دانست میں مطلب یہ ہوا کہ ہم لامحدود اور لاشعوری علوم سیکھنا ہی نہیں چاہتے۔۔۔

ایک دفعہ ایک اونٹ، ایک بیل اور ایک دُنبہ! ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے دیکھا، راستے میں گھاس کا ایک گٹھر پڑا ہوا ہے۔۔ سفر کی وجہ سے تینوں کو بھوک لگی ہوئی تھی اور تینوں گھاس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔۔۔۔۔

دُنبہ بولا۔۔۔۔۔ بھائیو! یہ گھاس تو بہت تھوڑا سا ہے۔۔۔ اتنا زیادہ نہیں ہے کہ اس کے تین حصے کر کے ہم تینوں تقسیم کر لیں۔۔ اس طرح کسی کا بھی پیٹ نہیں بھرے گا۔۔ لہٰذا میں سوچتا ہوں کہ اس گھاس کا حقدار میں ہوں۔۔ اس لئے کہ میں تم سب سے بزرگ ہوں!۔۔

بیل نے پوچھا۔۔ آپ کس طرح بزرگ ہیں؟۔

دُنبہ نے کہا۔ مجھے اپنی تعریف اچھی نہیں لگتی اور اپنے منہ تعریف کرنا ہے بھی بری بات، مگر میں حقیقت چھپا بھی نہیں سکتا۔۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے قربانی کے دُنبہ کے ساتھ گھاس چرتا تھا اور اُس کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔۔۔۔۔

بیل نے جب یہ سنا تو وہ ناگواری سے بولا۔۔۔ اے دنبے میاں!۔۔ بس رہنے دو تمہیں پتہ نہیں، میں اُس جوڑی کا بیل ہوں جس بیل سے حضرت آدمؑ نے زمین پر زراعت کے لئے پہلا ہل چلایا تھا۔

کہتے ہیں اونٹ بڑا ہشیار جانور ہے۔۔۔۔ اور اس کی آنکھیں اتنی روشن ہیں کہ اس سے ذہانت ٹپکتی ہے۔۔ (آپ کو کبھی اونٹ نظر آئے تو اُس کی چمکدار، سرگیں اور ذہین آنکھوں میں ضرور دیکھنا)۔۔۔۔

اونٹ نے دونوں کو شیخیاں بگھارتے سنا۔۔۔ تو اُس نے کچھ کہے بغیر گھاس کا پورا گٹھا منہ سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔۔۔ اور گردن سیدھی کر کے اتنے اونچا کر دیا کہ دُنبہ اور بیل دونوں منہ تکتے رہ گئے۔۔۔ اونٹ نے جب اُن دونوں

کو بہت مایوس دیکھا تو اونٹ بولا.....

دوستو!.....اور میرے ہمسفر ساتھیو!

مجھے "قیل و قال" تو آتی نہیں.....اور نہ ہی میں اونٹوں کی تاریخ سے واقف ہوں!.....میں یہ بھی نہیں جانتا کہ اونٹ بھی بزرگ ہوتے ہیں!......

بھائیو! تم اپنی فضیلت تاریخ میں ڈھونڈتے رہو..... اصل بزرگی تو یہ ہے کہ وقت کا کیا تقاضہ ہے!..... تم اپنی اپنی بزرگی ثابت کرو..... اور میں چلتا ہوں.....خدا حافظ!.....

مولانا رومؒ کی یہ حکایت مسلمان قوم کو آئینہ دکھاتی ہے..... ہر مسلمان یہی کہتا ہے "پدرم سلطان بود".....میرے ابا بادشاہ تھے..... ہمارے تاریخی کارنامے یہ ہیں، وہ ہیں..... ہمارے سروں پر تاج تھا..... کوئی یہ نہیں سوچتا کہ آج کے حال میں اُن کی کیا حالت ہے!.....اور ذلت و رسوائی میں اُن کا کیا مقام ہے!

اپنا اصل مقام تلاش کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو مبعوث فرما کر ہماری راہنمائی فرمائی۔

پیغمبروں کی ساری زندگی اس عمل سے عبارت ہے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔تمام انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ رحمتہ اللہ علیہم کے اندر استغناء کی طرز فکر راسخ ہوتی ہے۔انبیاء اس طرز فکر کو حاصل کرنے کا اہتمام اس طرح کیا کرتے تھے کہ وہ کسی چیز کے متعلق سوچتے تھے تو اس چیز کے اور اپنے درمیان کوئی رشتہ براہ راست قائم نہیں کرتے تھے۔ان کی طرز فکر ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ کائنات کی تمام چیزوں کا اور ہمارا مالک اللہ ہے، کسی چیز کا رشتہ براہ راست ہم سے نہیں ہے بلکہ ہم سے ہر چیز کا رشتہ اللہ کی معرفت ہے۔رفتہ رفتہ ان کی یہ طرز فکر مستحکم ہو جاتی اور ان کا ذہن ایسے رجحانات پیدا کر لیتا کہ جب وہ کسی چیز کی طرف مخاطب ہوتے تو اس چیز کی طرف خیال جانے سے پہلے اللہ کی طرف خیال جاتا۔انہیں کسی چیز کی طرف توجہ دینے سے پیشتر یہ احساس عادتاً ہوتا کہ یہ چیز ہم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتی۔اس چیز کا اور ہمارا واسطہ محض اللہ کی وجہ سے ہے۔

اس طرز عمل میں ذہن کی ہر حرکت کے ساتھ اللہ کا احساس قائم ہو جاتا ہے۔اللہ ہی بحیثیت محسوس کے ان کا مخاطب ہو جاتا ہے۔رفتہ رفتہ اللہ کی صفات ان کے ذہن میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیتی ہیں اور ان کا ذہن اللہ کی صفات کا قائم مقام بن جاتا ہے۔

غور و فکر کیا جائے تو سوچنے اور سمجھنے کے کئی رخ متعین ہوتے ہیں۔تفصیل میں جانے کے بجائے ہم دو رخ کا تذکرہ کرتے ہیں۔وہ لوگ جو علمی اعتبار سے مستحکم ذہن ہیں یعنی ایسا ذہن رکھتے ہیں جس میں شک و شبہ کی گنجائش

نہیں ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا یقین ہے کہ ہر چیز' اس کی دنیا میں کوئی بھی حیثیت ہو' چھوٹی ہو یا بڑی' راحت ہو یا تکلیف سب اللہ کی طرف سے ہے۔ ان لوگوں کے مشاہدے میں یہ بات آ جاتی ہے کہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے' جو ہو رہا ہے' جو ہو چکا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے اس کا براہِ راست تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ یعنی جس طرح اللہ کے ذہن میں کسی چیز کا وجود ہے اسی طرح اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

راسخ فی العلم لوگوں کے ذہن میں یقین کا ایسا پیٹرن بن جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ہر عمل اور زندگی کی ہر حرکت' ہر ضرورت اللہ کے ساتھ وابستہ کر دیتے ہیں۔ یہی پیغمبروں کی طرز فکر ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ ہمارے لئے اللہ نے جو نعمتیں مخصوص کر دی ہیں' وہ ہمیں ہر حال میں میسر آئیں گی اور یہ یقین ان کے اندر استغناء کی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ قلندر بابا اولیاءؒ کا ارشاد ہے کہ استغناء بغیر یقین کے پیدا نہیں ہوتا اور یقین کی تکمیل بغیر مشاہدے کے نہیں ہوتی اور جس آدمی کے اندر استغناء نہیں ہوتا اس آدمی کا تعلق اللہ سے کم اور مادی دنیا (اسفل) سے زیادہ رہتا ہے۔

آج کی دنیا میں عجیب صورت حال ہے کہ ہر آدمی دولت کے انبار اپنے گرد جمع کرنا چاہتا ہے اور یہ شکایت کرتا ہے کہ سکون نہیں ہے سکون کوئی عارضی چیز نہیں ہے سکون ایک کیفیت کا نام ہے جو یقینی ہے اور جس کے اوپر کبھی موت وارد نہیں ہوتی۔ ایسی چیزوں سے جو عارضی ہیں' فانی ہیں اور جن کے اوپر ہماری ظاہری آنکھوں کے سامنے بھی موت وارد ہوتی رہتی ہے' ان سے کسی طرح سکون نہیں مل سکتا ہے۔ استغناء ایک ایسی طرزِ فکر ہے جس میں آدمی فانی اور مادی چیزوں سے ذہن ہٹا کر حقیقی اور لافانی چیزوں میں تفکر کرتا ہے۔ یہ تفکر جب قدم قدم چلا کر کسی بندے کو غیب میں داخل کر دیتا ہے تو سب سے پہلے اس کے اندر یقین پیدا ہوتا ہے۔ جیسے ہی یقین کی کرن دماغ میں پھوٹتی ہے وہ نظر کام کرنے لگتی ہے جو نظر غیب کا مشاہدہ کرتی ہے۔ غیب میں مشاہدے کے بعد کسی بندے پر جب یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات کی باگ ڈور ایک واحد ہستی کے ہاتھ میں ہے تو اس کا تمام تر ذہنی رجحان اس ذات پر یعنی اللہ پر مرکوز ہو جاتا ہے اس مرکزیت کے بعد استغناء کا درخت آدمی کے اندر شاخ در شاخ پھیلتا رہتا ہے۔

استغناء سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی روپے پیسے کی طرف سے بے نیاز ہو جائے۔ روپے پیسے اور خواہشات سے کوئی بندہ بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ضروریاتِ زندگی اور متعلقین کی کفالت ایک لازمی امر ہے اور اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ استغناء سے مراد یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کرے' اس عمل میں اس کے ساتھ اللہ کی خوشنودی

ہو اور اس طرزِ فکر یا عمل سے اللہ کی مخلوق کو کسی طرح نقصان نہ پہنچے۔ ہر بندہ خود بھی خوش رہے اور نوعِ انسانی کے لیے بھی مصیبت اور آزار کا سبب نہ بنے۔ ضروری ہے کہ بندے کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو کہ کائنات میں موجود ہر شے کا مالک در و بست اللہ ہے۔ اللہ ہی ہے جس نے زمین بنائی' اللہ ہی ہے جس نے بیج بنایا' اللہ ہی ہے جس نے زمین کو اور بیج کو یہ وصف بخشا کہ بیج درخت میں تبدیل ہو جائے اور زمین اس کو اپنی آغوش میں پروان چڑھائے۔ پانی درختوں کی رگوں میں خون کی طرح دوڑے۔ ہوا روشنی بن کر درخت کے اندر کام کرنے والے رنگوں کا توازن قائم رکھے۔ دھوپ درخت کے ناپختہ پھلوں کو پکانے کے لیے مسلسل ربط اور قاعدے کے ساتھ درخت سے ہم رشتہ رہے۔ چاندنی پھلوں میں مٹھاس پیدا کرے۔ زمین کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ ایسے درخت اگائے جو انسان کی ضروریات کو پورا کریں۔ درختوں کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ ایسے پتے اور پھل پیدا کریں کہ جن سے مخلوق کی ضروریات موسم کے لحاظ سے پوری ہوتی رہیں۔

آپ تمام اساتذۂ کرام اور معزز حاضرین غور کر کے مجھے بتائیں کہ وہ کون ہے جو آسمان سے اور زمین سے تمہیں روزی پہنچا رہا ہے۔ وہ کون ہے..... تمہارا سننا اور دیکھنا جس کے قبضے میں ہے۔ وہ کون ہے جو نکالتا ہے زندگی کو موت سے اور نکالتا ہے موت سے زندگی کو۔ پھر وہ کون سی ہستی ہے جو بیشمار زمینوں' آسمانوں' کہکشانی نظاموں اور کائناتی سسٹم کو نگرانی کے ساتھ چلا رہی ہے۔ یقیناً وہ اعتراف کریں گے کہ یہ ہستی اللہ ہے۔ اے پیغمبر ﷺ تم ان سے کہو کہ جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں پھر کیوں غفلت اور سرکشی سے نہیں بچتے؟ ہاں بے شک یہ اللہ ہی ہے جو تمہارا پروردگار ہے اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم کہاں جا رہے ہو؟

وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا اور جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سیرابی سے خوشنما باغ لگا دیئے۔ حالانکہ یہ بات تمہارے بس کی نہیں تھی کہ باغوں میں درخت لہلہاتے۔ کیا اللہ کے علاوہ دوسرا معبود بھی ہے؟ مگر یہ لوگ ہیں جن کا شیوہ حجت اور کج روی ہے۔

اچھا بتائیں وہ کون ہے جس نے زمین کو زندگی کا مستقر بنا دیا۔ اس میں نہریں جاری کر دیں اور پہاڑ بلند کر دیئے۔ دو دریاؤں میں دیوار حائل کر دی۔ کیا اللہ کے ساتھ دوسرا بھی کوئی معبود ہے؟ مگر ان لوگوں میں اکثر ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو بے قرار دلوں کی پکار سنتا ہے جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اسے پکارتے ہیں

اوران کا دکھ ٹال دیتا ہے۔ اور اللہ نے تمہیں زمین کا جانشین بنایا۔ کیا اللہ کے سوا دوسرا بھی کوئی معبود ہے؟ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم نصیحت پکڑو۔

اچھا بتلاؤ وہ کون ہے جو صحراؤں اور سمندر کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے...... وہ کون ہے جو بارانِ رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ دوسرا بھی کوئی معبود ہے...... اللہ کی ذات اس شرک سے پاک ہے اور منزہ ہے کہ جو یہ لوگ اس کی معبودیت میں شریک ٹھہراتے ہیں۔

اچھا بتاؤ وہ کون ہے جو مخلوقات کی پیدائش شروع کرتا ہے پھر اسے دہراتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو زمین اور آسمان سے تمہیں رزق دے رہا ہے...... کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ اے پیغمبر کہہ دیجئے اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔

انسان اپنی غذا پر نظر ڈالے۔ اللہ تعالیٰ پہلے زمین پر پانی برساتے ہیں پھر زمین کی سطح شق کر دیتے ہیں۔ پھر اس کی روئیدگی سے طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیتے ہیں۔ اناج کے دانے انگور کی بیلیں کھجور کے خوشے سبزی ترکاری زیتون درخت کے جھنڈ قسم قسم کے میوے طرح طرح کا چارہ تمہارے فائدے کے لئے اور تمہاری جانوں کے لئے ہے۔

دیکھو چوپایوں میں تمہارے لئے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی عبرت ہے...... ان کے جسم میں خون و کثافت سے دودھ پیدا کرتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بہترین مشروب ہے ...... کھجور انگور جس سے نشہ اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس بات میں باشعور لوگوں کے لئے بڑی نشانی ہے...... اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی ہے کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان کی ٹہنیوں میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں کہ اپنے لئے گھر بنائیں' پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے...... پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں سے کامل فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہو...... اس کے جسم سے مختلف رنگوں، کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفاء ہے۔ بلاشبہ اس میں تم لوگوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔

کیا تم نے اس بات پر غور کیا کہ جو کچھ تم کاشت کاری کرتے ہو اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اسے چورا چورا کر دیں اور تم صرف یہ کہنے کے لئے رہ جاؤ کہ ہمیں تو اس نقصان کا تاوان ہی نہ دینا پڑے گا بلکہ ہم تو اپنی محنت کے سارے فائدوں سے محروم ہو گئے۔ یہ بات بھی تمہارے سامنے ہے کہ جو پانی تم پیتے ہو اسے کون برساتا ہے۔ تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اسے کڑوا کر دیں۔ کیا اس نعمت کے لئے

ضروری نہیں کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ بات بھی تمہارے سامنے ہے کہ جو آگ تم سلگاتے ہو اس کے لئے لکڑی تم نے پیدا کی ہے یا ہم کرتے ہیں؟ اسے یادگار اور مسافروں کے لئے فائدہ بخش بنایا۔

ان تمام مثالوں سے جو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے کہ پوری کائنات کا مالک [illegible] اللہ ہے۔ اور اللہ ہی وہ ہستی ہے جو تمام کائنات اور اس میں شامل تمام انواع اور اشیاء [illegible] زندہ رہنے کے لئے، پرورش کرنے کے لئے وسائل بھی فراہم کر رہی ہے۔

[illegible] روحانیت کا راستہ ہے۔ روحانیت کے راستے پر چلنے والے مسافر کو اس بات کی مشق کرائی جاتی ہے [illegible] و زندگی کی تمام حرکات و سکنات جب شاگرد دربست پیر و مرشد کے سپرد کر دیتا ہے تو [illegible] کا کفیل بن جاتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایک دودھ پیتے بچے کے کفیل اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ جب تک بچہ شعور کے دائرے میں داخل نہیں ہوتا، ماں باپ چوبیس گھنٹے اس کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ گھر کا دروازہ نہ کھلے کہ بچہ باہر نکل جائے گا۔ سردی ہے تو بچے نے کپڑے کیوں اتار دیئے۔ سردی لگ جائے گی۔ کھانا وقت پر نہ کھایا تو ماں باپ پریشان ہیں کہ بچے نے وقت پر کھانا کیوں نہیں کھایا۔ بچہ ضرورت سے زیادہ سو گیا تو [illegible] کی فکر کہ کیوں زیادہ سو گیا۔ نیند کم آئی تو یہ پریشانی کہ بچہ کم کیوں سویا۔ ہر شخص جو پیدا ہوا ہے اور جس کی اولاد ہے اور جس نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ بچے کی تمام بنیادی ضروریات کے کفیل اس کے ماں باپ ہوتے ہیں اور یہ کفالت اس طرح پوری کی جاتی ہے کہ جس کا تعلق بچے کے اپنے ذہن سے قطعاً نہیں ہوتا۔ چوں کہ شاگرد یا مرید پیر و مرشد (مراد یا شیخ) کی روحانی اولاد ہوتا ہے، اس لئے مرشد روحانی باپ کی حیثیت سے مرید کی دینی، دنیاوی، روحانی ہر طرح کی کفالت کرتا ہے اور جیسے جیسے کفالت بڑھتی ہے۔ پیر و مرشد کا ذہن مرید کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ جب شیخ مرید کی کفالت کرتا ہے تو مرید کا لاشعور یہ بات جان لیتا ہے کہ [illegible] جو میری کفالت کر رہا ہے اس کا کفیل اللہ ہے اور رفتہ رفتہ اس کا ذہن آزاد ہو جاتا ہے اور اس کی تمام [illegible] ضروریات اور احتیاج اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہو جاتی ہیں۔

[illegible] معروضات کے پیش نظر اگر آپ لوگ جس میں ہم سب شامل ہیں اپنی آئندہ نسل کو پرسکون [illegible] کے لئے ہمیں خود اپنی تربیت کرنی ہوگی۔ بات ذرا تلخ ہے مگر حقیقت ہے کہ ہم جو [illegible] ہیں۔

[illegible] نہیں ہیں تو ہم بچوں میں اسلام کی قدریں کس طرح اجاگر کر سکیں گے۔

اگر ہم خود نماز نہیں پڑھتے تو بچے نماز کیسے پڑھیں گے۔ اگر ہم خود دانت صاف نہیں کرتے تو بچے بھی دانت صاف نہیں کریں گے۔

بچے دراصل بڑوں کو دیکھ کر کہ جس طرح بڑے کر رہے ہیں خود بخود ویسا ہی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچے بڑوں کا عکس ہوتے ہیں۔

لہٰذا میری آپ سب حاضرین سے استدعا ہے کہ بچوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ اگر پہلے اپنی بھی تربیت کر لی جائے تو ہماری آئندہ نسل پرسکون اور کامیاب بن جائے گی۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے اور ہمیں یقین عطا کرے کہ ہم اللہ کو اپنا کفیل مان لیں اور جان لیں۔

السلام علیکم!

☆......☆......☆

تقریب رونمائی کتاب ہمارے بچے میں جناب اشفاق احمد خان خطاب فرما رہے ہیں

کتاب ہمارے بچے کی رونمائی پر مرشد کریم، اشفاق احمد اور میاں مشتاق احمد عظیمی بیٹھے ہیں
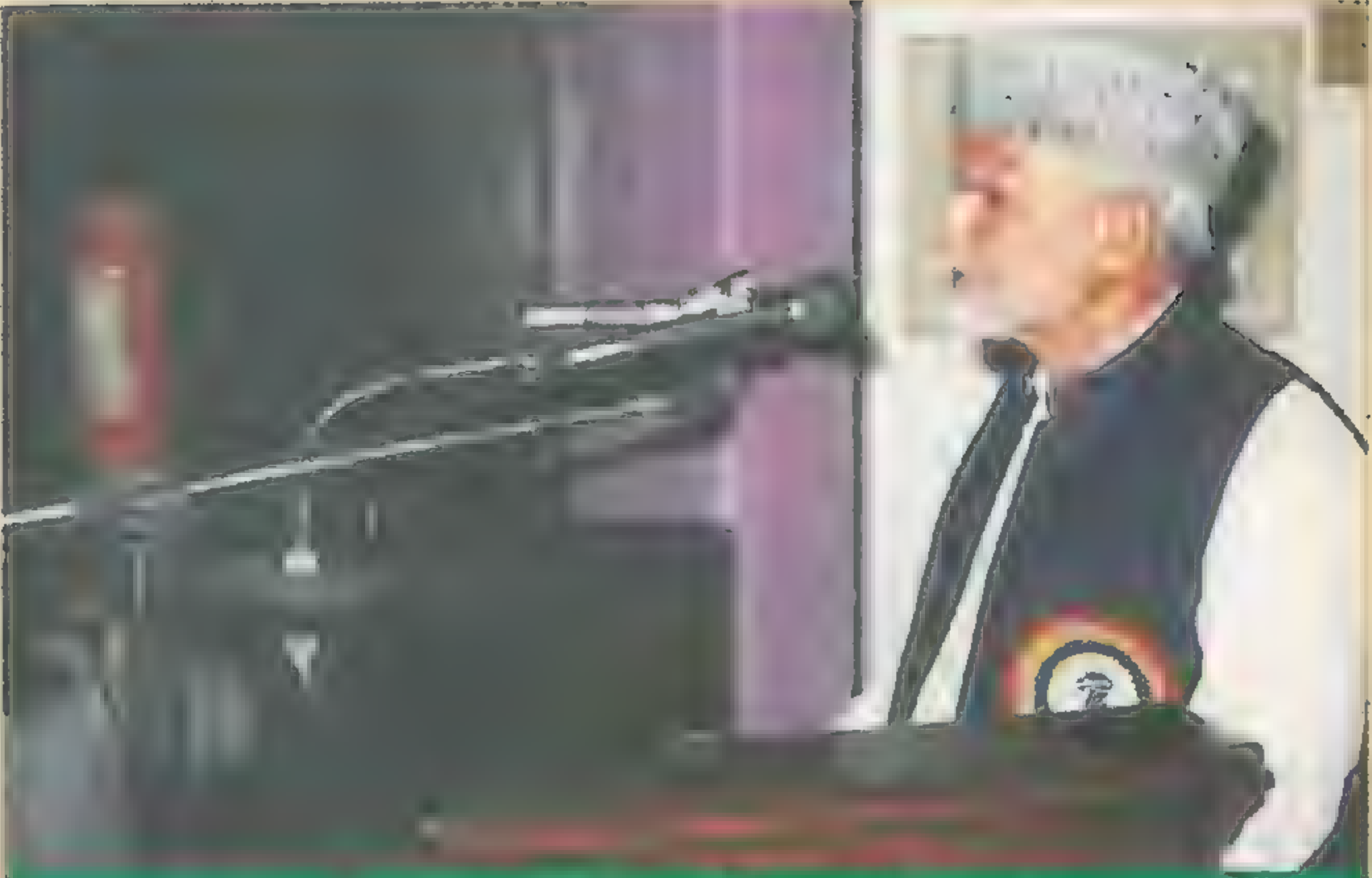
ہمارے بچے کی رونمائی کے موقع پر مرشد کریم خطاب فرما رہے ہیں

ایوان اقبال میں خطاب سے پہلے مرشد کریم پروفیسر نور الدین جامی ناظر
پنجاب یونیورسٹی ابلاغ عامہ کے چیئر مین جناب وارث میر صاحب محو گفتگو

لاہور ہائیکورٹ بار سے خطاب

۲۰ مارچ ۲۰۰۲ء کو لاہور ہائیکورٹ بار کے صدر کی دعوت پر الشیخ خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ہائیکورٹ تشریف لائے جہاں بار کے صدر ایڈووکیٹ مزمل خاں، نائب صدر خاور اکرام بھٹی، فنانس سیکرٹری چوہدری تنویر احمد اور دوسرے وکلاء صاحبان نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا۔ لاہور ہائیکورٹ میں منعقدہ تقریب کی صدارت جسٹس نذیر اختر صاحب نے کی۔ ایڈووکیٹ محمد اسلم خالد نے تلاوت اور رانا شوکت علی خان نے نعتِ رسولِ مقبولؐ پیش کی۔ ایڈووکیٹ سید عابد حسین جعفری نے خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کا مکمل تعارف کرایا اور آپ کی روحانیت کے سلسلے میں کی گئی خدمات اور لکھی گئی کتب کے بارے میں حاضرین کو آگاہ کیا۔ نظامت کے فرائض بار کے سیکرٹری جنرل ایڈووکیٹ شاہد محمود بھٹی نے ادا کئے۔ بعد از اختتام خصوصی دعا ہوئی اور ریفریشمنٹ پیش کی گئی۔ اس تقریب میں عظیمی صاحب کے ہمراہ لاہور مراقبہ ہال کے نگران میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب اور عابد حسین جعفری نے بھی شرکت کی۔

مرشدِ کریم نے بعد از تلاوتِ کلامِ پاک خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت سے ہمیں یہ سعادت اور شرف نصیب ہوا ہے جس کی بناء پر ہم توحید پرست کہلاتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ذات گرامی ایسی مبارک اور مسعود ہستی ہیں جن کی وجہ سے نوع انسانی کو اس بات کا ادراک ہوا کہ انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے اور انسان کس بنیاد پر اشرف المخلوقات ہے۔ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد اور اس دنیا سے تشریف لے جانا اُس مسلسل عمل کی آخری کڑی ہے جو حضرت آدمؑ سے شروع ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو ایک مجلس منعقد فرمائی اس مجلس میں فرشتے اور جنات موجود تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اللہ کے اس ارشاد پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ زمین، فرشتے اور جنات پہلے سے موجود تھے اور نیابت و خلافت کے منصب پر کوئی فائز نہ تھا۔ نائب سے مراد یہ ہے کہ میں ایسی ہستی تخلیق کر رہا

ہوں جو میری قائم مقام بن کر اپنے اختیارات استعمال کرے گی۔ جیسے نائب وزیر اعظم یا نائب گورنر ہوتا ہے۔

فرشتوں نے یہ بات سُن کر کہا کہ آپ نے جس ہستی کو اپنا نائب یا خلیفہ بنانے کا ارادہ کیا ہے اور جن عناصر سے اس کی تخلیق ہوئی ہے اُن عناصر میں فساد اور خون خرابہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی اس بات کو رد نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں وہ تو کوئی بھی نہیں جانتا اور اللہ تعالیٰ جس بندہ کو جتنا علم عطا کر دیں وہ اتنا ہی جانتا ہے۔ اس پر فرشتے خاموش ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو نیابت و خلافت کے لئے اپنی ذات میں موجود صفات کا علم عطا کیا اور آدمؑ کو خلیفۃ الارض کی حیثیت سے وہ علوم سکھا دیئے جن کو جان کر حضرت آدمؑ اللہ تعالیٰ کے نائب کے فرائض انجام دے سکیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور جنات کو سمجھانے اور اُن سے آدم کی حاکیت کا اقرار کرانے کے لئے آدم سے کہا کہ ہم نے اپنی نیابت اور خلافت کے اختیارات استعمال کرنے کے لئے قاعدوں اور ضابطوں پر مشتمل جو علم تمہیں سکھایا ہے، وہ بیان کر دو۔ آدمؑ نے اُن اسماء کی تفصیل بیان کر دی جو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں سکھائے تھے۔ فرشتوں نے یہ سُن کر کہا کہ جو کچھ آدم نے بیان کیا ہے اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور آپ حکیم و علیم اور دانا و بینا ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب چونکہ آدمؑ کو نیابت و خلافت سونپ دی گئی ہے اس لئے تم آدمؑ کی حاکمیت کا اقرار کرو۔ فرشتوں نے آدمؑ کو سجدہ کیا۔ سجدے سے مراد یہ نہیں کہ نعوذ باللہ فرشتوں یا جنات نے آدمؑ کو اللہ کا درجہ دے دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے آدمؑ کی حاکیت قبول کرنے کے لئے اپنے سر جھکا دیئے اور یہ اقرار کر لیا کہ آدمؑ اُن علوم کی بنیاد پر ہمارے حاکم ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے نیابت و خلافت کے لئے آدمؑ کو سکھائے ہیں۔

اس موقع پر جنات میں دو گروہ بن گئے ایک گروہ نے آدم کی حاکیت کو قبول کر لیا اور دوسرے گروہ نے آدم کی حاکیت قبول نہیں کی۔ جس گروہ نے آدم کی حاکیت کو قبول کر لیا وہ اللہ کا پسندیدہ گروہ کہلایا اور جس گروہ نے آدم

کی حاکمیت قبول نہیں کی اللہ تعالیٰ نے اسے معتوب قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اختیارات تفویض کر کے جنت میں بھیج دیا اور جنت میں اُن علوم کی پریکٹس کرائی جو اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو سکھائے تھے۔

جنت کا ماحول یہ ہے کہ جب آپ 'سیب' کہیں تو سیب موجود ہو جاتا ہے۔ دنیا کی طرح سیب حاصل کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ آپ زمین کھودیں اُس میں سیب کا پودا لگائیں پھر اُس پودے کو پانی دیں اور کھاد ڈالیں، اُسے کیڑے مکوڑوں سے بچائیں۔ بارش اور دھوپ سے اس کی حفاظت کریں اور پھر سات آٹھ سال تک پھل کا انتظار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے جب کن کہا تو کائنات بن گئی۔ جنت میں آدم نے سیب کہا تو سیب موجود ہو گیا۔ یہ امر سمجھنے کے لئے تخلیقی قوانین کا علم جاننا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب چاہا کہ فرشتے، جنات، آسمان، زمین، چاند، سورج تخلیق ہوں تو سب ایک لفظ کن سے وجود میں آ گئے۔ اس تخلیقی عمل میں یہ بات غور طلب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کن کہا تو پہلے سے کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ کن کے بعد ان کی تخلیق ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے کن کہنے اور آدم کے اختیار میں یہ فرق ہے کہ جب آدمؑ نے 'سیب' کہا تو وہ سیب سامنے آیا جو پہلے سے موجود تھا۔ آدم نے جب 'پانی' کہا تو وہ پانی موجود ہوا جو پہلے سے تخلیق ہو چکا ہے۔ آدمؑ نے حور کہا تو حور موجود ہو گئی اس کا مطلب یہ ہے کہ حور پہلے سے موجود تھی۔

جب آدمؑ نے حور کہا تو وہ سامنے آ گئی۔ ایسا نہیں ہے کہ حور پہلے سے موجود نہ تھی اور آدمؑ کے کہنے سے تخلیق ہوئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں!

میں احسن الخالقین ہوں یعنی میں تخلیق کرنے والوں میں بہترین ہوں۔

بہترین خالقیت کا وصف یہ ہے کہ ایک چیز عدم سے وجود میں آ جاتی ہے۔ اور آدمؑ کی تخلیق کا وصف یہ ہے کہ پہلے سے موجود وجود کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

جتنا عرصہ آدمؑ جنت میں رہے آدمؑ کو کن کہنے کی پریکٹس ہوتی رہی اور آدمؑ کے اندر اللہ تعالیٰ کے علم الاسماء کا یقین راسخ ہو گیا۔ آدمؑ کے مشاہدہ میں یہ بات آ گئی کہ میں جو ارادہ کرتا ہوں اُس پر فوراً عمل درآمد ہو جاتا ہے۔

یاد رکھیے!

کہ یہ عمل درآمد اللہ کی تخلیق کردہ اشیاء میں ہوگا کوئی نئی اور غیر موجود شے تخلیق نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے کہا:

☆ تم اور تمہاری بیوی جنت میں خوش ہو کر رہو۔

☆ جہاں سے جو چیز چاہو، خوشی خوشی کھاؤ پیو۔

جنت میں رہنے کے لئے دو شرائط عائد ہوئیں۔ تخلیق کے تناظر میں یہ بات اہم ہے کہ خالق پر کوئی شرط عائد نہیں ہوتی۔ شرائط مخلوق کے لئے عائد ہوتی ہیں۔

دو شرائط یہ ہیں کہ:

(۱) جنت میں خوش ہو کر رہنا اور خوش ہو کر کھانا پینا ہے۔ یعنی خوشی کے ساتھ جنت کی ساری زمین پر تصرف کا حق دیا گیا۔

انسان جب خوش ہوتا ہے تو وقت کے گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ شادی بیاہ کے مواقع پر کئی کئی دن شادی کے معمولات میں گزر جاتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ اتنے دن گزر گئے لیکن وقت کا پتہ نہیں چلا۔ خدانخواستہ کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے تو دس منٹ بھی دس گھنٹوں کے برابر ہو جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب انسان خوش ہوتا ہے تو وہ اسپیس کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور جب غمگین اور پریشان ہوتا ہے تو وقت کی گرفت اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ ایک دن ایک سال کے برابر لگتا ہے۔ جنت کا ماحول چونکہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہاں خوش ہو کر رہا جائے اس لئے وہاں وقت کا دباؤ محسوس نہیں ہوتا۔ آپ قرآن پاک پڑھ کر جس قدر غور و فکر کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جتنا خوش رہا جائے شعور اسی قدر آزاد ہوگا۔

(۲) آدم پر دوسری شرط یہ عائد کی گئی کہ شجر ممنوعہ کے نزدیک نہیں جانا۔ اگر تم اس درخت کے قریب گئے تو تمہارا شمار ظالمین میں ہوگا۔ اس درخت کے قریب جانا...... حکم عدولی یا ٹائم اور اسپیس کی گرفت ہے۔ ظالمین کا مطلب ہے...... تم ناخوش ہو جاؤ گے۔

بہر حال شیطان کے بہکاوے میں آ کر آدمؑ سے جنت میں سہو ہو گیا اور اس بھول پر آدمؑ کے ذہن میں یہ

بات آگئی کہ مجھ سے حکم عدولی ہو گئی ہے۔ جب جنت کی فضاء ''خوشی'' سے نکل کر آدمؑ کے ذہن میں ظالمین کا تاثر قائم ہو گیا تو آدمؑ اسپیس کی گرفت میں آگئے یعنی آدمؑ کو جنت سے زمین پر اتار دیا گیا۔ آدمؑ نے زمین پر عاجزی و انکساری کی...... روتے رہے۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہیں، اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو معاف فرما دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس شرط کی یاد دہانی کرا دی کہ اگر تم خوش رہو گے تو جنت میں دوبارہ داخل ہو جاؤ گے اور اگر خوش نہ ہوئے تو جنت تمہیں قبول نہیں کرے گی۔

خوشی کیا ہے؟

اللہ کے پسندیدہ راستے پر چلنا...... خوشی ہے۔

اور

اللہ کے پسندیدہ راستے پر نہ چلنا پریشانی اور ناخوشی ہے۔

خوش رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی حکم عدولی نہ ہو یعنی تم شجرِ ممنوعہ کے پاس نہ جاؤ۔ مثلاً جو ایک شجرِ ممنوعہ ہے، اس میں شاخ در شاخ برائی پھلتی پھولتی ہے اور آدمی تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جھوٹ کی بے شمار شاخیں ہیں، آدمی کو ایک جھوٹ کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اور جھوٹ کے درخت کی سو شاخیں انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں' وغیرہ وغیرہ۔

اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جتنی بھی ممنوعہ باتیں بتائیں ہیں وہ سب شجرِ ممنوعہ ہیں۔ جھوٹ بولنا، حقوق العباد کا خیال نہ رکھنا یا قتل کرنا برائی کا درخت ہے۔ جو شاخ در شاخ بڑھتا رہتا ہے۔ اسی صورت خوشی کا درخت ہے۔ اُس میں سے بھی شاخیں نکلتی ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک کنواں بنوا دیا اور اس سے ہزاروں آدمی سیراب ہوتے ہیں۔ تو وہ کنواں ایک درخت ہے۔ اور پانی پینے والے ہزاروں آدمی اس کی شاخیں اور پھول ہیں۔ اس طرح نیکی اور برائی ایک درخت کی طرح پھیلتی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا نیکی ایک درخت ہے۔ جس سے تمہیں بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اور تمہاری اولاد کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ:

☆ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ بندے آپس میں پیار و محبت سے رہیں۔ ایک دوسرے کی دل آزاری کا سبب نہ بنیں اور

ایک دوسرے کی حق تلفی نہ ہو۔

☆ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جن آداب کا تعین کر دیا ہے اُن کی پیروی کر کے اللہ کو راضی رکھیں اس طرح آپ راضی اور خوش وخرم رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر صدق دل سے عمل کریں۔

یہ ہماری سعادت مندی ہے کہ ہم حضور پاک ﷺ کے امتی ہیں اس کے ثمرات تب حاصل ہوں گے جب رسول اللہ ﷺ کے اوصاف ہمارے اندر پیدا ہوں گے۔ اگر ہم باعمل ہوں گے تو سچی وحقیقی خوشی اور اطمینان قلب نصیب ہوگا اگر خوش نہیں رہیں گے تو سکون نہیں ملے گا اور یقین کے درجے میں داخل نہ ہوسکیں گے۔

یہ قانون ہے۔

☆ ناخوش آدمی جنت میں نہیں جاسکتا۔

ہر اُمتی پر فرض ہے کہ وہ اپنا محاسبہ کرے کہ

کیا میں اپنے عمل میں سچا ہوں......؟

کیا میں حضور ﷺ کا امتی کہلاسکتا ہوں......؟

جب آپ اس سوال پر غور وفکر کریں گے تو یہی جواب ملے گا کہ یقیناً میں اس کا اہل نہیں ہوں کہ میں آپ ﷺ کا امتی کہلاسکوں تب یہ خیال آئے گا کہ میں کس طرح آپ ﷺ کا امتی بنوں؟

آج اپنی حالت اور اعمال سے ہم فرشتوں کی اُس بات کی تصدیق تو کر رہے ہیں کہ یہ فساد کرے گا لیکن اللہ کی اُس بات کا مان کہاں ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں نے آدمؑ کو علم الاسماء سکھائے ہیں؟ آج وہ علم کہاں ہے؟

علم الاسماء میں تو فساد نہیں بلکہ رحمت ہی رحمت اور اللہ ہی اللہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

یہ ایک آیت ہے:

''جو بندے میرے لئے جدوجہد کرتے ہیں میں نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے کہ اُن پر اپنے راستے کھول دوں!''

علم الاسماء ہی وہ علم ہے جو آدمؑ کی فضیلت اور برتری کا سبب ٹھہرا۔ یہی وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ نے

حضرت آدمؑ کو براہِ راست عطا کیا۔ اسی علم کی بدولت مسجودِ ملائکہ ٹھہرا۔ علم کی اگر ہم درجہ بندی کریں تو اس کی دو طرزیں متعین ہوتی ہیں۔ ان میں ایک علمِ روحانی ہے اور دوسرا مادی علم اور یہی علوم شاخ در شاخ پھیلتے رہتے ہیں۔ مثلاً فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، طب، جراحت اور آپ کا یہ وکالت کا علم یہ سب مادی علوم ہیں۔ ان علوم کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان علوم کے ساتھ ساتھ علم الاسماء کے علوم سیکھنا بھی ضروری ہیں۔

یاد رکھیں! تمام علوم کی بنیاد خیال پر ہے یعنی جب تک کسی چیز کے بارے میں خیال نہیں آئے گا اس کا مظہر نہیں ہوگا یعنی ہم اس کو معنی اور مفہوم کے خدوخال نہ پہنا سکیں گے۔ اسی قانون کے تحت کائنات بھی دراصل اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔

آپ لوگ بتائیں ہماری زندگی میں کوئی ایسا عمل ہے جو خیال آئے بغیر ممکن ہو...... ہے کوئی عمل...... جتنا بھی آپ سوچیں گے آپ کو ایک ہی بات نظر آئے گی کہ زندگی کا ہر عمل خیال کے بغیر ممکن نہیں اور زندگی تب تک ہے جب تک آپ کے اندر روح کام کر رہی ہے۔ یعنی روح ہے تو خیال آئے گا اور جب خیال آئے گا تو آپ اس خیال کے نتیجے میں عمل کریں گے۔ روحانی علوم یا علم الاسماء کے حصول کے دوران پہلی کلاس میں یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ گوشت پوست سے مرکب اور رگ پٹھوں سے بنا ہوا جسم اصل انسان نہیں ہے بلکہ گوشت پوست کا جسم اصل انسان کا لباس ہے۔

دوسرے علوم کی طرح اگر کوئی بندہ روحانی علوم سیکھنا چاہتا ہے تو اس کے اندر یہ یقین ہونا ضروری ہے کہ ''گوشت پوست کا جسم مفروضہ ہے اس کی اصل روح ہے''۔ روح کی موجودگی میں ہی زندگی گزارنے کے تمام تقاضے انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔ جس طرح انسان کے اندر روح ہے اس طرح دوسری مخلوق کے اندر بھی روح کام کر رہی ہے۔ جس طرح انسان کے اندر تقاضے پیدا ہو رہے ہیں بالکل اسی طرح دوسری مخلوق میں بھی نسل کشی، بھوک، پیاس، خوشی، غمی، غصہ اور دوسرے تقاضے موجود ہیں۔ لیکن انسان اور دوسری مخلوق میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ انسان کا شعور ارتقاء پذیر ہے اور دوسری مخلوق اس ارتقائی شعور کے بغیر ہے۔ انسان کا ارتقائی شعور، تقاضوں اور حواس کی حیثیت کو علم الاسماء کی بدولت جانتا ہے اور اسی صفت یعنی علم

الاسماء جیسے ورثہ کی بدولت ممتاز ہے۔ یہ ورثہ نعمت ہے اور اس خصوصی نعمت سے مستفیض ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں اپنی ذات کا یعنی اپنی روح کا عرفان حاصل ہو۔ انسان کی روح اس کے سامنے آ جائے۔ اس کے بعد انسان کے اوپر علوم کے دروازے کھل جاتے ہیں اور رب کریم سے رشتہ مستحکم ہو جاتا ہے اور جب کوئی بندہ اس مستحکم رشتے کے دائرے میں قدم رکھ دیتا ہے تو وہ اس امانت سے وقوف حاصل کر لیتا ہے جو اللہ نے اسے ودیعت فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی روح سے اور اپنی امانت سے واقف ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

السلام علیکم!

اورینٹیئل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں خطاب

جون ۲۰۰۶ء میں خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کو اورینٹیئل کالج پنجاب یونیورسٹی میں خطاب کے لئے مدعو کیا گیا۔ اورینٹیئل کالج کے سینٹ ہال میں ۲۰۰ سے زائد طلباء و طالبات نے آپ کا یہ لیکچر اٹینڈ کیا۔ قبل ازیں صدر شعبہ فارسی اور مشیر برائے امور طلبہ معین نظامی نے عظیمی صاحب کا پرتپاک استقبال کیا۔ نگران مراقبہ ہال لاہور میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب بھی ہمراہ تھے۔ نظامت کے فرائض شعبہ اردو کی طالبہ امبر اصغر نے انجام دیئے۔ عظیمی صاحب کے فکر انگیز لیکچر کے بعد حاضرین نے مختلف سوالات بھی کئے جن کے عظیمی صاحب نے تسلی بخش جوابات دیئے۔ آخر میں معین نظامی صاحب نے عظیمی صاحب کا شکریہ ادا کیا۔ ایوانِ اساتذہ میں چائے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ڈاکٹر سلیم مظہر، شکیل احمد، ڈاکٹر مظہر معین، ڈاکٹر دوست محمد شاکر، ڈاکٹر قمر، ڈاکٹر فخر الحق نوری بھی شریک ہوئے۔

سورۃ فاتحہ کی تلاوت سے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے الشیخ عظیمی صاحب نے فرمایا:
محترم اساتذہ کرام اور حاضرینِ محفل، طلباء و طالبات!
السلام وعلیکم!

بلاشبہ میرے لئے یہ انتہائی سعادت کی بات ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے میری اتنی پذیرائی ہوئی اور لوگ مجھے سننے کے لئے تشریف لائے۔ اس بات پر میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے یہ سب میرے اوپر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم سیّدنا حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل اور میرے مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی خصوصی نسبت کے تحت ہے۔ اللہ تعالیٰ میری اس نسبت سے آپ سب کو بھی مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جب سے یہ دنیا بنی...... اور جب سے اِس دنیا پر آدم وحوا پیدا ہوئے...... اُس وقت سے ایک ہی کہانی چلی آرہی ہے...... اور جب تک یہ دنیا قائم ہے، ایک ہی کہانی لوگ بیان کرتے رہیں گے...... ایک ہی لکیر کو پیٹتے رہیں

گے اور دنیا ختم ہو جائے گی......

یہاں نیا کچھ بھی نہیں ہے...... آپ لاکھ کہیں کہ یہاں سب کچھ نیا ہے!......

کیا نیا ہے؟......

جب دنیا بنی اور دنیا میں آدم و حوا کی پیدائش ہوئی...... تو اُس دنیا میں آدم و حوا موجود تھے...... آج اُن کی اولاد آدم و حوا کی شکل میں زمین پر موجود ہے......

جس طرح امّاں حوّا اماں بنی تھیں...... اسی طرح حوّا کی کتنی ہی بیٹیاں مائیں بن چکی ہیں، بن رہی ہیں اور بنتی رہیں گی...... اور اِسی طرح آدم کی پیدائش سے لے کر آج تک انسانی شماریات سے بھی زیادہ تعداد میں آدم کے بیٹے باپ بن چکے ہیں اور جب تک قیامت نہیں آجاتی یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا......

امّاں حوا نے روٹی کھائی اور آج تک حوا کی ہر بیٹی روٹی کھا رہی ہے...... ابّا آدم نے پانی پیا تو آدم کا ہر بیٹا پانی سے ہی اپنی پیاس بجھاتا ہے......

یہاں کوئی بات نئی نہیں ہے!......

بچپن، لڑکپن میں...... لڑکپن، جوانی میں...... اور جوانی، بڑھاپے میں اُسی طرح تبدیل ہو رہی ہے، جس طرح ابتداء میں تبدیل ہوئی تھی......

کوئی چیز یہاں نئی نہیں ہے!......

مثلاً...... آج میں ایک ضعیف بزرگ ہوں...... اگر آپ میرے ماضی کو تلاش کریں گے تو کبھی میں ننھا منا معصوم سا بچہ تھا...... اپنی ماں کے سینے سے چمٹا رہتا تھا...... پھر کچھ بڑا ہوا اور بچپن کے دور میں داخل ہو گیا...... بچپن سے لڑکپن میں آیا...... لڑکپن گزرا تو جوانی آئی......   جوانی گئی تو بڑھاپا آگیا...... اب بڑھاپے کے بعد کی منزل درپیش ہے...... اس منزل میں مادّی وجود ظاہری نگاہ سے غائب ہو جاتا ہے......

اس دنیا کے ہر فرد کی یہی ایک کہانی ہے...... اللہ میاں نے کسی فرد کے لئے علیحدہ سے کوئی نئی کہانی نہیں بنائی...... لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ انسان اپنی کمزوری اور ناقص العقلی کی بناء پر یہاں ہر چیز کو نئی کہہ رہا ہے......

مثلاً آپ کے گھر میں ایک من گندم رکھا ہوا ہے...... اس میں سے آدھا پسوا لیا...... آپ روزانہ اسی پسی ہوئی گندم کے آٹے کی روٹی کھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نئی روٹی کھا رہے ہیں......

اسی طرح پانی بھی ایک ہی ہے...... جسے ہر بندہ بشر پی رہا ہے...... چھ مہینے کا بچہ بھی وہی پانی پی رہا ہے اور

ساٹھ سال کا بوڑھا بھی وہی پانی پی رہا ہے...... لیکن کہتا ہے کہ پانی نیا ہے......

ایک بچی جوان ہوئی...... پھر اُس کی شادی ہو گئی...... اللہ نے کرم کیا اور وہ اُمید سے ہو گئی...... وہ کہتی ہے کہ میں نئی ماں بن رہی ہوں...... حالانکہ اُس سے پہلے اُس کی ماں ان مراحل سے گزری تھی تو وہ پیدا ہوئی...... اُس کی ماں سے پہلے اُس کی نانی...... اُس کی نانی سے پہلے نانی کی والدہ...... اور اگر آپ جوڑتے چلے جائیں گے تو یہ سلسلہ چلتے چلتے اماں حوا سے جا ملے گا......

اگر آپ تفکر کریں ...... عقل و شعور کو استعمال کریں تو یہاں آپ کو کوئی چیز نئی نظر نہیں آئے گی!...... ہر چیز پُرانی ہے...... وہی پُرانی کبھی نئی ہو جاتی ہے ...... اور کبھی پُرانی ہو جاتی ہے......

مثلاً ایک بچہ دنیا میں پیدا ہوا...... ابھی وہ بچہ ایک دن کا ہے...... جب وہ دوسرے دن میں داخل ہوا تو وہ نیا ہو گیا...... لیکن ایک دن کا پُرانا بھی تو ہوگا...... جب تین دن کا ہوا تو تیسرے دن کا نیا اور دو دِن کا پُرانا ہو گیا...... جب وہ پانچ دن کا ہو جائے گا تو کہیں گے کہ یہ بچہ چار دن کا پُرانا ہے اور پانچویں دن میں نیا ہے...... اسی صورت میں جب وہ بچہ سالوں میں منتقل ہو جاتا ہے اور اُس کی عمر بارہ سال ہو جاتی ہے تو وہ بارہویں سال میں نیا ہے لیکن گیارہ سال پُرانا بھی تو ہے...... اٹھارہ سال کا جوان اِٹھارہویں سال میں نیا ہے...... لیکن سترہ سال پُرانا بھی ہے......

ایک بچہ جب دو سال کا ہوا تو کیا اُس کے دو سال ختم ہو گئے...... فنا ہو گئے...... یا پھر اُس کے ساتھ موجود ہیں؟......

دو سال کا بچہ!...... پہلے ایک دن کا ہوا...... پھر دوسرے دن میں داخل ہوا...... چھ مہینے گزارے ...... سال بھر کا ہو گیا...... اسی طرح اُس کے دو سال گزر گئے...... دو سال جو اُس نے گزارے...... کہاں غائب ہو گئے...... نظر کیوں نہیں آ رہے...... یہ دو سال جس پردے میں چھپ گئے، اُسی پردے کے پیچھے سے نیا دن نمودار ہوا...... جو چیز پردے کے پیچھے چلی گئی وہ پُرانی ہو گئی...... اور جو چیز پردے سے نکل کر سامنے آ گئی...... وہ نئی ہے......

دراصل یہ شعور کی کمزوری ہے...... یہ شعور کا ادھورا پن ہے...... جس نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا ہے...... اِسی کی وجہ سے ہم دھوکے اور فریب میں مبتلا ہیں......

کہا جاتا ہے کہ ہر روز نیا سورج نکلتا ہے...... اگر سورج نیا نکلتا ہے تو پھر آپ کے گھر میں بھی تو کوئی تبدیلی آنی چاہیئے...... کیا ایسا ہوتا ہے کہ اِدھر کا کمرہ اُدھر ہو گیا ہو؟......

آپ کے گھر میں ...... شہر میں...... ملک میں...... اور پوری دنیا میں...... کسی قسم کی کوئی تبدیلی واقع

ہوئی؟......

پھر آپ کا یہ کہنا کہ یہ نیا دن ہے!...... کس حد تک درست ہے؟......

کیا آپ کے ماحول میں کوئی تبدیلی آئی ..... جب کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی تو پھر دن نیا کیسے ہوا؟......

لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ نیا دن ہے!...... نیا سورج طلوع ہوا ہے!...... اگر اسے درست مان لیا جائے...... پھر سورج کی روشنی میں بھی تو کوئی تبدیلی آنی چاہیئے تھی...... آپ کے گھر میں جو آٹا رکھا ہوا ہے...... جس کی روٹی آپ پکا کر کھاتے ہیں...... کیا ہر نئے دن اُس آٹے کا رنگ بھی تبدیل ہو جاتا ہے؟...... جب ہر دن نیا ہے تو کسی دن آٹے کا رنگ پیلا ہو، کبھی نیلا، کبھی سفید...... لیکن جب سے دنیا بنی ہے...... گندم بھی وہی ہے...... گندم کو پیسنے کے بعد حاصل ہونے والا آٹا بھی وہی ہے...... آگ بھی وہی ہے...... آٹا گوندھنے کا طریقہ بھی وہی پُرانا ہے...... اور روٹی پکانے کا عمل بھی اُسی طرح سے چلا آ رہا ہے......

لیکن دنیا میں کہا جاتا ہے کہ...... نیا دن نکلا ہے!......

مبارک ہو! نیا سورج طلوع ہوا ہے......

کسی کا بچہ دس سال کا ہو گیا...... کہا جاتا ہے کہ ماشاء اللہ بچہ دس سال کا ہو گیا...... بچے کی سالگرہ کی جاتی ہے...... کیک کاٹا جاتا ہے...... عزیز و اقرباء کو جمع کیا جاتا ہے ......

جبکہ حقیقی صورتحال یہ ہے کہ بچے کو اگر اللہ تعالیٰ نے ساٹھ سال کی عمر دے کر دنیا میں بھیجا تھا...... جب بچہ دس سال کا ہوا تو اس کی عمر بڑھ گئی یا کہ گھٹ گئی؟......

ساٹھ سال میں سے دس سال نکل گئے...... تو اس بیچارے کے پاس تو پچاس سال ہی باقی بچے...... اب کیا اس بات پر خوشی منائی جائے کہ میرے بچے کی عمر دس سال کم ہو گئی؟......

آپ کے بچے کو اللہ نے ساٹھ سال کی عمر دے کر دنیا میں بھیجا...... اور اُس کی عمر میں سے دس سال کم ہو گئے...... تو پھر آپ کس بات کی خوشی منا رہے ہیں...... عمر گھٹنے کی یا بڑھنے کی؟......

دراصل انسانی شعور کی یہ کمزوری ہے کہ وہ حقیقت کو مسخ کر کے، توڑ مروڑ کے اپنے حافظے کا حصہ بنا لیتا ہے...... پھر یہی مسخ شدہ اور بگڑے ہوئے خدوخال اُس کے تجربات کا، مشاہدات کا، عادات اور حرکات کا سانچہ بن جاتے ہیں...... اب جس قدر بھی معلومات اسے حاصل ہوتی ہے ہیں ان ہی سانچوں میں ڈھلتی چلی جاتی ہیں...... یہ ہے انسان کا تمام کارنامہ اور اس کی متعیّن کردہ اور فرض کردہ سمتیں، فارمولے اور اصول...... ان ہی خرافات کے

بارے میں وہ بار بار یہ کہتا رہتا ہے کہ یہ ہے میرا تجربہ، یہ ہے مشاہدہ، یہ ہے علمِ طبیعی!......

میرے نقطۂ نظر سے تصوّف بھی مادی علوم کی طرح ایک علم ہے۔ جس طرح میڈیکل سائنس ایک علم ہے، جس طرح Math ایک علم ہے جس طرح انجینئرنگ ایک علم ہے وغیرہ وغیرہ تو روحانیت یا تصوّف بھی ایک علم ہے۔ اب دیکھئے ہر علم کی الگ الگ افادیت ہوتی ہے مثلاً میڈیکل سائنس کی ایک الگ اپنی افادیت ہے، الگ فیلڈ ہے۔ سوِل انجینئرنگ کی الگ ایک افادیت ہے۔ اسی طرح Math کی الگ افادیت ہے۔ یعنی ہر علم کی اپنی ایک افادیت ہوتی ہے اگر اس کی افادیت نہیں ہوگی تو وہ علم ختم ہو جائے گا۔ یہ بات میں قرآنِ پاک کی اس آیت کی بنیاد پر کر رہا ہوں جس میں فرمایا گیا ہے کہ "ہم نے ہر شے کو جوڑے دھرے سے پیدا کیا"۔

اسی طرح علم کے بھی دو رخ ہیں۔ ایک مادی علم اور ایک باطنی علم جس کو انبیاء کرامؑ اور اولیاء کرامؒ نے روح کا علم یا روحانیت یا تصوف قرار دیا ہے۔

اسی طرح انسان کا جو شعور ہے اس کے بھی دو رخ ہیں ایک ظاہر جو جسم کے ساتھ کام کرتا ہے اور ایک پوشیدہ رخ جو جسم کی اصل حقیقت یعنی روح کے اندر کام کرتا ہے۔ ان دونوں رخوں سے متعارف کرانے کے لئے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے واقف کرانے کے لئے، انبیاء کرامؑ کا ایک لاکھ چالیس ہزار نفوس پر مشتمل قافلہ دنیا میں وقوع پذیر ہوا۔ انبیاء کرامؑ کے بعد اولیاء اللہ جو وارثینِ انبیاءؑ کہلائے انہوں نے اس بات کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ سب حقائق سے اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعے قرآن میں تعلیمات تحریر کر کے ہمیں یہ تعلیمات حوالے کر دی ہیں جن تعلیمات کا محور یہ ہے کہ قرآن پاک میں تین علوم بیان کئے گئے ہیں......ایک تو شریعت کا علم ہے، یعنی انسان کا رہن سہن کیا ہو؟...... معیشت کس طرح کی ہو؟...... معاشرت کیا ہو؟...... آپس کے حقوق کیا ہیں؟...... اللہ کے حقوق کیا ہیں؟......

دوسرا علم تاریخ کا ہے...... جس میں بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے، اُنہوں نے اللہ کا پیغام اپنی اپنی قوم کے سامنے پیش کیا...... وہ پیغام یہی تھا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے...... اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور جو لوگ اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں، اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اللہ کی پرستش کرتے ہیں، اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو معبود اور خالق نہیں مانتے، اللہ کے پاس اُن کا اجر ہے...... اور جو لوگ اللہ کی وحدانیت میں، اللہ کی ربوبیت میں، اللہ کی خالقیت میں، حاکمیت میں کسی کو شامل سمجھتے ہیں، ملاوٹ کرتے ہیں، یعنی شرک کرتے ہیں...... اللہ تعالیٰ کے یہاں اُن کے لئے عذاب کی بشارت ہے...... تمام انبیاء علیہم السلام کی یہی تعلیم ہے اور قرآن

پاک میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبران علیہم السلام کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ جب اُن کی قوموں نے اللہ وحدہٗ لاشریک کو دل سے تسلیم نہیں کیا تو اُن کو تباہ و برباد کر دیا گیا......

قرآن میں بیان کردہ تیسرا علم ''معاد'' ہے...... معاد کا علم ان سوالات کے جواب دیتا ہے کہ غیب کی دنیا کیا ہے؟...... کیا انسان غیب کی دنیا سے واقف ہو سکتا ہے؟...... اور کس حد تک غیب کی دنیا سے واقف ہونے کے بعد وہ غیب الغیب اللہ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے...... ہر انسان جو اس دنیا میں موجود ہے...... وہ چھوٹا ہو، بڑا ہو، ضعیف ہو، کمزور ہو، طاقتور ہو، وہ پیدا ہوتا ہے...... اگر انسان کی پیدائش نہ ہو تو انسان کا وجود ہی اس دنیا میں زیرِ بحث نہیں ہوگا...... پیدائش کے اس مرحلے پر جب ہم غور و فکر کرتے ہیں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ کوئی بھی انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو وہ غیب کی دنیا سے آتا ہے...... اور جب انسان مرتا ہے تو کہاں چلا جاتا ہے؟...... ایک بچے کی عمر چھ ماہ ہے...... جب وہ ساتویں مہینے میں داخل ہوتا ہے، یعنی سات ماہ کا ہوتا ہے تو اس کے چھ ماہ کہاں چلے جاتے ہیں؟...... ان تمام سوالات کا ایک ہی جواب ہوگا اور وہ یہ کہ سات مہینے غیب میں چلے گئے!...... آپ جب کسی بیس سال کے نوجوان کا تذکرہ کرتے ہیں تو آپ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ ۲۰ سال پہلے پیدا ہوا تھا...... یا اس کی پیدائش کو بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے...... یہ بیس سال ماضی میں دفن ہو گئے...... ماضی کا مطلب ہے غیب کی دنیا...... غیب کی دنیا سے جب تک انسان اپنا رشتہ نہیں جوڑے گا، اُس وقت تک نہ تو وہ اللہ سے اور اللہ کے رسول ﷺ سے متعارف ہوگا اور نہ ہی اُسے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے باطنی پہلو سے آگاہی حاصل ہو سکے گی...... رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کو اس دنیا میں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والی ہستی اللہ سے واقفیت حاصل کرے...... اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ سے واقفیت کیسے حاصل ہوگی؟...... اللہ تو غیب ہے...... اور غیب تو ہمیں گوشت پوست کی آنکھوں سے نظر ہی نہیں آتا...... اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں اپنی مادی زندگی اور مادی زندگی کو چلانے والی زندگی کا تجزیہ کرنا ہوگا...... اس تجزیہ سے ہمارے سامنے یہی بات آئے گی کہ مادی جسم کو حرکت میں رکھنے والی ایجنسی ''روح'' ہے...... روح کے علاوہ یہاں نہ کوئی آدمی زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کام کر سکتا ہے...... درخت، پرند، چرند، حیوانات، نباتات، ارض و جبال غرض دنیا کی ہر شے میں روح ہے...... اسی طرح انسان میں بھی روح ہے...... انسان واحد مخلوق ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے روح کا علم سکھایا ہے...... یہ وہی علم ہے جس کے بارے میں قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں......

''پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اُنہوں نے عرض کیا..... کیا آپ زمین میں کسی ایسے فرد کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں برپا کر دے گا..... آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح و تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ اللہ نے فرمایا..... جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے..... پھر اللہ پاک نے آدم کو علم الاسماء منتقل کیا اور اس کے بعد فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ اور فرمایا..... اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو پھر تم علم الاسماء کے بارے میں بتاؤ۔ فرشتوں نے عرض کیا..... بے عیب اور نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں..... جتنا آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے..... حقیقت تو یہ ہے کہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں..... پھر اللہ نے آدم سے کہا..... تم ان کے سامنے علم الاسماء بیان کرو..... جب آدم نے علم الاسماء کے بارے میں بیان کیا تو اللہ نے فرمایا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں..... جو تم سے مخفی ہیں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو..... اُسے بھی میں جانتا ہوں.....

قرآن پاک کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسے علوم سکھا دیئے ہیں جو علوم کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے نہیں سکھائے..... اگر انسان ان علوم سے واقف نہیں ہے تو پھر اُس کی حیثیت اشرف المخلوقات کی نہیں ہوگی بلکہ وہ دیگر تمام مخلوقات کی سطح پر ہوگا..... آپ دیکھئے کہ جو تقاضے انسان کے اندر اُبھرتے ہیں..... وہی تقاضے حیوانات میں بھی پیدا ہوتے ہیں..... چنانچہ علم الاسماء سیکھے بغیر انسان کی حیوانات پر کوئی فضیلت نہیں..... اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے باطن کو تلاش کرے..... باطن یعنی روح کو تلاش کرے..... جب کوئی بندہ اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ اللہ سے بھی واقف ہو جاتا ہے.....

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں..... میں تو تمہاری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہوں..... تم مجھے دور کیوں سمجھ رہے ہو..... جان سے زیادہ قریب ہونے کا کیا مطلب ہوگا..... آپ اپنی جان کو محسوس کرتے ہیں؟..... ہر آدمی کہے گا میں اپنی جان کو محسوس کرتا ہوں..... جب ہی تو زندہ ہوں..... جب ہی تو چل پھر رہا ہوں.....

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ.....

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تمہاری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہوں..... ''اقرب'' کا مطلب ہے کہ فاصلہ ہے ہی نہیں..... یعنی اے میرے بندو! میں تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم فاصلے کا تعین ہی نہیں کر سکتے.....

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں..... وَفِیۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ..... میں تمہارے اندر ہوں تم

مجھے دیکھتے کیوں نہیں......

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں...... تم میری سماعت سے سنتے ہو میری بصارت سے دیکھتے ہو... میرے فواد سے سوچتے ہو...... میں نے تمہیں وہ علم دیا ہے جس علم کے ذریعے تم مجھ سے قریب ہو سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرماتے ہیں کہ...

یہ لوگ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اے پیغمبر (ﷺ) آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے متعلق ہے اور روح کے بارے میں جتنا علم دیا گیا ہے وہ قلیل ہے

یعنی روح کا علم تو دیا گیا ہے مگر یہ قلیل ہے۔ اس نکتے کو ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جتنا علم ہے، روح کا علم اس کا قلیل حصہ ہے...... اب انہی آیات پر ہم گفتگو کریں گے...

جب سے یہ دنیا بنی ہے اور آدم علیہ السلام اس دنیا میں بھیجے گئے، اس وقت سے دنیا میں تلاش اور جستجو کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے کہ علم کیا ہے؟...... آدم علیہ السلام یعنی آدم کا ہر بیٹا اِس دنیا میں کیوں آیا؟ ..... حقیقت یہ ہے کہ اپنی مرضی سے یہاں کوئی نہیں آیا... پھر یہ کہ اس دنیا میں جب دل لگ جاتا ہے تو وہ نہ چاہنے کے باوجود اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ یہاں دو چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ اوّل اپنی مرضی کے بغیر پیدا ہونا اور دوم اپنی مرضی کے بغیر مرنا......

علم کی جو بھی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے وہ پیغمبروں کے ذریعے نوعِ انسانی تک پہنچی ہے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے۔ ان کی تعلیمات کو اگر بہت زیادہ اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے تو اس کے دو رُخ متعین ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ انبیاء علیہم السلام نے دوسری مخلوقات سے انسان کو ممتاز کرنے کے لئے اچھائی اور برائی کا تصور دیا...... اور یہ اچھائی اور برائی اس لئے بتائی گئی کہ زمین کے اوپر ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جس معاشرے میں چھین جھپٹ نہ ہو، فساد نہ ہو، حق تلفی نہ ہو...... امن کے ساتھ، محبت کے ساتھ، بھائی چارے کے ساتھ، اُخوت و ہمدردی کے ساتھ، خدمت کے جذبے کے ساتھ انسان اس دنیا میں رہے اور خوش ہو کر رہے۔

اب حقیقی خوشی کو کیسے تلاش کیا جائے؟...... تو اس کے لئے ہمیں ماضی میں جانا پڑے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو علم الاسماء سکھائے اور فرشتوں نے آدم کی حاکمیت کو تسلیم کیا تو پھر آدم کی سکونت کا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، مگر ایک شرط یہ بھی لگا دی کہ خوش ہو کر رہنا ہے اور جہاں سے جی

چاہے Time and Space سے آزاد ہو کر کھانا پینا۔ ایک تو یہ فرمایا کہ خوش ہو کر کھانا پینا اور دوسرے یہ فرمایا کہ اس درخت کے قریب مت جانا اور اگر تم اس درخت کے قریب گئے تو تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ آدم علیہ السلام سے سہو ہوا اور اس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق آدم کو زمین پر بھیج دیا گیا۔ جب آدم علیہ السلام زمین پر آئے تو آدم کو زمین کے عناصر سے بنا ہوا جسم ملا اور اس مٹی کے پتلے یا عناصر سے تیار جسم جو در اصل ایک خول ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح ڈال دی اور یوں گوشت پوست کا جسم چلنے پھرنے لگا۔

یہاں سے آدم کی شخصیت کے دو رُخ بن گئے۔ ایک مادّی عناصر سے بنا جسمانی رُخ جس کی اپنی کوئی ذاتی حیثیت اور حرکات وسکنات اور جذبات واحساسات تسلیم نہیں کئے گئے۔ اور دوسرا وہ رخ جس نے مادی عناصر سے مرکب جسم کو سنبھالا ہوا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی زندہ لیٹا ہوا ہے اور ایک مردہ لیٹا ہوا ہے۔ زندہ آدمی کے سوئی چبھوئی جائے وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ جائے گا جبکہ مردے کو مارا پیٹا جائے حد یہ کہ پوسٹ مارٹم کیا جائے وہ اُف تک نہیں کرے گا۔ زندگی کے تقاضوں میں سب سے اہم کھانا پینا ہے۔ ایک زندہ آدمی کو کھانا دیا جائے تو آرام سے کھالے گا مگر مردہ آدمی میں کھانے پینا کا تقاضہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یعنی کھانا پینا تب ہوگا جب جسم میں روح موجود ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھانا جسم نے نہیں کھایا بلکہ روح نے جسم کو میڈیم بنا کر کھانا کھایا۔ اسی طرح نماز کی مثال لے لیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو نماز قائم کرنے کی سعادت نصیب فرمائے...... تو کیا یہ نماز جسم نے پڑھی......؟ یہاں بھی آپ یہی کہیں گے کہ فزیکل باڈی کو میڈیم بنا کر روح نے نماز پڑھی...... علیٰ ھٰذا القیاس اسی طرح آپ اس میں جتنی چھان پھٹک کریں گے آپ کو یہی جواب ملے گا کہ مادّی جسم صرف میڈیم ہے اور ہر کام روح کر رہی ہے۔

میرے مرشدِ کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک کتاب "لوح وقلم" تحریر کی۔ اس کے پہلے صفحہ پر اُنہوں نے تحریر فرمادیا ہے کہ "یہ کتاب میں سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حکم سے لکھ رہا ہوں اور مجھے یہ حکم بطریقِ اویسیہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملا ہے"...... اس کتاب میں آپؒ نے ایک جگہ فرمایا کہ لباس ہر انسان کی ضرورت ہے۔ جب انسان نے لباس پہنا ہوتا ہے مثلاً کُرتا شلوار، تو ہاتھ ہلانے پر آستین ہلتی ہے اور چلنے پر شلوار حرکت کرتی ہے، مگر جب اس لباس کو اُتار دیا جائے تو جسم کے حرکت کرنے کے باوجود لباس میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ بالکل یہی صورت روح کے ساتھ ہے کہ وہ مادّی دنیا کے عناصر سے ایک لباس یعنی ہمارا جسم بنا کر خود اس میں چھپ

گئی۔ جب تک روح جسم میں ہے جسم حرکت کرے گا اور روح کے نکل جانے کے بعد جسم میں کوئی حرکت نہیں ہو گی۔ یعنی لباس کی طرح اس جسم کی بھی کوئی ذاتی حرکت نہیں ہے۔

اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَ یُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ. یعنی ہم زندگی کو موت میں داخل کر دیتے ہیں اور موت کو زندگی میں داخل کر دیتے ہیں...... تو یہ جسم و جان کا جو رشتہ ہے وہ یہ ہے کہ روح نے اپنے لئے ایک لباس بنایا ہے اور روح اس جسم کو چلاتی ہے، پھراتی ہے، حرکت میں رکھتی ہے۔ انسانی شعور میں خیالات کو پروسس کرنے والی ایجنسی جو دماغ میں قائم ہے، اس کی بنیاد پیغمبروں کی Breifing پر ہے، یعنی اچھائی اور برائی کا ایک تصور ہمارے اندر قائم ہے جسے ہم ضمیر کا نام دیتے ہیں۔ ضمیر ایک روشنی ہے، روح کا ایسا پارٹ ہے جو ہر انسان کو برائی سے منع کرتا ہے اور اچھائی کی ترغیب دیتا ہے۔ لیکن جب روح اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے تو ضمیر بھی وہاں نہیں رہتا۔

جتنے بھی روحانی سلسلے ہیں ان سب کا ایک ہی مقصد ہے کہ لوگوں کو ایسے راستے پر چلایا جائے جس پر چل کر وہ حضور پاک ﷺ اور انبیاء کرامؑ کی طرزِ فکر حاصل کریں۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور پاک ﷺ تک تمام انبیائے کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرزِ فکر پر غور کیا جائے تو وہ ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ ساری مخلوق اللہ نے اس لئے پیدا کی ہے کہ اللہ کی عبادت کی جائے اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے اور پیغمبروں کی تعلیمات یعنی زندگی گزارنے کے اصول، طریقے اور ضابطے جنہیں شریعت کہا جاتا ہے، اُن پر عمل کیا جائے۔ جب بھی کوئی پروگرام دوسرے لوگوں کو بتایا جاتا ہے یا کسی ماحول سے انہیں آشنا کیا جاتا ہے چاہے وہ دنیاوی عمل ہو یا دینی!...... تربیت ضروری ہوتی ہے۔ سلسلہ عظیمیہ نے بھی ایک تربیتی پروگرام مرتب کیا ہے جس کے ذریعے لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی اللہ نے توفیق عطا فرمائی۔ سلسلہ عظیمیہ کی تعلیم یہ ہے کہ حرکات کا تعلق ماڈی جسم کے ساتھ نہیں ہے بلکہ جب تک روح ہے انسان رحمانی کام بھی کرتا ہے اور شیطانی بھی۔ جب تک بندہ اپنی روح سے واقف نہیں ہوگا وہ پیغمبر آخر الزماں سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور انبیاء علیہم السلام کی فکر سے واقف نہیں ہوسکتا۔ جب کوئی بندہ انبیاء اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فکر سے آشنا ہو جاتا ہے تو وہ یہ جان لیتا ہے کہ دنیا ایک سرائے سے زیادہ کچھ نہیں...... انسان یہاں دو طرح کے کام کرتا ہے برائی یا اچھائی، برائی کی صورت میں یہاں بھی ناخوش اور آگے بھی ناخوش...... نیکی، بھلائی، سعادت مندی، خدمتِ خلق کا جذبہ، والدین کے حقوق پورے کرنے کا جذبہ، اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات کا اتباع، دنیا اور آخرت دونوں

زندگیوں میں کامیابی کا ضامن ہوتا ہے۔ دنیا کے سرائے ہونے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اس لئے آخرت کی تیاری ضروری ہے۔آخرت کی تیاری انبیاء کرامؑ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنی روح سے واقف ہونے سے ہو جائے گی۔

آپ نے اس پروگرام میں شرکت کی آپ کا بہت شکریہ..... میری دعا ہے کہ اساتذہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے اللہ تعالیٰ اس پر ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آپ کو پروگرام کی کامیابی کی بہت بہت مبارکباد ہو۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

السلام علیکم!

☆......☆......☆

محفل میلاد سے خطاب بمقام جامع عظیمیہ لاہور

مورخہ ۱۶ مئی ۲۰۰۳ء بروز جمعۃ المبارک مراقبہ ہال جامعہ عظیمیہ آہلو روڈ، کاہنہ نو لاہور میں جشنِ عید میلاد النبیؐ کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی خواتین و حضرات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ تقریب میں سلسلہ عظیمیہ کے خانوادہ حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ تقریب کے اختتام پر نگران مراقبہ ہال لاہور، میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے شرکاء محفل خصوصاً دوسرے شہروں سے آئے ہوئے لوگوں کی آمد پر ان کا اور انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا۔

مرشد کریم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا!

آج کا دن بہت مبارک ہے اور با سعادت ہے کہ ہم حضور نبی کریم ﷺ کی یاد میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی ذاتوں کو حضور نبی کریم ﷺ کے نور سے منور کرنے کے لئے آج یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ آپ سب خواتین و حضرات کو بہت مبارک ہو۔

اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

(سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو عالمین کا ربّ ہے)۔

یعنی رب کی تشریح یہ ہے کہ ایسی ہستی جو عالمین کو زندہ رکھنے کے لئے وسائل پیدا کرتی ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

نہایت مہربان اور رحم کرنے والا۔

جو وسائل میں نے پیدا کئے ہیں ان وسائل کی تقسیم ایثار، محبت اور رحمت کے ساتھ کی جاتی ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ○

یوم جزا کا مالک

یعنی ان وسائل کی تقسیم میں عدل و انصاف اور توازن برقرار رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت پر غور کیا جائے تو وسائل کی پیدائش سامنے آتی ہے کیونکہ انسان اور زمین کے اوپر موجود تمام مخلوقات وسائل کی محتاج ہیں اگر مخلوق کے لئے وسائل مہیا نہ کئے جائیں تو مخلوق کی زندگی موت میں تبدیل ہو جائے۔ وسائل سے مراد زمین، پانی، آسمان، بارش، ہوا، دھوپ، پھل، اناج، فضا، مختلف گیسز، معدنیات، جمادات، نباتات ہیں۔ آکسیجن یا ہوا کے بغیر نہ تو زندگی کا تصور قائم ہوتا ہے اور نہ ہی زندگی قائم رہ سکتی ہے۔

بے شک سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے عالمین کے لئے وسائل پیدا کئے اور صفتِ رحمت کے ساتھ ان وسائل کو عدل و توازن کے ساتھ قائم رکھا ہوا ہے۔ نوعِ انسانی اور زمین پر آباد تمام مخلوقات ان وسائل سے فیض یاب ہوتی ہیں۔ ان وسائل کے بغیر زندگی کا تصور قائم نہیں ہوتا۔

انسانی زندگی کی بقا اور تقاضوں کی تکمیل کے لئے جو وسائل ہمیں میسر ہیں ان وسائل کی ایک خاص تقسیم ہے۔ مثلاً ہم ہوا استعمال کرتے ہیں اگر ہوا میں توازن نہ رہے اور ہوا کے طوفان آ جائیں تو ہماری زندگی تہس نہس ہو جائے گی۔ ہوا میں اگر آکسیجن کی مقدار کم و بیش ہو جائے تو ہم زندہ نہیں رہیں گے۔ اسی طرح اگر پانی کی تقسیم میں توازن برقرار نہ رہے تو پانی کا طوفان آ جائے گا، سیلاب میں انسان کی زندگی قائم نہیں رہتی بلکہ دنیا تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ پتہ چلا کہ وسائل کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں توازن ہو، تاکہ زندگی تباہ و برباد نہ ہو اور وسائل مخلوق کے لئے راحت و عافیت کا سبب بنیں۔ مخلوق کو آرام و آسائش مہیا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان وسائل کو رحمت کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔

ہر مخلوق وسائل کی محتاج ہے صرف اللہ وسائل کی احتیاج سے ماوراء ہے۔

رب العالمین نے جب کائنات بنائی اور اس کائنات کے لئے وسائل پیدا کئے تو پھر رب کائنات نے یہ چاہا کہ وسائل تقسیم کرنے والی ہستی مخلوق میں سے منتخب کی جائے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نہ کھاتے ہیں۔ نہ پیتے ہیں۔ نہ انہیں گھر کی ضرورت ہے۔ نہ اُن کا کوئی باپ ہے۔ نہ اُن کی کوئی ماں ہے۔ نہ اُن کی کوئی اولاد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے الحمد للہ رب العالمین کی صفت بیان فرمائی ہے جو عالمین کے لئے وسائل پیدا کرتا ہے۔ عالمین سے وسائل کی احتیاج ختم ہو جائے تو تغیر بھی ختم ہو جائے اور کائنات ختم ہو جائے۔ وسائل کی تقسیم میں یہ بات بنیادی ہے کہ وسائل کی تقسیم وہ کرے جو وسائل کی احتیاج سے آشنائی رکھتا ہو اور جو وسائل کی ضرورت، حصول و استعمال کی صفات رکھتا ہو۔ وسائل کی تقسیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ہستی پیدا فرمائی جس کے اندر

وسائل کی حاجت رکھ دی اور جس کے اندر تقاضے پیدا کر دیئے کہ وہ وسائل کو استعمال بھی کرے۔

اللہ تعالیٰ نے وسائل تقسیم کرنے والی اس ہستی کے لئے فرمایا!

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ

اللہ نے اپنے نور سے کائنات کے نقش و نگار بنائے، ضروریات اور احتیاج پیدا کیں اور وسائل پیدا فرمائے۔ ان وسائل کی تقسیم کے لئے آپ ﷺ کو رحمت للعالمین بنایا اور اپنے محبوب بندے کے اندر وسائل کی احتیاج رکھی کیونکہ اللہ تعالیٰ...... خالق اکبر کسی قسم کی احتیاج نہیں رکھتے۔ سورۃ اخلاص میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اَللّٰہُ الصَّمَدُ''

اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ احتیاج سے ماوراء ہے۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم و کریم ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو رحمت کے ساتھ بنایا۔ اس نے مخلوق کو پیار، محبت اور چاہت کے ساتھ تخلیق کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اے محبوب ﷺ ہم نے آپؐ کو عالمین کے لئے سراپا رحمت بنایا ہے اور آپؐ اس رحمت کے ساتھ وسائل تقسیم فرمائیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات میں رسول اللہ ﷺ کو اپنے اور مخلوق کے درمیان واسطہ بنایا۔ رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ مسلمان خوش نصیب ہیں کہ مسلمانوں کو جو در ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے بڑی ہستی حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کا در ہے۔

یاد رکھیں! اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اس نسبت سے کوئی بندہ رب تو نہیں ہوسکتا البتہ رسول اللہ ﷺ رحمت اللعالمین ہیں لہٰذا اس نسبت سے جب مسلمان رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آتا ہے اور کلمہ پڑھ کر اپنی نسبت رسول اللہ ﷺ سے قائم کر لیتا ہے تو مسلمان کو آپ ﷺ کی ''نسبتِ رحمت'' منتقل ہو جاتی ہے۔ ہر مسلمان چونکہ رسول اللہ ﷺ سے ایک روحانی، قلبی اور ظاہری رشتہ رکھتا ہے اس لئے اُس کے اندر یہ صفات منتقل ہو جاتی ہیں۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ عالمین کے لئے رحمت ہیں اسی طرح ہر مسلمان کو پوری نوع انسانی کے لئے رحمت کا ایک چلتا پھرتا کردار ہونا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو کافر کے لئے بھی رحمت بنایا ہے تاکہ وہ کافروں کے ساتھ اخلاقِ حسنہ سے پیش آئے اور کافر مسلمان کے اخلاقِ حسنہ اور کردار کو دیکھ کر ایمان قبول کریں جبکہ صورتحال یہ ہے کہ آج مسلمان خود مسلمانوں کے لئے زحمت کا باعث بن گیا ہے۔ مقامِ فکر ہے کہ کیا رب العالمین اور رحمت للعالمین نے تفرقہ کی اجازت دی ہے؟ عالمین سے کیا مراد ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے

لئے رب العالمین اور رسول اللہ ﷺ کے لئے رحمت للعالمین فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے رحمت للمسلیمین نہیں فرمایا۔ کیا حضور پاک ﷺ کافروں کے لئے رحمت نہیں ہیں؟ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات یہ ہیں کہ کافر کو بھی کافر نہ کہو۔ رسول اللہ ﷺ نے کافر و غیر مسلم کے حقوق متعین فرمائے ہیں۔ یہ سوال کہ اگر رسول اللہ ﷺ رحمت للعالمین ہیں، رحمت للمسلیمین نہیں تو مسلمان اور غیر مسلم میں اور اسلام اور کفر میں کیا فرق ہوا؟ فرق یہ ہے کہ جب بندہ مسلمان ہو جاتا ہے تو اُسے رحمت للعالمین کی صفت رحمت منتقل ہو جاتی ہے اور کافر کو یہ صفت منتقل نہیں ہوتی۔ مسلمان اگر اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے ہی رحمت نہیں ہے تو اسے سوائے محرومی اور بدنصیبی کے کیا ملے گا؟

میرے بزرگو، بھائیو، بیٹو اور میری بہنوں اور بیٹیو، یاد رکھیں! رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطالعے سے یہ بنیادی بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضور پاک ﷺ رحمت للعالمین ہیں۔ آپؐ کے ماننے والوں کو حضورؐ کی ''نسبتِ رحمت'' منتقل ہو جاتی ہے۔ جب انسان کے اندر رحمت ہوتی ہے تو اُس کے اندر اخلاق حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ غصہ ختم ہو جاتا ہے۔ نفرت سے پاک ہو جاتا ہے حسد، کینہ، بغض اور غرور و تکبر کی جگہ محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ہیں اور یہی آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ اس اُسوۂ حسنہ کی بنیاد اللہ کی قربت اور نسبت ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''میرا کھانا، میرا پینا، میرا اٹھنا، میرا بیٹھنا، میرا سونا، میرا جاگنا، میرا لڑنا سب کچھ اللہ کے لئے ہے''۔ یعنی

رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اللہ کی معرفت سوچتے ہیں۔ ہر چیز سے پہلے ذہن میں اللہ تعالیٰ آتا ہے اور پھر شے آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اور ہم سب کو یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل کریں اور میرا خیال ہے کہ یہ ایسا مشکل کام نہیں ہے کہ ہم نہ کر سکیں۔ اُمت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نبیؐ کی طرزِ فکر کی حامل ہوتی ہے۔ ہم سب کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے کہ ''ہمارے اندر رحمت ہے یا غصہ ہے؟''۔

محاسبہ کرنے کے بعد نظر آتا ہے کہ مسلمان میں غصہ، نفرت اور تکبر تو بہت آ گیا ہے لیکن رحمت کہیں نظر نہیں آتی اور مسلمانوں کے اندر پانچ فیصد بھی ایسی خوبیاں نہیں ملتیں جنہیں رسول اللہ ﷺ کی نسبت دی جا سکے بلکہ سچی بات تو یہ ہے اور دل یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمان ایک فیصد بھی اُسوۂ رسول ﷺ پر کاربند نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ غصہ کرنے والے افراد کے بارے میں فرماتے ہیں جو لوگ غصہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں

کرتا۔

غصہ، نفرت اور کبر سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی اسی سے عبارت ہے۔ آپؐ نے کبھی کسی پر غصہ نہیں کیا۔ بلکہ سب کو معاف فرمایا ہے۔ اپنے خاندان کے جھگڑے، قرضے، حتیٰ کہ قتل تک معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو رحمت للعالمینؐ فرمایا ہے۔ حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے حضورؐ کے چچا کا کلیجہ چبایا اور بے حرمتی کی لیکن جب وہ مسلمان ہوگئی تو آپؐ نے اسے بھی معاف کر دیا۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو سوائے غصہ، نفرت، حقارت، تکبر، غیبت، دکھ اور پریشانی کے کچھ نظر نہیں آتا۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ کا عملی مظاہرہ ہمارے سامنے ہے۔ حضور پاکؐ سراپا رحمت تھے۔ ہمیں بھی حضور پاک ﷺ کی طرزِ فکر پر عمل کرتے ہوئے اپنے بھائیوں، بچوں اور خاندان کے لئے رحمت بن کر رہنا چاہیئے۔ جب ہم رحمت بن کر جئیں گے تو ہماری مشکلات پریشانیاں اور بے سکونی کی کیفیات ختم ہو جائیں گی۔

ایک دفعہ تفکر کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اطلاع ذہن میں انسپائر ہوئی کہ اصل عید تو عید میلاد النبی ﷺ ہے کیونکہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ تو حضور پاک ﷺ کی اِس دنیا میں ولادت باسعادت کے بعد شروع ہوئیں۔ ارض و سمٰوات، مخلوقات اور امتِ مسلمہ کے لئے رسول اللہ ﷺ کی ولادت اصل عید ہے۔ اور عید الفطر و عید الاضحیٰ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت اور حیات طیبہ کے تابع ہیں۔ عید میلاد، آپؐ کی ولادت کی خوشی میں اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہونے کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نہ معلوم کب سے تخلیق کر کے چھپا رکھا تھا۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو عالمِ ناسوت میں بھیجا یہ اللہ تعالیٰ کا انعام اور مقامِ شکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرا نور تخلیق کیا۔

اور اس نور سے ساری کائنات بنائی۔

یہ تمام کائنات، اس کے اندر کی حرکت اور زندگی حضور پاک ﷺ کے نور کے تابع ہے۔ غور فرمائیں کہ کائنات میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔

عرش،

کرسی،

سمٰوات،

ارض،

فرشتے،

انبیاء،

یعنی اللہ تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ بھی ہے۔ وہ سب کائنات ہے اور سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے نور سے تخلیق ہوا۔

تو رسول اللہ ﷺ کی ولادت با سعادت سے بڑھ کر اور کون سی عید ہو سکتی ہے اور اس خوشی کو محسوس کرنا بڑی سعادت ہے اور اُن کے لیے خوش نصیبی کا اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی امت میں شامل ہیں اور اُن کے پیروکار ہیں۔

یہ دن ہر سال آتا ہے چودہ سو سال سے لوگ اس روز جمع ہوتے ہیں نعت خوانی ہوتی ہے مقالہ جات پڑھے جاتے ہیں اور سیرتِ طیبہ کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن اس سب اہتمام کے برعکس جب امتِ مسلمہ کی زندگی اور اعمال کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو بہت افسوس ہوتا ہے کہ چودہ سو سال سے رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کو دہرایا جا رہا ہے اور آپؐ کے اس مشن کا پرچار کیا جا رہا ہے کہ:

سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود عمل مفقود ہے۔

خطبہ الوداع میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں بلکہ بڑے یا چھوٹے ہونے کا معیار یہ ہے کہ مسلمان اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات پر کتنا عمل پیرا ہے۔ جو بندہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکامات پر جتنا عمل کرتا ہے اسی مناسبت سے وہ متقی، پرہیزگار اور بزرگ ہے۔

اُمتِ مسلمہ کی بدنصیبی ہے کہ چودہ سو سال سے ہزار ہا تقاریر کو سننے، لاکھوں کلمات کا مطالعہ کرنے اور کروڑ ہا بار رسول اللہ ﷺ پر درود شریف بھیجنے کے باوجود وہ تفرقہ کا شکار ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اس حکم اور مشن......

''سب مسلمان بھائی بھائی ہیں''

کے باوجود آج مسلمان کی پہچان یہ بن گئی ہے کہ وہ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جب تک فرقہ بندی اور آپس میں گروہ بندی کا تقابلی تذکرہ نہ کیا جائے مسلمان کی شناخت ہی نہیں ہوتی۔

چودہ سو سال میں رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کی اتنی خلاف ورزی ہوئی ہے جس کی کوئی مثل نہیں۔ آج مسلمانوں کی پہچان ہی یہ رہ گئی ہے کہ وہ دیوبندی، بریلوی، مقلد، غیر مقلد اور نہ معلوم کیا کیا ہیں بس نہیں ہیں تو صرف ایک اُمت واحدہ نہیں ہیں۔

ہر سال محافلِ میلاد منعقد کرنا اور ان میں لوگوں کا ذوق و شوق سے شریک ہونا صرف نشستند، گفتند و برخاستند ہو کر رہ گیا ہے۔ صد افسوس کہ چودہ سو سال میں علماء و مشائخ کا کوئی ایسا گروہ پیدا نہ ہوا جس نے یہ کوشش کی ہو کہ

مسلمان صرف مسلمان ہیں اور کچھ نہیں!

اس کے برعکس قوم تفرقہ میں بٹ گئی اور اس گروہ بندی کی وجہ سے قوم کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ وحدت اور اخوت کی تعلیمات پردے میں چھپ گئی ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے لئے جو انفرادی اور اجتماعی پروگرام مرتب فرمایا ہے اُس میں اجتماعیت کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

روزہ۔

باجماعت نماز۔

حج۔

اجتماعی اعمال ہیں۔

ماحول اور معاشرہ کو صاف ستھرا رکھنا۔

بے ایمانی سے بچنا۔

اپنے بھائیوں کے حقوق غصب نہ کرنا۔

یہ سب بھی اجتماعی اعمال ہیں۔

ایک اور ایک گیارہ اور گیارہ و گیارہ بائیس ہوتے ہیں۔ مسلمان تھوڑے سے ہی سہی لیکن اگر وہ آج یہ طے کر لیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے مشن کے لئے زبانی جمع تفریق کی بجائے زندگی میں عملی قدم بھی اُٹھائیں گے تو مسلمان اِس دنیا کی سب سے بڑی قوت بن سکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے مشن کے لئے بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں اور پریشانیوں کا سامنا کیا۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپ ﷺ کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اپنا آبائی شہر مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ ہجرت کرنی پڑی۔ غزوات ولڑائیوں میں حصہ لیا اور پھر صلہ رحمی سے اِن سب تکالیف اور عزیز و اقرباء کا خون بہا معاف بھی فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ ساری تکالیف اس لئے برداشت کیں کہ وہ اُمت کے لئے یہ مثال چھوڑ کر جا رہے تھے کہ مسلمان ایک ہیں اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط ہیں۔

مسلمان اللہ کو رب اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو رسولؐ اور قرآن پاک کو اللہ کی کتاب جان کر اِن پر ایمان رکھتے ہیں پس جب

اللہ بھی ایک ہے۔

رسول اللہ ﷺ بھی ایک ہیں۔

کتاب بھی ایک ہے۔

اور

مسلمان بھی رسول اللہ ﷺ کی ایک ہی اُمت ہیں۔

تو یہ درمیان میں تفرقہ کہاں سے آ گیا ہے؟

اس فرقہ بندی کی بنیاد پر کسی فرد کی رسائی نہ تو اللہ تعالیٰ تک ہوسکتی ہے نہ کوئی رسول اللہ ﷺ کو خوش کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی حال میں جنت کا مستحق بن سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ میری اُمت میں سے جو بندہ تعصب پر جیا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا اور اس کو میری شفاعت نصیب نہیں ہوگی۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

اللہ کی رسی متحد ہو کر مضبوطی کے ساتھ پکڑو ..... اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے برعکس جو آدمی تعصب پر جیا اور جس نے مسلمان کو اپنا بھائی نہ سمجھا اور تفرقہ بازی اختیار کرتے ہوئے کبر و غرور کیا وہ خسارے میں ہے۔ تفرقہ بازی کے نتیجے میں آدمی دیدہ و دانستہ کبر اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ صرف وہ سیدھے راستے پر ہے اور جنت میں جائے گا۔ جبکہ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون جنت میں جائے گا۔ جب کوئی فرقہ یہ کہتا ہے کہ صرف وہ جنتی ہے تو لامحالہ شیطان یہ وسوسہ اور خناس دل میں ڈال دیتا ہے کہ دوسرے دوزخی ہیں۔

زبان سے تو کہا نہیں جاتا لیکن جب اپنے آپ کو جنتی قرار دے دیا جائے تو اس کا مفہوم یہی نکلتا ہے اور شیطانی وسوسہ ذہن کو اُسی طرف لے جاتا ہے کہ دیگر لوگ جنتی نہیں ہیں۔

ایک فرقہ جو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا رسولؐ مان رہا ہے۔ قرآنِ پاک پر ایمان رکھتا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ادا کر رہا ہے تو ایسے بندہ کے لئے یہ گمان کرنا کہ یہ جنتی نہیں ہے اس سے بڑھ کر کوئی گمراہی نہیں ہو سکتی۔ تفرقہ بازی گمراہی ہے اور آدمی کو صراطِ مستقیم سے دور کر دیتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ یہ کوشش فرمائی ہے کہ سارے مسلمان بھائی بھائی بن کر رہیں اور آپس میں نہ لڑیں۔ ایک دوسرے کی حق تلفی نہ کریں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت سے رہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کا یہی مشن ہے۔ بھائی کو بھائی سے لڑانا، مسلمانوں کو آپس میں دست و گریبان کر کے فساد و خون خرابہ کرانا شیطان کا مشن ہے۔ اگر کوئی شیطانی خصلتوں یعنی تعصب، نفرت، حقارت اور تفرقہ کو اپناتا ہے تو وہ ایسے راستے پر چل پڑتا ہے جو شیطان کا پسندیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا مشن توحید ہے اور اللہ تعالیٰ وحدت کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُمتِ مسلمہ کے لئے یہ حکم ہے کہ جس طرح تم مجھے ایک مانتے ہو اسی طرح مسلمان ایک قوم کی طرح متحد ہوں۔ اگر ساری مسلمان امت ایک قوم بن جائے تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کی دوست ہے اور اللہ تعالیٰ کی دوست قوم ذلیل و خوار نہیں ہوتی۔

آج اس کے برعکس صورتحال یہ ہے کہ مسلمان سب سے زیادہ ذلیل، پریشان اور مفلوک الحال ہیں۔ اس دنیا میں اس وقت جتنی بڑی طاقتیں ہیں اُن کی کوشش یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر زیادہ سے زیادہ فرقے پیدا کر دیئے جائیں۔ غیر مسلم اقوام اس پروگرام پر عمل پیرا ہیں اور زیادہ سے زیادہ فرقے پیدا ہو رہے ہیں۔ نتیجتاً مسلمان ذلیل و خوار ہیں۔ غیر مسلم حاکم اور مسلمان ہر جگہ محکوم ہیں۔

اُمتِ مسلمہ کا انتشار، زبوں حالی، بے عزتی، بربادی اور ہلاکت صرف اس وجہ سے ہے کہ اسلام دشمنوں نے سازشوں کے ذریعے اُن کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور مسلمان تقسیم ہو کر فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ۷۲ سال کی عمر میں میرا تجربہ اور عقل یہ بتاتی ہے کہ اگر مسلمانوں کے اندر سے انتشار ختم نہ ہوا اور عالمِ اسلام میں مزید فرقے بنے اور مسلمانوں نے متحد ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے نہیں پکڑا تو یہ قوم برباد اور ختم ہو جائے گی اور کوئی اس کا نام

لیوا نہ رہے گا۔ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہیں۔ رب المسلمین نہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے۔

جو قومیں اپنی تبدیلی نہیں چاہتیں اللہ ایسی قوم کو اُن کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

جب کوئی قوم خود اپنی تباہی اور بربادی چاہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے منظور کر لیتا ہے اور جب کوئی قوم اپنا عروج چاہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی قبول کر لیتا ہے۔ اور اللہ ان دونوں باتوں سے بے نیاز ہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے مومن ایک دوسرے کا بھائی ہے اس کے برعکس یہاں صورتحال یہ ہے کہ بھائی ہونا تو درکنار ہم ایک دوسرے کو کافر کہتے نہیں چوکتے۔ آج جو پریشانی و ادبار ہے اور مسلمان تمام دنیا میں ذلیل و خوار ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان نے تعمیری پہلو چھوڑ کر تخریبی رُخ اختیار کر لیا ہے۔ تخریبی رخ یہ ہے کہ آپس میں تفرقہ ڈالا جائے اور ایک دوسرے کو بُرا سمجھ کر نفرت کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس تفرقہ بازی سے باہر نکلیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں کہ اگر مسلمان فوج فاتح بن کر کسی ملک میں داخل ہو تو عبادت خانوں کو نہ گرایا جائے، منبر نہ توڑے جائیں اُن کے مذہبی پیشوا کو قتل نہ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات تو یہ ہیں کہ دیگر مذاہب کے عبادت خانوں اور مذہبی پیشوا کا احترام کیا جائے لیکن آج مسلمان مسلمان نمازی کو قتل کر رہا ہے۔

مسلمان بے شمار مسالک، طبقات اور فرقہ جات میں منقسم ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ایک مسلک کا پیروکار دوسرے مسلک کے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔

آیئے! عزم کریں کہ ہم نوعِ انسانی کے لئے رحمت بننے کی کوشش کریں گے اور تفرقہ بازی سے بچیں گے کیونکہ تفرقہ بازی مسلمانوں کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ سب کلمہ گو مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور مسلمان تفرقہ سے اجتناب کرتے ہوئے دوسرے مسلمان کو بُرا نہیں کہے گا۔ خود کو جنتی اور دوسرے کو دوزخی گمان نہیں کرے گا۔ جب اس جذبہ سے عمل کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ عمل اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں امتِ مسلمہ میں پیدا کیا اور رسول اللہ ﷺ کی امت سے سرفراز فرمایا۔

ہمیں کلمہ اور نماز کی توفیق دی اور رسول اللہ ﷺ سے عشق و محبت ہمارے دلوں میں پیدا کی۔ ہمیں چاہیئے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کا بار بار مطالعہ کریں۔ آپ ﷺ کی تعلیمات اور اعمال کو اپنانے کی کوشش کریں۔ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کریں گے۔ تو انوارِ نبوت سے ہمارے قلوب اور ارواح منور ہو جائیں گی ہمیں دنیا جہاں پر عروج حاصل ہو جائے گا...... اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ آمین۔

السلام علیکم!

☆......☆......☆

ایوانِ اقبال میں پہلی سیرت کانفرنس سے خطاب

ایوان اقبال لاہور میں مارچ ۲۰۰۳ء کو مراقبہ ہال لاہور کے زیر اہتمام ایک سیرت کانفرنس بعنوان ''اسوۂ حسنہ سے معاشرہ میں راہنمائی'' کا انعقاد کیا گیا۔ اس سیرت کانفرنس میں مجیب الرحمٰن شامی صاحب، چیف ایڈیٹر خبریں اخبار و چینل فائیو اور نورالدین جامی صاحب ڈین فیکلٹی شعبہ اسلامیات بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی صاحبان نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ اس کے علاوہ کراچی اور ملک کے دیگر شہروں سے مہمانانِ گرامی اور سلسلہ عظیمیہ کے اراکین کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی جس کی تعداد تقریباً ہزار افراد سے زائد تھی۔ پروگرام کی مینجمنٹ بہت خوبصورت انداز سے کی گئی تھی۔ نگران مراقبہ ہال لاہور جناب میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نے آغاز میں مرشد کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کا خصوصی تعارف پیش کیا اور آپ کی سلسلہ کے لئے اور نوعِ انسانی کے لئے خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ مہمانانِ گرامی نے پروگرام کو بہت پسند کیا اور آئندہ ایسے پروگرام کرنے کے لئے درخواست بھی کی۔ پروگرام کے آخر میں مہمانوں کی گرم گرم بریانی سے تواضع کی گئی۔

مرشدِ کریم نے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

اَعُوذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمo

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَo اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ط اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُo اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَo صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَ لَاالضَّآلِّیْنَo

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ صَلُّوْ عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْ تَسْلِیْماً. سُبْحٰنَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَ سَلٰمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ. کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ

حَمِیْدٌ مَّجِیْد. اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ. کَمَا بَرَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْد.

آیئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے وہ کچھ کہنے کی توفیق عطا فرمائے جو آپ کے دلوں میں اتر جائے۔

رسول ﷺ کی نسبت سے میرے الفاظ میں اللہ وہ نور بھر دے جس نور سے ظلمتیں دور ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ جو کچھ میں عرض کروں مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

اسلام علیکم!

آج کی اس روحانی، نورانی اور ماورائی مجلس میں آپ لوگوں نے مقررین کی تقریریں سنیں۔ بہت کچھ آپ نے سیکھا۔ بہت زیادہ معلومات کا اضافہ ہوا۔ کافی حد تک علم کی تشنگی دور ہوئی۔ لیکن... یہ جو عنوان ہے، ''اسوۂ حسنہ سے معاشرے میں اصلاح'' کا، یہ اتنا بڑا عنوان ہے کہ اس پر اب تک لاکھوں کتابیں، کروڑوں صفحات لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن علم کی پیاس بجھنے کی بجائے اور بھڑک رہی ہے۔

بات یہ ہے کہ ''یہاں جو کچھ ہے وہ اللہ ہے۔''

کائنات میں.. اگر ہم، کائنات کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں تو ایک ہی بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ مخلوقات کے مجموعے کا نام کائنات ہے۔ اور مخلوقات کتنی ہیں؟

اس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

''تمہارے سارے سمندر روشنائی بن جائیں، سارے درخت قلم بن جائیں۔ درخت بھی ختم ہو جائیں گے، سمندر بھی سوکھ جائیں گے لیکن اللہ کی باتیں پھر بھی باقی رہیں گی۔''

رسول اللہ ﷺ اللہ کے محبوب ہیں، باعثِ تخلیق کائنات ہیں۔ کائنات کا پہلا نور ہیں، جیسے ارشاد پاک ہے، ''اول ماخلق نوری''۔ یعنی ایسی ہستی کا تذکرہ جو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ہے۔ یعنی

اللہ کے بعد۔ اگر کوئی ہستی ہے تو وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔

تو ان کا جتنا بھی تذکرہ کیا جائے، دفاتر کے دفاتر لکھ دیئے جائیں، علم کی پیاس نہیں بجھتی۔ بلکہ اور تشنگی بڑھے گی۔

پندرہ سو سال سے رسول ﷺ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ لیکن جب ہم، رسول ﷺ کے اس ارشاد، اول

ماخلق نوری پر غور کرتے ہیں تو بھائی ...... یہ تو تذکرہ کائنات سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہو رہا ہے۔

ابھی کائنات تخلیق بھی نہیں ہوئی۔ اللہ ہی اللہ ہے۔ اللہ نے رسول ﷺ کے نور کو تخلیق کیا۔ اس نور سے پھر ساری کائنات بنی۔ اسی لئے باعثِ تخلیق کائنات ......رسول ﷺ کو کہا جاتا ہے۔

سب نے ایک ہی بات کہی ہے جو میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ ''اسوۂ حسنہ ہے کیا؟'' ......عمل تو بعد میں ہوگا۔ پہلے یہ تو علم ہونا چاہیئے کہ اُسوۂ حسنہ کیا ہے اور جب اس کا علم ہو جائے تو پھر عمل کرنے میں آسانی ہوگی۔

حضور پاک ﷺ کی زندگی، کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ کے حوالے سے بھی آپ نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ تاریخ ساز شخصیت ہیں بلکہ مکمل ایک تاریخ ہیں۔ انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علوم بھی ایک تاریخ ہیں۔ آسمانی صحیفے اور آسمانی کتابیں بھی تاریخ ہیں۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام قرآن پاک کا عملی نمونہ ہیں۔ تو یہ سب کچھ آپ نے سن لیا ہے۔ مختصر یہی ہے کہ،

''جو کچھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا، اس پر عمل کیا جائے اور جو کچھ حضور پاک ﷺ نے نہیں کیا، کوشش کر کے ان باتوں کو ترک کر دیا جائے۔''

یہی بات ہے جو آپ کے سمجھنے کی ہے۔

اسوۂ حسنہ سے معاشرے میں رہنمائی کب ہوگی؟ دو باتیں اس میں میرے خیال میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ معاشرہ ہو اور ایک یہ کہ معاشرے کو روشنی دکھانے والا کوئی ہو۔

پہلے تو یہ بات سمجھنے کی ہے کہ معاشرے کی تشکیل کب ہوئی؟ یہ معاشرہ بنا کب؟ معاشرے کی بنیاد کو اگر دیکھا جائے تو ......ہمیں معاشرے کی بنیاد کا علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تخلیق کیا اور اس لئے تخلیق کیا کہ،

زمین میں ایک معاشرہ قائم کر کے، اس معاشرے کو چلانے کے لئے، انتظامی امور قائم کرنے کے لئے، مقصدِ حیات کا تعین کرنے کے لئے، کوئی ہستی پیدا ہو......تو ...... اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا اور علم الاسماء سکھایا۔

فرشتوں نے کہا کہ صاحب یہ تو بہت خون خرابا کرے گا۔ فساد برپا کرے گا۔

اللہ نے ان کو کہا کہ بھئی جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے ۔ پھر آدمؑ کو علم الاسماء سکھایا اور سکھا کر آدمؑ سے فرمایا کہ ہم نے جو علم تمہیں سکھا دیا ہے اسے فرشتوں کے سامنے بیان کرو۔ فرشتوں کے سامنے جب آدمؑ نے ان علوم کو بیان کیا تو فرشتوں نے اس بات کا اعتراف کیا۔

قالو سبحنک لا علمه لنا الا ماعلمنا انک انت العلیم الحکیمo

کہ باری تعالیٰ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں علم سکھا دیا۔

مسجودِ ملائکہ کے بعد دوسرا حصہ یہ بنا کہ،

و قلنایآ دمَ اسکن انت و زوجک الجنهo

اے آدم تو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ لیکن ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دو شرطیں رکھ دیں۔ جنت میں رہنے کی ایک شرط تو یہ ہے کہ تم نے وہاں خوش ہو کر رہنا ہے۔

اور دوسری شرط یہ ہے کہ، یعنی تم نے اس درخت کے قریب نہیں جانا۔ آدم علیہ السلام جنت میں رہتے رہے۔ کتنے سال رہے، کتنے قرن رہے، کتنی صدیاں وہاں گذاریں..... اس کے بارے میں ہمیں کچھ پتہ نہیں لیکن وہاں وہ رہتے رہے۔

آپ کو پتہ ہے کہ شیطان نے سجدہ نہیں کیا تھا۔ شیطان نے آدم علیہ السلام اور اماں حوا کو بہکا دیا اور نتیجے میں انہیں جنت سے باہر نکلنا پڑا۔

پہلی صورت اس کی یہ ہوئی کہ جنت میں جب آدمؑ ...... اس درخت کے قریب گئے ......شیطان کے بہکانے سے تو انہوں نے اپنے آپ کو ننگا محسوس کیا۔ بغیر کپڑوں کے محسوس کیا۔ ستر پوشی کی ضرورت پیش آئی۔

ایک بات میں عرض کروں کہ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس کو یاد رکھیئے گا۔ اس لئے کہ یہ پھر ایک دوسرے کے، ایک دوسرے سے ایسے ڈانڈے ملیں گے جیسے چٹائی بنتی ہے ناں ایسے بنائی ہوگی۔

تو پہلی بات تو یہ کہ آدمؑ سے غلطی ہوئی۔ وہ غلطی سہواً ہوئی تو آدمؑ نے خود کو عریاں محسوس کیا اور ستر پوشی کی ضرورت پیش آئی اور کیلے کے پتے جو ہیں ان کا لباس بنا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ آدمؑ کو حکم دیا گیا کہ اب تم جنت سے نکل جاؤ۔

وقلنا اهبطو منها جمیعاo

"اب تم سب کے سب اتر جاؤ۔ اب تم جنت میں نہیں رہ سکتے۔"

آدمؑ حسرت و یاس سے، روتے دھوتے، پریشان حال، اس دنیا میں آ گئے۔ یہاں کھانے پینے کی پریشانی لاحق ہوئی۔ جنت میں تو یہ تھا کہ جس چیز کو دل چاہا وہ موجود ہوگئی۔ اچھا وہاں کوئی ٹائم اسپیس کا بھی مسئلہ نہیں تھا۔

قرآن کہتا ہے، "رغدا حیث شئتما"

آسمانی اسپیس کی پابندی کے بغیر..... جنت میں سے جہاں سے دل چاہے کھاؤ یعنی اسپیس ہی نہیں ہے۔ جہاں سے دل چاہے...... . . .

اب جنت کوئی ایک ہزار، دو ہزار میل کا رقبہ تھوڑی ہوگا۔ وہ تو لاکھوں کروڑوں میل کا رقبہ ہوگا۔ اس کی تو ہمارے پاس کوئی (Figure)، بھی نہیں ہوگی۔

جب آدمؑ جنت سے زمین پر آئے تو سب سے پہلے یہ مجبوری لاحق ہوئی کہ اسپیس کی پابندی انہوں نے محسوس کی۔ دوسری صورت... کھانے پینے کی محتاجی ہوگئی۔

اب بھوک لگی۔ بھوک میں راہنمائی کی اللہ نے تو انہوں نے جڑیں کھانی شروع کر دیں۔ پتے کھانے شروع کر دیئے، پھل کھانے شروع کر دیئے۔

اماں حوا اور ابا آدم دونوں ۔ ایک عجیب پریشانی کے حال میں اس دنیا میں رہتے رہے۔ پھر ان کی اولاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ دو سے چار ہوئے، چار سے آٹھ ہوئے آٹھ سے سولہ ہوئے اور اضافہ ہوتا رہا۔

ہابیل قابیل بھی پیدا ہوئے پھر ان کی اولادیں بھی پیدا ہوئیں۔ جیسے جیسے حضرت آدمؑ کی اولاد میں اضافہ ہوا تو اولاد کے لئے گھر کی ضرورت پیش آئی۔ اولاد کے لئے محنت مزدوری کی بھی ضرورت پیش آئی ۔ تو پھر ......قانون وضع ہوا۔

"کہ رہن سہن کس طرح ہو؟"

یہ معاشرے کی پہلی بنیاد پڑی ۔ یعنی معاشرے کی ابتداء کرنے والی ہستی حضرت آدمؑ پیغمبر ہیں۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

ارتقا عمل میں آیا۔ پھلوں اور پتوں سے نکل کر کاشت کی طرف رجحان پیدا ہوا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالٰی کی جو نعمتیں جنت میں تمہیں حاصل تھیں، ان نعمتوں کی نقل تو تمہیں یہاں ملے گی۔ جیسے انگور وہاں تھا یہاں بھی ملے گا۔ کیلا وہاں تھا کیلا یہاں بھی ہوگا۔ لیکن . . . وہاں

یعنی جنت میں ارادے کے ساتھ انگور پلیٹ میں رکھ کر آپ کے سامنے آجاتے تھے یہاں ارادے سے کام نہیں چلے گا۔

یہاں پہلے زمین میں انگور کی بیل کاشت کرنی ہوگی انتظار کرنا ہوگا... اس کی خدمت کرنی ہوگی...... پھر انگور لگے گا...... پھر کھالو۔

گندم آپ کو بونی ہوگی۔ بولے! بھائی کس طرح گندم بوئیں؟ کیا کریں گندم؟

تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام کو ساتھ لیا اور ایک کھیت بنایا۔ پیچھے پیچھے حضرت آدمؑ تھے آگے آگے حضرت جبرائیلؑ تھے۔ سو قدم اِدھر، سو قدم اُدھر ایک کھیت بنایا۔ جب کھیت بن گیا تو آدمؑ نے دو قدم آگے بڑھ کے یہ کہا کہ یہاں حد بنا دو۔ جب دو قدم حضرت آدمؑ آگے بڑھے تو حضرت جبرائیلؑ نے افسوس کا اظہار کیا اور یہ کہا۔ کہ آپ نے اپنی اولاد میں لالچ کا بیج بو دیا ہے نادانستہ طور پر۔ آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اس زمین میں تو آپ کے علاوہ کوئی ہے ہی نہیں ۔ ساری زمین ہی اپنی ہے۔ بہر حال ...... وہ کھیتی باڑی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اب مسئلہ یہ ہوا کہ کتنے کھیت ہوں، پانی کہاں سے آئے، نہر کس طرح سے بنے کہ یہ ایک دوسرے کی کھیتی میں، ایک دوسرے کا تصرف نہ ہو، دوسرے کا حق نہ مارا جائے۔ آہستہ آہستہ یہ قوانین بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی نوعِ انسانی کے معاشرے کے لئے شریعت کی شکل میں قوانین عطا کر دیئے۔

☆ کہ کوئی کسی کا مال ناحق نہیں کھائے گا،

☆ کوئی کسی کی چوری نہیں کرے گا،

☆ کوئی کسی کے حق پر غاصبانہ قبضہ نہیں کرے گا،

☆ کوئی آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہیں کرے گا، وغیرہ وغیرہ ......

یہ معاشرے کی تشکیل شروع ہوگئی۔ پھر حضرت آدمؑ کے بعد مسلسل .....نوعِ انسانی میں سے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے۔ اور ان پیغمبروں نے بھی اصلاحِ معاشرہ کے لئے قوانین وضع کئے۔ جب ان قوانین میں .... کوئی سقم پیدا ہوگیا، کوئی خرابی پیدا ہوگئی، لوگوں نے مصلحتیں شامل کر دیں تو نئے پیغمبر آئے اور انہوں نے اس میں جو نقص واقع ہوگیا تھا، اسے دور کیا۔ یہ بتاتے ہیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس معاشرے کی تشکیل میں مصروف رہے۔

بالآخر سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے آئے۔

لیکن ساتھ ساتھ یہ بات بھی آپ ذہن میں رکھیے گا کہ جتنے بھی پیغمبران علیہم السلام تشریف لائے، سب نے رسول ﷺ کے آنے کی پیش گوئی کی۔ کہ ایک نجات دھندہ آئے گا، ایک نجات دھندہ آئے گا۔

جس وقت حضور پاک ﷺ تشریف لائے، اس وقت یہودی شریعت اور عیسائی شریعت نافذ تھی اور اس میں بہت ساری برائیاں داخل ہوگئیں تھیں۔ رسول ﷺ نے ان سارے قواعد وضوابط کو دیکھتے ہوئے اس میں اصلاح فرمائی اور اللہ کے حکم سے ہمیں ایک نظام دیا کہ ...

''ہمیں کس طرح رہنا ہے، کس طرح زندگی گذارنی ہے، اس کا نام شریعت ہوگا۔''

لیکن ... ساتھ ساتھ تمام پیغمبروں کی تعلیمات میں ہمیں یہ بات بھی نظر آتی ہے کہ ہر پیغمبرؑ نے دو دنیاؤں کا تذکرہ کیا۔ ایک دنیا کا ... موجودہ دنیا کا اور ایک آخرت کا۔

کہ جو کچھ تم اس دنیا میں کرو گے، ان اعمال کے نتیجے میں تمہیں جزا ملے گی اور ان اعمال ہی کی وجہ سے تم سزا کے بھی مستحق ٹھہرائے جاؤ گے......

ساتھ ساتھ...... ہر پیغمبرؑ نے موت وحیات کا تذکرہ کیا۔

کہ اللہ وہ ذات اقدس ہے جو موت سے زندگی نکالتا اور زندگی کو موت میں داخل کر دیتا ہے۔ یعنی یہ بتایا گیا کہ یہ واحد دنیا نہیں ہے جو تم یہاں آگئے اور وہاں ختم ہوگئے۔ ابھی ... سفر جاری ہے۔ دنیا ایک مسافر خانہ ہے اور اس مسافر خانہ میں رہنے کے کچھ قواعد وضوابط ہیں۔ ان قواعد وضوابط پر عمل ہوگا تو تمہاری یہ دنیا بھی صحیح رہے گی اور تمہیں...... آخرت میں بھی اس کی جزا ملے گی اور تمہاری آخرت کی زندگی بھی صحیح ہو جائے گی۔

ساتھ ساتھ ... تمام پیغمبران علیہم السلام نے یہ درس دیا کہ......

''انسان ایک نہیں دو ہیں''

انسان کسی ایک رخ کا نام نہیں ہے۔ انسان دو رخوں کا نام ہے۔

''انسانی زندگی کا ایک رخ جسمانی وجود ہے اور انسانی زندگی کا دوسرا رخ روح ہے۔''

روح جب تک اس جسم کو اپنے لئے سنبھال کر رکھتی ہے، جسم میں حرکت رہتی ہے۔ اور روح جب...... اس زندگی سے رشتہ توڑ لیتی ہے تو جسمانی وجود مٹی بن جاتا ہے...... خاک کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے...... کوئی

حیثیت اس کی ......باقی نہیں رہتی۔

اللہ تعالیٰ نے ......قرآن پاک میں جنت کی زندگی اور دنیا کی زندگی کو بھی بیان کیا ہے۔ جنت میں لوگ خوش رہے گے، پرسکون رہیں گے۔ جنت میں لوگوں کو ...... کوئی غم پریشانی نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ،

''جب کوئی انسان بھی غم اور پریشانی میں مبتلا ہوگا......تو جنت سے اس کا رشتہ......ٹوٹ جائے گا۔''

وکلا منھا رغداً حیث شیتمار ولد تقربا ھذہ الشجرۃ فتکو نامن الظلمین○

''اور جہاں سے دل چاہے خوش ہو کر کھاؤ، اور اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔''

تو، ظلم کرنے والا آدمی کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔

قرآن نے ...... رسول ﷺ کی زبانی ہمیں ...... انسانی شخصیت کے......دو روپ ...... دو رخ سے متعارف کرایا۔ ایک رخ...... روح ہے اور...... ایک رخ...... مادی جسم۔

جسم کب حرکت کرتا ہے؟ ......جب روح......حرکت کرتی ہے۔

اگر روح جسم کو چھوڑ دے......تو جسم حرکت کر سکتا ہے؟

اگر کسی ماں کے اندر سے ...... روح نکل جائے......تو وہ بچہ پیدا کر سکتی ہے؟

اگر کسی مرد کے اندر سے ......روح نکل جائے......تو کیا وہ شادی کر سکتا ہے؟

اگر کسی تندرست پہلوان کے اندر سے......روح نکل جائے...... تو وہ کشتی لڑ سکتا ہے؟

اگر کسی ٹیچر کے اندر سے روح نکل جائے...... تو وہ...... طلباء کو پڑھا سکتا ہے؟

اگر کسی سائنٹسٹ کے اندر سے ...... روح نکل جائے......تو وہ ایٹم بم بنا سکتا ہے؟ میزائل بنا سکتا ہے؟

اگر کسی مملکت کے صدر کی ...... روح نکل جائے ......تو وہ ملک کو سنبھال سکتا ہے؟

اگر کسی فوجی کے اندر سے......روح نکل جائے......تو وہ بندوق چلا سکتا ہے؟

اگر کسی بھوکے آدمی کے اندر سے ......روح نکل جائے ......تو وہ روٹی کھا سکتا ہے؟

ایک پیاسا آدمی مر گیا......روح نکل گئی...... آپ اس کے حلق کے اندر ......کسی بھی صورت سے ......پانی کے دس قطرے انڈیل سکتے ہیں؟

آپ کسی مردہ آدمی کے منہ میں پانی ڈالیے...... پانی باہر نکل جائے گا۔

کسی مردہ آدمی کو چلتے پھرتے ... دیکھا ہے کبھی؟

تو کیا مطلب ہوا، اس کا؟

یہ جو پیغمبران علیہم السلام نے جسمانی دو رخ متعارف کروائے ہیں... بھئی ان دو رخوں میں ... اصلی رخ کون سا ہے؟

اصلی رخ... روح ہے؟

اگر اصلی رخ ... روح ہے تو پھر ... جسم کیا ہوا؟

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے، اپنی کتاب، ''لوح وقلم'' میں اس کی مثال اس طرح بیان فرمائی ہے کہ تم جسم پر ایک لباس پہنتے ہو، قمیض شلوار، کوٹ پتلون، کوئی بھی ...... اس کا نام رکھ لیں۔ اگر آپ اس جسم کو ہلائیں گے تو...... لباس ہلے گا۔ لیکن اگر اس جسم کے اوپر سے ... لباس اتار کر ...... آپ کھونٹی پر لٹکا دیں، چارپائی پر لٹا دیں، فرش پر رکھ دیں... ..

اس میں حرکت ہوگی؟......

کیوں نہیں ہوگی حرکت؟......

حرکت لئے نہیں ہوگی کہ اس لباس کی حرکت ...... تابع ہے ...... جسم کے۔

جب روح جسم کو چھوڑ دیتی ہے تو اس جسم کی حیثیت ...... ایک لباس کی ہوجاتی ہے۔ جب تک روح جسم کے اندر ہے۔ اور جب تک جسم کے اوپر لباس ہے ...... اس میں حرکت ہے۔ اس جسم کے اوپر لباس میں، جب میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ ہلاؤں گا تو ...... آستین بھی ہلے گی۔

تو ...... جتنے بھی مذاہب آئے،

جتنے بھی صحیفے نازل ہوئے،

جتنی بھی آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں اور آخری کتاب قرآن کریم میں،

انسانی زندگی کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ......

انسان کو اس لئے تخلیق کیا گیا ہے...... اس کا مقصد یہ ہے کہ......

''وہ اللہ کو ... اور ...... اپنے خالق کو ...... پہچان لے۔''

آپ کب پہچانیں گے؟.....

مطلب یہ کہ میں آپ کو پہچانوں .. اور..... آپ مجھے پہچان لیں۔

میرے اندر سے روح نکل گئی .. تو میں .. آپ کو پہچانوں گا؟.....

کیوں بھئی؟ ...

غور کرو ذرا؟......

اب میں بیٹھا ہوا ہوں، اگر ......میرے اندر سے روح نکل جائے.....اگر مردہ ہو جاؤں......آپ کو... پہچان لوں گا .. ؟

تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہچاننے کا وصف ......جسم انسانی کا نہیں ہے۔ پہچاننے کا وصف جو ہے... وہ روح کا ہے۔ اور روح کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرما چکے ہیں۔

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ،

"میں تمہارا رب ہوں"

اب، روحوں نے کہا،

قَالُوْا بَلٰی،

"جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں۔"

اس کا کیا مطلب ہوا..... ؟

اس کا صرف مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا، "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" تو... روحوں نے اللہ کو دیکھا...... اللہ کو پہچانا......اور اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔

یہاں بھی وہی صورتحال ہے۔

پھر آپ آ جایئے ...."پہچاننا کب ممکن ہے؟"

کب ممکن ہے بھئی .....؟

ہاں! جب روح اندر ہو۔

پڑھنا......کب ممکن ہے؟ ..... جب روح اندر ہو۔

پڑھانا..... کب ممکن ہے؟... جب روح اندر ہو۔

شامی صاحب! اخبار نکالنا کب ممکن ہے؟

شامی صاحب نے جواب دیا، جب پیسے ہوں۔

بھئی ایک مردہ آدمی ہے، اس نے پیسے کا کیا کرنا ہے بھئی۔

بھئی! پیسہ بھی جب ہی کام آتا ہے، جب...... روح اندر موجود ہو۔

ایک آدمی کی ڈیڈ باڈی یہاں پڑی ہوئی ہے، اس پر لاکھ روپیہ رکھ دیں...... سینے پر...... اس کے کس کام کا؟

تو طے یہ ہوا کہ انسان کا جو مقصدِ حیات ہے، وہ یہ ہے کہ

''وہ اللہ کو پہچانے۔''

اور اللہ کو پہچاننا اس وقت ممکن ہے جب انسان اپنی اصل یعنی روح سے واقف ہو۔

اب ایک معاشرہ ہے۔ اس میں ہزار آدمی ہیں۔ ہزار آدمی مرجائیں تو...... وہاں کیا معاشرہ ہوگا؟

بھئی کیا ہوگا وہاں؟......

کوئی دکان کھلے گی؟......

بھئی سارے مردے پڑے ہوئے ہیں، خریدار ہے ہی نہیں کوئی۔

دکان کھلے گی؟

بازار بنیں گے؟

اولیاء اللہ کی تعلیمات اور انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے

وَمَا خَلَقْنَا الْجِنَّ وَالاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَo

یعنی اس لئے پیدا کیا ہے کہ

وہ اللہ کو پہچانے، اپنے خالق کو پہچانے،

اور، خالق کو پہچاننا اس وقت ممکن ہے جب،

آدمی اپنی اصل یعنی روح کو پہچانے۔

جتنے بھی پیغمبرؑ تشریف لائے، سب کی تعلیمات کا نچوڑ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اُسوۂ حسنہ ہے۔

اُسوۂ حسنہ کیا ہے؟

اُسوۂ حسنہ کی تعریف کیا ہے؟

أسوۂ حسنہ کی تعریف یہ ہے کہ

''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا کہ جو اللہ سے وابستہ نہ ہو۔''

''حضور پاک ﷺ ہر چیز کو (Care of Allah) اللہ کی معرفت سمجھتے تھے۔''

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ

''میرا جینا، میرا مرنا، میرا سونا، میرا جاگنا، میرا اٹھنا، میرا بیٹھنا، میرا کھانا، میرا پینا اور میرا لڑنا، سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے۔''

اور قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

والراسخون فی العلم یقولون اما به کل من عند ربنا

کہ جب علم حاصل ہو جاتا ہے ..... انسان کو..... تو اس کے مشاہدے میں یہ بات آجاتی ہے کہ،

''ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔''

آپ سب کہتے ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔......بھئی سب کا یقین ہے اس بات پہ ناں؟

یقین ہے ناں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اگر دو بندے آپ کو دیکھ رہے ہوں تو آپ گناہ کریں گے؟

..... کیوں بھئی ..... چوری کریں گے اگر دو بندے آپ کو دیکھ رہے ہو؟

خاموش کیوں ہو گئے۔ کرو گے کہ نہیں؟ .. نہیں .. کیوں نہیں کرو گے؟

......کیونکہ ... دو آدمی آپ کو دیکھ رہے ہیں یا ایک آدمی دیکھ رہا ہے۔

اور اللہ دیکھ رہا ہے.....آپ سب کچھ کر رہے ہیں۔

یہ جو ہے، اس سے بڑا سفید جھوٹ ہو سکتا ہے کوئی کہ

اللہ دیکھ رہا ہے اور ہم قتل کر رہے ہیں......

اللہ دیکھ رہا ہے اور ہم چیزوں میں ملاوٹ کر رہے ہیں . . .

اللہ دیکھ رہا ہے اور ہم سمگلنگ کر رہے ہیں

اللہ دیکھ رہا ہے اور ہم اپنے بھائی کے حق کو غصب کر رہے ہیں . . .

تو اس کا مطلب کہ یہ کہنا کہ ..... اللہ دیکھ رہا ہے ......زبان کا کہنا ہے، روح کا کہنا نہیں ہے۔ روح سے جب کوئی آدمی واقف ہو جاتا ہے تو وہ ..... یہ دیکھتا ہے ... کہ، اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اور جب تک وہ روح سے

واقف نہیں ہوتا..... وہ صرف زبان سے کہتا ہے..... کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

جب انسان، جسمانی وجود میں ہوتا ہے..... دنیاوی علوم میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔

اقرار بِاللّسان ہوتا ہے، خالی زبان سے بات کرتا ہے.....اور جب کوئی انسان ..... اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے تو..... تصدیق بالقلب ہو جاتا ہے۔

اقرار بِاللّسان و تصدیق بالقلب۔

اُسوۂ حسنہ سے اُسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب ..... رسول ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں آپ کو اپنی نقل کا.....اور اپنی ..... اصل کا امتیاز ہو۔

کام سارے روح کر رہی ہے اور ہم کہہ رہے ہیں کہ ہم جسمانی کام کر رہے ہیں۔ یہ تو بھئی .....سارا (ILLUSION) ہو گیا..... دھوکا ہے..... فریب ہے۔

اُسوۂ حسنہ یا اُسوۂ محمدی ﷺ سے، اس وقت مسلمان قوم فائدہ اٹھا سکتی ہے جب وہ .....اس بات کی تمیز کرے گی کہ،

روح کیا ہے؟ اور..... جسم کیا ہے؟

جسم محض خاک ہے، مٹی ہے اور ..... اصل انسان جو ہے .....اس کی روح ہے۔ یہ مثالیں میں نے آپ کے سامنے پیش کیں۔

بلاشبہ یہ ساری دنیا ایک بہت بڑا کمرۂ امتحان ہے ..... مسافر خانہ ہے۔ جب تک کوئی انسان اپنی روح سے واقف نہیں ہوگا.....اس کو کچھ پتہ نہیں کہ کیا کچھ ہے یہاں۔ اور آپ کہتے ہیں، ''روح کس طرح اللہ کو دیکھے؟'' ''کس طرح اللہ سے ملے؟''

جب اللہ نے خود فرمایا، ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' ترجمہ: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں.....تو .....روحوں نے جواب دیا، ''قالو بلی'' ترجمہ: جی ہاں! آپ ہمارے رب ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا ہے کہ،

مجھے روحوں نے دیکھا ..... اقرار کیا.....

اولیائے کرام کی تعلیمات ..... انبیائے کرامؑ کی تعلیمات ہیں۔

اولیاء اللہ ..... وارث انبیاءؑ ہیں۔ اولیاء اللہ کی طرز فکر ..... نبیوں کی طرز فکر ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ کی طرز

زندگی ......رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے . ...اگر تابع نہ ہو تو اس کو ولی نہیں کہتے .... وہ ولی نہیں ہے۔

سیرتِ طیبہ ﷺ کا مطالعہ کرو۔ اگر ...... سیرتِ طیبہ کے مطابق ...... کسی درویش کی زندگی ہے تو آپ اسے ولی کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ...... نہیں کہہ سکتے۔ اور،

نبی مکرم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کیا ہے؟ Care of Allah سوچنا۔

یعنی ہر چیز اللہ کی معرفت سے ہے......"یقولون امنًا به كل من عند ربنا."

ہر شے...... اچھائی، برائی...... بیماری، صحت ...... سب اللہ کی طرف سے ہے۔

پھر اب آپ کہیں گے کہ جب برائی اللہ کی طرف سے ہے تو گناہ کیسا؟

گناہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح میں یہ وصف ڈال دیا ہے ..... کہ اس کو اچھائی اور برائی کی تمیز عطا کر دی ہے۔

اچھائی ، برائی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے...... کیا شیطان کو اللہ نے پیدا نہیں کیا...... کیا شداد، فرعون، نمرود کو اللہ نے پیدا نہیں کیا......؟ ان کا خالق کوئی اور ہے......؟

سب کو اللہ نے پیدا کیا......لیکن اللہ نے دو رخ اس لئے متعین کئے ...... تا کہ .... انسان کا اختیار زیرِ بحث آسکے۔ انسان اچھائی کو اختیار کرے...... اور برائی کو ترک کر دے۔

انبیاءؑ کی تعلیمات پر اگر آپ غور فرمائیں گے تو اس میں ...... بنیادی بات آپ کو یہ ملے گی کہ انبیاء کرامؑ نے اچھائی اور برائی کا تصور پیش کیا ہے کہ......

اچھے کام کرنے سے اللہ خوش ہوگا ..... تمہیں جنت میں لے جائے گا۔

برے کام کرنے سے اللہ ناخوش ہوگا... اور . . . جنت سے محرومی مقدر بن جائے گی۔ تو اگر برائی نہ ہو تو ...... اچھائی اور برائی میں ...... امتیاز کیسے ہوگا؟

اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنی بھلائی کے لئے وہ راستہ اختیار کرے **اهدنا الصراط المستقيم** والا راستہ اختیار کریں جو...... انبیاء کرامؑ نے راستہ اختیار کیا ہے۔

انسان وہ زندگی گزارے جو نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زندگی گزاری۔

اگر ...... نبی مکرم ﷺ کی زندگی میں عفوودرگزر ہے۔ تو .. انسان کے اندر بھی ......عفوودرگزر ہونا چاہیے۔

اگر انسان کے اندر، مسلمان کے اندر عفوودرگزر نہیں ہے تو وہ . . حضور ﷺ کا امتی کہلانے کا مستحق کس طرح ہو سکتا

ہے۔

"اُسوۂ حسنہ یہ ہے کہ رسول ﷺ کی طرز فکر آپ کو حاصل ہو۔"

اب رسول اللہ ﷺ کی طرز فکر کے بارے میں دو باتیں ہمارے سامنے ہیں۔

ایک طرز فکر...... رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے پہلے کی زندگی کی ہے۔لیکن...... نبوت سے پہلے کی، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی کہیں آپ کو...... جھوٹ نہیں ملے گا، کہیں کھوٹ نہیں ملے گا۔

نبوت کے بعد کی زندگی بھی یہی زندگی ہے۔ آپ دیکھیں...... کہ قریش مکہ نے جب کہا کہ آپ ﷺ ہمارے دین کو برا نہ کہو۔ اگر تو پیسہ چاہتے ہو تو لو...... یہ پیسہ لے لو۔ بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تمہیں بادشاہ بنا دیں گے۔ کہیں شادی کرنا چاہتے ہو...... تو شادی کر دیں گے۔

تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں...... میرے ذمے اللہ کا پیغام ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے...... اس کے بغیر ...... کسی کی پرستش نہیں کی جا سکتی۔ میرے ایک ہاتھ پہ چاند اور ایک ہاتھ پہ سورج رکھ دو، میرا، ایک ہی پیغام ہے۔

"اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ اس کے بغیر کسی کی پرستش نہیں ہو سکتی۔"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس پر قائم رہے۔

قرآن کریم کی جتنی آیتیں معاشرے کے متعلق ہیں...... جب آپ...... ان کو پڑھیں گے تو وہ...... بڑی آسانی سے...... حضور ﷺ کی زندگی میں...... آپ کو...... نظر آ جائیں گی۔ لیکن......

پہلے یہ طے کرنا ہے کہ...... اُسوۂ حسنہ کیا ہے؟ پھر......

اس اُسوۂ حسنہ کو معاشرے میں رائج کرنا ہے۔

اُسوۂ حسنہ یہ ہے کہ،

اللہ کے ساتھ براہِ راست ایک ربط، تعلق قائم ہونا چاہیئے۔

آپ کے ذہن میں یقین ہونا چاہیئے کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

یہ علم ہونا چاہیے کہ جہاں آپ چار ہیں وہاں پانچواں اللہ ہے۔

جہاں تم ایک ہو وہاں دوسرا اللہ ہے۔

آپ کے یقین میں یہ بات راسخ ہونی چاہیے کہ اللہ آپ کی رگِ جاں سے زیادہ قریب ہے۔

جو آپ کرتے ہیں...... وہ اللہ جانتا ہے۔

جو آپ چھپاتے ہیں...... وہ اللہ دیکھتا ہے۔

یہ سب قرآن ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، "وفی انفسکم افلا تبصرون"۔

میں تمہارے اندر ہوں...... تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں ہو۔

جو چیز اندر ہے، اسے آپ باہر ڈھونڈیں گے...... وہ آپ کو کیسے ملے گی۔

٥ آپ کے پاس ایک بہت قیمتی گھڑی ہے۔ آپ اسے کمرے میں صندوق کے اندر بند کر دیں۔ آپ سارے محلے میں ڈھونڈتے پھریں...... گھڑی ملے گی آپ کو؟......

کیوں نہیں ملے گی؟

جس جگہ گھڑی موجود ہے، وہ آپ وہاں تلاش نہیں کر رہے ہیں۔

اللہ کہاں ہے؟ "وفی انفسکم افلا تبصرون۔" میں تمہارے اندر ہوں...... تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں ہو۔

مجھے دیکھو میں تمہارے اندر ہوں۔

مجھے دیکھو میں تمہاری رگِ جاں سے زیادہ قریب ہوں۔

الا انه بکل شی محیط.٥

اللہ نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔

اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ علیم ہے۔ خبیر ہے۔ قدیر ہے۔ قادر مطلق ہے۔

جس کو چاہے پیدا کر دے...... جس کو چاہے مار دے۔ جس کو چاہے بادشاہ کر دے جس کو چاہے فقیر کر دے۔

وتعزمن تشاء وتذل من تشا ٥

یہ اسوۂ حسنہ ہے۔

رسول کریم ﷺ بدر میں تشریف لے گئے۔ تین سو تیرہ بندے ساتھ تھے۔ ہتھیار بھی نہیں تھے۔ ٹوٹی پھوٹی تلواریں تھیں اور گھوڑے بھی دو تھے۔ وہاں جا کے دعا کی۔

"اے اللہ جو میں لا سکتا تھا لے آیا ہوں...... اب مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔"

ایک ہزار فرشتے نازل ہو گئے۔

جب انسان اللہ سے واقف ہی نہیں ہے اور اللہ کو اس نے کروڑوں کروڑوں میل دور بٹھا دیا ہے۔ جیسے اب سورج کا فاصلہ نو کروڑ میل بتایا جاتا ہے...... پتا نہیں ہے کتنا...... سائنسدان بتاتے ہیں نو کروڑ میل۔

مثال کے طور پر سات آسمان، نو نو کروڑ میل کے مان لیں......عرش اور کرسی شامل کر کے یہ نو زون بنتے ہیں۔ تو اس حساب سے نعوذ باللہ، اللہ میاں اکیاسی کروڑ میل دور بیٹھے ہیں۔ اکیاسی کروڑ میل دور، آپ کی دعا کس طرح پہنچے گی اکیاسی کروڑ میل تو شائد میری بھی نہیں پہنچ سکتی۔

اندر ہے اللہ......اللہ اندر ہے۔

وفی انفسکم افلا تبصرون۝

اندر جھانکو......آپ کے اندر کیا ہے؟......آپ کا (Inner) کیا ہے؟

کس کو آپ (Inner) کہتے ہیں؟

(Inner) روح ہے۔

آپ کی روح آپ کے اندر ہے اور میری روح میرے اندر ہے۔

روح کی نظر سے اللہ نظر آتا ہے۔

جب تک روح کا چشمہ آنکھوں پر نہیں لگے گا۔ معاشرہ نہیں سدھرے گا۔ خراب ہوگا، اور خراب ہوگا۔ اور خراب ہوگا۔

قوموں کا عروج و زوال آپ کے سامنے ہے۔ جن قوموں نے جب اللہ کو نظر انداز کر دیا، پیغمبران علیہم السلام کی باتوں پر دھیان نہیں دیا ...... دیکھئے کیا حشر ہوا......تباہ ہوگئیں...... برباد ہوگئیں۔

آج مسلمان قوم کی زبوں حالی آپ کے سامنے ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم پر عذاب نہیں آئے گا۔ اس لئے نہیں آئے گا کہ رسول اللہ ﷺ رحمت العالمین ہیں......بھئی! حضور ﷺ کو رحمت المسلمین تو اللہ نے کہیں بھی نہیں کہا وہ تو ...... رحمت للعالمین ﷺ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ،

تفکر کرو۔

غور کرو۔

تلاش کرو۔

ہم نے نشانیاں بکھیردی ہیں۔تو نشانیوں میں یہ وصف ہے کہ جب آپ ان نشانیوں میں غور وفکر کرو گے تو یہ نشانیاں بولیں گی..... بولیں گی کہ ہمارے اندر یہ وصف ہے۔

اس لئے کہ یہاں پر ہر چیز بولتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم کی جو تھیوری سامنے آئی اور ایٹم بن گیا۔ یہ کب آیا؟

ایٹم کب بنا؟ کس طرح بنا؟

دماغ میں خیال آیا، لہریں ہوتی ہیں، ایٹم ہوتا ہے، ٹوٹ نہیں سکتا، برقی رو ہوتی ہے۔ جب اس پر غور کیا گیا تو ایٹم بولا..... ایٹم بولا کا کیا مطلب ہوا؟

کہ دماغ میں خیال آیا کہ میرے اندر اتنی انرجی ہے، اتنی طاقت ہے کہ اگر کسی طرح مجھے آپ تسخیر کرلیں تو میں ایک منٹ میں لاکھوں جانیں ضائع کرسکتا ہوں۔

خیال آنے کا کیا مطلب ہے؟

اب میں آپ سے بولتا ہوں۔

میں کس طرح بولتا ہوں۔ اگر میری آواز آپ کے کانوں میں جا کے آپ کے دماغ سے ٹکرائے اور اس کا مفہوم نہ دے تو آپ میری بات سمجھیں گے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ میری کوئی آواز سنتے ہیں ......تو میں آپ کے دماغ کے اندر گھس کر بول رہا ہوں۔

خیالات کا ایک نظام ہے اللہ کا...... انتقالِ خیال ہے سب۔ اور انتقالِ خیال کا مطلب ہے۔

ہر چیز بول رہی ہے۔

آدمی بھی بول رہا ہے۔ بکری بھی بول رہی ہے۔ ہاتھی بھی بول رہا ہے اور ..... جڑی بوٹیاں بھی بول رہی ہیں۔

ولقد اٰتینا لقمٰن الحکمۃ ان اشکر للہ o

لقمان کو جب حکمت دی گئی تو جڑی بوٹیاں بولتی تھیں کہ میرے اندر یہ وصف ہے۔ میرے اندر یہ وصف ہے...... میرے اندر یہ وصف ہے۔

آج جتنی سائنس کی ایجادات ہیں، جس چیز میں بھی ایجاد ہو رہی ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ سائنسدان کو خیال آیا۔ اس خیال کی اس نے پیروی کی۔ اس لئے وہ ایجاد ہوئی۔ آپ یہ کیوں نہیں کہتے، یہ جو چیز ایجاد ہونے والی ہے... وہ خود کہہ رہی ہے کہ میرے اندر یہ خصوصیت ہے۔ اگر تم نے میرے اندر تفکر کیا، غور کیا ....تو میرا جب مظہر بنے گا تو میرے اندر یہ صلاحیت ہوگی۔

ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کر رہی ہے۔

ہر چیز بڑھ رہی ہے۔

ہر چیز پیدا ہو رہی ہے اور پیدا ہو کر بڑھ رہی ہے۔

ہر چیز گھٹ رہی ہے۔

ہر چیز مر رہی ہے۔

ہر چیز جوان ہو رہی ہے۔

کیا بھینس بوڑھی نہیں ہوتی؟ انسان ہی بوڑھا ہوتا ہے؟

کیا درخت بوڑھا نہیں ہوتا؟

کیا بکری بوڑھی نہیں ہوتی؟

ایک ہی نظام ہے ......لیکن .... اس نظام میں فعال رکن جو ہے وہ انسان ہے۔ ہر چیز اس کے لئے مسخر ہے۔

اور کیوں وہ فعال رکن ہے؟

کیوں حاکم ہے؟

کیوں حکمران ہے؟

کیوں ہر چیز اس کے لئے مسخر ہے؟

وسخر لکم مافی السموات ومافی الارض٥

کیوں مسخر ہیں؟......اس لئے مسخر ہیں کہ،

آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے علم الاسماء سکھا دیا ہے۔

اپنی صفات کا علم سکھا دیا ہے۔

جب انسان ان علوم کی طرف متوجہ ہوتا ہے.....تو اسے کیا کرنا ہوگا؟

کیا کرنا ہوگا بھئی؟......ہاں روح سے واقف ہونا پڑے گا۔

آدمؑ کو جب اللہ تعالیٰ نے علم الاسماء سکھائے......وہ ہمارا مادی وجود تھا یا روح تھی؟.....روح تھی۔

کیوں بھئی؟ ......ہاں ... وہ روح ہی تھی۔

جب آدمؑ جنت میں رہے تو وہاں .....آدمؑ کی روح تھی ......یا جسمانی لباس تھا؟

ہاں روح ہی تھی۔

بات اب پوری ہوگئی۔

اُسوۂ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم یہ ہے کہ،

''انسان اپنی اصل سے واقف ہو۔ جب انسان اپنی اصل سے واقف ہوگا تو اس کا اللہ سے ایک ربط قائم ہوگا۔ ایک تعلق قائم ہوگا۔ وہ

اللہ کو دیکھے گا......

اللہ کو جانے گا......

اللہ کی آواز سنے گا......

اللہ سے عرض ومعروضات پیش کرے گا......

معاشرہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔''

مختصر یہ ہے کہ اسوۂ حسنہ کی تعریف میری دانست میں یہ ہے کہ،

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم جو کچھ کرتے تھے ......جو کچھ فرماتے تھے، وہ .....اللہ کے چاہنے سے کرتے تھے اور......اللہ کے چاہنے سے فرماتے تھے۔''

جب ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اپنا لیں گے تو......ہماری بھی یہی حیثیت ہو گی کہ

ہم اللہ کو چاہیں گے......

اللہ کو دیکھیں گے......اور

اللہ سے ہمارا رابطہ اور تعلق قائم ہو جائے گا۔

آپ سب حضرات کا بہت بہت شکریہ۔

اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

السلام علیکم!

☆......☆......☆

ایوان اقبال میں مرشد کریم خطاب فرما رہے ہیں

ایوان اقبال حاضرین کا ایک منظر

ایوان اقبال لاہور میں حاضرین کا ایک منظر

مرشد کریم کی آمد پر میاں مشتاق احمد عظیمی ان کو بیج لگا رہے ہیں ساتھ ڈاکٹر وقار یوسف عظیمی اور طاہر رشید کھڑے ہیں
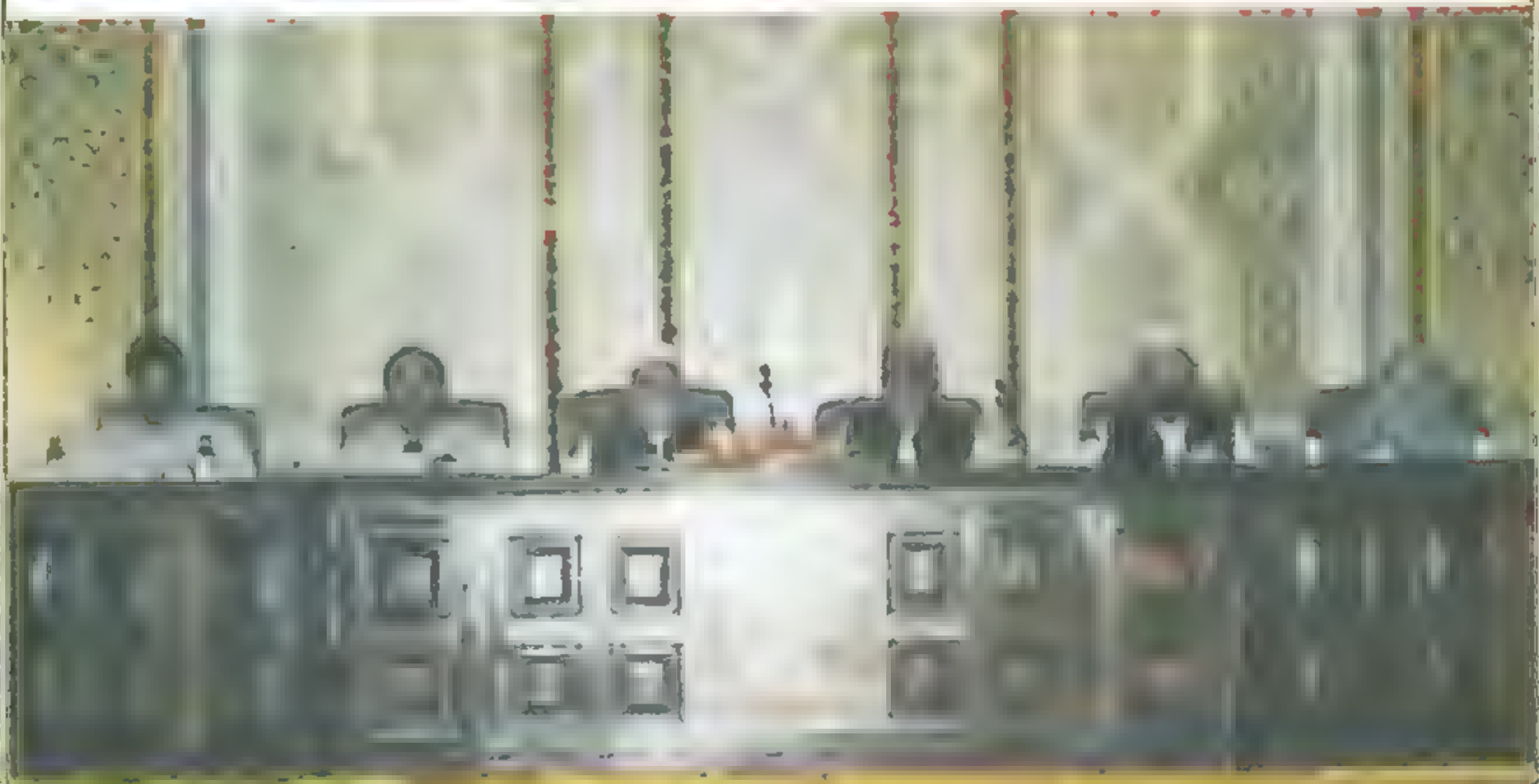
سیرتِ طیبہ پر ایوانِ اقبال میں خطاب

ربیع الاوّل کے مبارک مہینہ میں بمقام ایوان اقبال لاہور میں مراقبہ ہال لاہور کے زیرِاہتمام حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر مورخہ ۱۱ مارچ ۲۰۰۶ء کو ایک شاندار پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ سیرتِ طیبہ کے اس پروگرام میں پاکستان کی مختلف یونیورسٹیز کے پروفیسر صاحبان اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ تقریب میں مہمانانِ گرامی کی تعداد تقریباً ہزار افراد سے زائد تھی جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ میاں مشتاق احمد عظیمی صاحب نگران مراقبہ ہال لاہور نے اپنے ابتدائیہ کلمات میں مرشدِ کریم کی خدمات پر مختصر سا تعارف پیش کیا اور آنے والے تمام معزز مہمانانِ گرامی کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے اختتام پر مہمانانِ گرامی حضرات کی تواضع کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ پروگرام مرشدِ کریم حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی دعا کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

مرشدِ کریم نے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔

یہ جو مجلس منعقد کی گئی ہے، اس کے پیچھے سلسلہ عظیمیہ کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات، طرزِ فکر اور اخلاقِ حسنہ کا ذکر کیا جائے۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے نوعِ انسانی کو توحید کا سبق دیا ہے۔ اچھائی و برائی کے تصور کے ساتھ نیک اعمال کرنے کی ہدایت فرمائی، برے کام کرنے سے منع فرمایا۔ یہ کام اللہ کے انبیاء اور رسولوں کے ذریعہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک جاری رہا۔ اب نبوّت ختم ہو چکی ہے۔ اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے امتیوں اور خاص طور پر اہلِ علم کی ہے۔ جتنے اولیاء اللہ ہیں۔ یہ سارے حضرات دراصل اللہ کے پیغام کو پہنچانے والے وہ کارندے ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے عشق کیا، ان کی تعلیمات سیکھیں، ان پر عمل کیا اور رسول اللہ ﷺ کے مشن کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلہ میں ایک بزرگ حضور قلندر بابا اولیاءؒ تشریف لائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا۔ جنہیں سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فیض نصیب ہوا۔ قلندر بابا

اولیاءؒ نے بھی وہی کام کیا جو چودہ سو سال سے اس امت کے اولیاء اللہ کر رہے ہیں۔ ایک روحانی سلسلہ سلسلہ عظیمیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ سلسلہ عظیمیہ اسی طرح کا ایک سلسلہ ہے جس طرح قادریہ سلسلہ ہے، نقشبندیہ سلسلہ، چشتیہ سلسلہ، سہروردیہ سلسلہ، فردوسیہ سلسلہ اور بہت سارے دوسرے سلاسل ہیں۔ یہ جتنے بھی سلاسل ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ اللہ کے پیغام اور حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کو بار بار دہرایا جائے لوگوں کو یاد کرایا جائے کہ جب آدمی اچھا کام کرتا ہے تو اللہ کے قریب تر ہو جاتا ہے اور جب کوئی برا کام کرتا ہے تو شیطان کے قریب ہو جاتا ہے۔

آج اس نشست کا مقصد انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کے بارے میں آپ کے علم میں اضافہ کرنا ہے۔ انبیاء کرامؑ کی تعلیمات وہی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ہیں۔ انبیاء کرامؑ کی تعلیمات وہی ہیں جو قرآن و حدیث ہے، اچھے کام کرو، بُرے کاموں سے بچو، نماز قائم کرو، روزے رکھو، حج کرو، زکوٰۃ ادا کرو، کسی کا حق نہ مارو، کسی کی دل آزاری نہ کرو، غصہ نہ کرو، عفو درگزر سے کام لو، لوگوں کو معاف کر دو، لوگوں کی خدمت کرو، لوگوں کے کام آؤ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی کو معبود نہ جانو، اللہ ہی پیدا کرتا ہے اللہ ہی رزق فراہم کرتا ہے۔ اللہ کے پاس ہی ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کا یہ رخ بھی سامنے رکھنا چاہیئے کہ جب انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا تو بہت سے لوگوں نے انہیں جھٹلایا، کسی نے ان کو مجنوں کہا، کسی نے پتھر مارے انتہا یہ کہ بعض پیغمبروں کو تو لوگوں نے قتل تک کر دیا۔ اللہ کے پیغمبروں کو، ان مقدس ہستیوں کو کس جرم میں قتل کر دیا گیا؟

اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ کو ایک مانو، بتوں کو نہ پوجو وہ کہتے تھے دولت کی پرستش نہ کرو، انا کے خول سے باہر آجاؤ، غرور نہ کرو، تکبر نہ کرو، کس بات پر غرور کرتے ہو؟ تمہارے پاس کچھ تو ہو، آج مر جاؤ گے کچھ بھی ساتھ نہیں لے جاؤ گے۔ ایک دلچسپ مشاہدہ یہ ہے کہ مردہ اکڑتا ہے، زندہ شخص میں لچک ہوتی ہے، اب آپ دیکھئے جب آدمی مرجاتا ہے اس کے ہاتھ کو آپ سیدھا نہیں کر سکتے، آدمی جب مر جاتا ہے اس کی گردن اکڑ جاتی ہے، اس کی گردن کو آپ اِدھر اُدھر نہیں گھما سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر زندہ آدمی کے اندر بھی اکڑ موجود ہو تو کیا اس کی حیثیت مردہ جسم جیسی نہیں ہوگئی؟

جس آدمی کے اندر اکڑ نہیں ہے، جس آدمی کے اندر جھکنا ہے، عاجزی ہے، انکساری ہے، وہ زندہ ہے۔ مردہ آدمی کبھی جھکتا نہیں، مردہ آدمی کی جو اکڑی ہوئی گردن ہے اکڑی رہتی ہے وہ جھکتی نہیں ہے تو جو آدمی اس دنیا میں غرور تکبر میں مبتلا ہے، انا کے خول میں بند ہے غیر اسلامی روایات میں، تکبر اور اکڑ لئے ہوئے ہے، آپ یقین کریں وہ

آدمی مردہ کی طرح ہے۔

اللہ نے کبر کو منع فرمایا ہے، اللہ نے کسی کی غیبت کو منع فرمایا ہے، اللہ نے حق تلفی کو منع فرمایا ہے۔ فرمایا کہ دو گناہ معاف نہیں..... ایک شرک معاف نہیں اور ایک حق تلفی معاف نہیں۔ اس کا مطلب ہے یہاں جو بندہ کسی بندے کی حق تلفی کرتا ہے وہ شرک کے برابر گناہ کرتا ہے اور جو بندہ اپنے حقوق کی طرح دوسروں کے حقوق کی پاسداری کرتا ہے وہ اللہ کے نزدیک برگزیدہ بندہ ہے۔

الٰہی مشن کو پھیلانے میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے جو کچھ کیا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ حضور پاک ﷺ کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ کیا کچھ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں کیا، بائیکاٹ کر دیا، شعب ابی طالب میں حضور پاک ﷺ اور آپ ﷺ کے خاندان کو قید کر دیا۔ طائف میں اتنے پتھر مارے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیر خونم خون ہو گئے اور جوتے خون سے بھر گئے۔ مکہ سے ہجرت کر کے حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

وہ لوگ جن کے ذمہ یہ ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو آپ ﷺ کے مشن کو لوگوں تک پھیلائیں گے، آگے بڑھائیں گے، ان کے اندر یہ ساری خوبیاں ہونی چاہئیں، ان میں کبر نہیں ہونا چاہئے، انہیں کسی کی حق تلفی نہیں کرنی ہے جھوٹ نہیں بولنا، تکبر نہیں کرنا ہے، اللہ کو اپنا خالق و مالک، قادر مطلق سمجھنا ہے اور لوگوں کی خدمت کر کے خوش ہونا ہے۔

کسی مشن کی ترویج کے لئے کئی باتیں ضروری ہیں، ایک تو یہی بات ضروری ہے کہ آپ قرآن و حدیث کی رہنمائی میں اپنی تقریر کے ذریعہ لوگوں تک اپنی بات پہنچائیں، تقریر کے بعد سوال و جواب کے ذریعے لوگوں کی تسلی، تشفی کریں، آج کل میڈیا کا دور ہے، میڈیا سے بھی کام لیا جائے، اب کوئی آدمی ریڈیو پر کوئی بات کہہ سکتا ہے۔ وہ ریڈیو پر کہہ دے، کوئی آدمی مضمون لکھ کر کوئی بات کہہ سکتا ہے وہ مضمون لکھ دے، کوئی آدمی سلسلہ کا لٹریچر تقسیم کر دے۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ تحریر و تقریر میں ایسی کوئی بات کبھی نہیں کہنی چاہئے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔

آپ نے اپنے بزرگوں سے یقیناً سنا ہوگا اور آپ کے تجربہ میں بھی یہ بات ضرور ہوگی کہ بظاہر پانی کے قطرے کی کوئی وقعت ہے نہ اس میں کوئی وزن ہے۔ اس کی چوٹ بھی قابل ذکر نہیں ہوتی لیکن قطرہ مسلسل کسی ایک جگہ گرتا رہے تو اس سے پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے اور وہ سوراخ بڑا ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ بعض جگہ اتنا بڑا بھی ہو جاتا ہے کہ اس میں سے آدمی گزر جاتا ہے۔

اِدھر اُدھر بکھری ہوئی لکڑیوں کو جمع کر کے ترتیب سے دیواروں پر رکھ دیں..... اور ان پر پھوس ڈال دیں تو چھت

بن جاتی ہے، اس میں سے دھوپ نہیں آتی نہ ہی بارش کا قطرہ کمرے میں آتا ہے۔

جوٹ(JUTE) ایک قسم کی گھاس ہے۔ جوٹ کے ریشے اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ معمولی دباؤ سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن اس ہی جوٹ کو باہم دیگر ایک دوسرے میں پیوست کردیا جائے یعنی انہیں متحد کردیا جائے تو ایک رسّہ بن جاتا ہے اور اس رسّے سے سمندر میں پانی کے جہاز کو باندھ دیا جاتا ہے تو سمندر کی بڑی بڑی لہریں پانی کے جہاز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

اب اور زیادہ اس نکتے پر غور کریں!......

دُھنیہ روئی دھنتا ہے تو روئی اتنے باریک ریشوں میں تبدیل ہوجاتی ہے کہ آپ زور سے پھونک ماریں تو روئی کا بڑا گالہ اِدھر سے اُدھر چلا جاتا ہے لیکن جب آپ اسی روئی کو اکٹھا کرکے اس کا دھاگہ بنالیتے ہیں تو ان دھاگوں کے تانے بانے سے اتنا مضبوط کپڑا بن جاتا ہے کہ آپ اس کی ترپال بنالیتے ہیں۔ بوریاں بنا کر گندم اور چاول کا ذخیرہ کرتے ہیں۔

آپ غور فرمائیے!......

آپ کے سامنے درخت ہے...... جب تک درخت کا تنا نہیں بنتا...... چٹکی سے ٹوٹ جاتا ہے لیکن جب درخت کے عناصر اور درخت کے اندر کا سسٹم یکجا ہوجاتا ہے تو بیس بیس آدمی بھی درخت کو زمین سے اکھاڑ نہیں سکتے۔ درخت کیوں مضبوط ہوا؟ ..... اس لئے کہ درخت نے اپنے سسٹم کو قبول کرلیا اور اسے متحد کرکے جڑوں، تنے اور شاخوں پر قائم کردیا۔

حضور پاک ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہر مسلمان کے سامنے ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توحید کا پرچار کیا ہے...... وحدانیت کا پرچار کیا ہے...... اللہ کی یکتائی اور ربوبیت کا اعلان کیا ہے... اللہ نے اور اس کے رسول ﷺ نے نفاق کو ناپسند کیا ہے..... تفرقہ بازی سے منع فرمایا ہے...... توحید کے پلیٹ فارم پر اجتماعی زندگی گزارنے کا حکم دیا ہے......

رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں ہم اتحاد کی دعوت دیتے ہیں اور تفرقہ کی مذمت کرتے ہیں۔ ہم اپنی قوم سے پیغمبرانہ طرزِ فکر کو اپنا کر اللہ کی رسی کو متحد ہوکر مضبوطی کے ساتھ تھام لینے کی درخواست کرتے ہیں ...... ہم یاد دہانی کرانا چاہتے ہیں کہ مضبوط رسّی سے بڑی بڑی طاغوتی طاقتوں اور بڑی سے بڑی شیطنت کو باندھ کر ان کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے۔

ہم پوری دنیا کو ایک قافلہ تصور کرتے ہیں.....قافلہ میں جو لوگ جا رہے ہیں ان کی ساری ضروریات بھی ان کے ساتھ جا رہی ہیں مثلاً انہیں بھوک بھی لگے گی، ان کو کپڑوں کی بھی ضرورت ہے، قافلہ میں شریک لوگوں کو جوتے پہننے ہیں، جب کہیں پڑاؤ ہوگا تو وہاں رہائش کا انتظام کرنا بھی ضروری ہے، رہائش کے لئے مکان کی، چھولداریوں کی، قناتوں کی اور خیموں کی ضرورت ہوگی ۔ قافلہ میں کمزور بھی ہیں، طاقتور بھی ہیں، ضعیف بھی ہیں، پڑھے لکھے بھی ہیں اور کم پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں۔ قافلہ میں موچی، درزی، کارپینٹر،.... غرض ہر وہ بندہ ہے جس کی ضرورت قافلہ کو پیش آسکتی ہے ... قافلہ میں امیر بھی ہے، نائب امیر بھی ہے، قافلہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدمت گزاری میں مصروف ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو لوگوں سے خدمت لینے پر مامور ہیں۔

ہمیں سوچنا یہ ہے کہ قافلہ میں سے کسی ایک کڑی کو اگر نکال دیا جائے ۔ تو کیا قافلہ چلتا رہے گا؟.... ہرگز نہیں! کام رک جائے گا، مربوط نظام ٹوٹ جائے گا، شناخت ختم ہو جائے گی، قافلہ نہیں رہے گا تو اسے منتشر گروہ کہا جائے گا!......

میرے دوستو!

ہمارا مشن رسول اللہ ﷺ کا مشن ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے جو طرزِ فکر ہمیں عطا فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ جو اپنے لئے چاہو... وہی اپنے بھائیوں کے لئے بھی چاہو۔ جو بات اپنے لئے ناپسند ہے وہ بات اپنے بھائیوں کے لئے بھی ناپسند کرو۔

رسول اللہ ﷺ کے روحانی مشن کو چلانے والے حضرات اور خواتین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی نفی کر کے دوسروں کا اثبات کریں ۔اثبات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خود ایثار کریں.... خود قربانی دیں، لوگوں کی غلطیاں پکڑنے کے بجائے اپنی غلطیاں تلاش کریں۔ لوگوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنی اصلاح کی طرف بھی توجہ دیں...

اصلاح کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ڈانٹ ڈپٹ کر کے، برا بھلا کہہ کر اصلاح کی جائے۔ خامیوں اور کوتاہیوں کو تلاش کر کے بار بار اس کا احساس دلایا جائے ۔ دوسرا طریقہ ہے کہ آپ خود اپنی اصلاح کریں، دوسروں کا تزکیہ اس طرح کرنے کی کوشش کی جائے کہ ان کی ذات کی خامیاں اور کوتاہیاں ان کے لئے شرمندگی کا سبب بنے بغیر ان کی شخصیت سے منہا ہو جائیں اور خامیوں کی جگہ اعلیٰ اوصاف شخصیت میں نمایاں ہو جائیں، ایسی تربیت سے آدمی کے اندر (INNER) میں تبدیلی آجاتی ہے۔ یہ انسانی جبلت ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو چھپاتا ہے۔ دوسروں کی غلطیوں پر

تادیبی کارروائی کرتا ہے...... تادیبی کارروائی بھی ضروری ہے لیکن اس وقت جب بغیر تادیب کے اصلاح احوال کی گنجائش نظر نہ آئے اور اجتماعی نظم بگڑنے کا خطرہ ہو، پانی سر سے اونچا ہونے لگے۔ جب تک پانی سر سے اونچا نہ ہو اس وقت تک اصلاح کا طریقہ ہے کہ نہایت خوبصورت اور مؤثر پیرائے میں غلطیوں کی نشاندہی کی جائے۔ ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ جس غلطی پر ہم تادیبی کارروائی کررہے ہیں ...... وہ غلطی ہمارے اندر تو نہیں ہے......؟

ہر آدمی دوسرے آدمی کی غلطی کے کھوج میں مصروف رہتا ہے، وہ کبھی نہیں سوچتا کہ میرے اندر بھی کمزوریاں ہیں......رسول اللہ ﷺ کی طرزِ فکر، تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرزِ فکر، اللہ کی طرزِ فکر ہے......اللہ ستار العیوب ہے!......عیبوں کو چھپاتا ہے...... اللہ غفار الذنوب ہے۔ لوگوں کی کوتاہیوں، غلطیوں اور لغزشوں کو معاف فرماتا ہے...... اگر روحانی مشن میں کام کرنے والے کسی شخص میں معافی اور درگزر کے جذبات موجود نہیں ہیں تو اسے یہ دیکھنا چاہیئے کہ کہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ستارالعیوب اور غفارالذنوب والی صفات کی پیروی سے انحراف کا مرتکب تو نہیں ہورہا۔

اللہ ایک ہے...... اللہ خالق ہے...... یکتا ہے...... اس نے محبت کے ساتھ آپ کو بنایا ہے۔ سب کو بنایا ہے۔ سب کو تخلیق کیا ہے لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ مخلوق اللہ سے شکوہ کرتی رہتی ہے......

آپ کو اللہ کی قسم ہے!

آپ بتائیں کہ ...... اللہ نے کبھی پانی بند کیا ہے...... ہوا بند کی ہے...... آپ کے اندر دل گردے پھیپھڑوں پر مشتمل مستعدی سے کام کرنے والی مشینری کبھی بند ہوئی ہے...... رات دن ہم سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں...... کیا اللہ نے سورج کو منع کیا ہے کہ دھوپ اور روشنی نہ دے...... چاند کو منع کیا ہے کہ روشن نہ ہو...... بارش کو نہ برسنے کا کبھی حکم دیا ہے...... اللہ تعالیٰ لوگوں کو معاف کرتا ہے۔ لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ لوگوں کو ہر طرح کے وسائل فراہم کرتا ہے. ......لوگوں کی حفاظت کرتا ہے۔ نا صرف لوگوں کی حفاظت کرتا ہے بلکہ لوگوں کی حفاظت کے لئے اللہ نے ایک پروگرام ترتیب دیا ہے تاکہ لوگوں تک افہام وتفہیم کا سلسلہ قائم رہے ...... اور افہام وتفہیم کے ذریعے لوگ اللہ کی باتیں سنتے رہیں ......اس ربط کا، اس تعلق کا یہ تقاضہ ہے کہ جب ہم اللہ کی طرف متوجہ ہوں تو خالی الذہن ہوجائیں...... اللہ کے علاوہ کوئی بات ذہن میں نہیں آنی چاہیئے......

یہاں صورت یہ ہے کہ جب ہم دنیاوی کام کرتے ہیں تو یکا یک یکسو ہوجاتے ہیں اور جب اللہ کا معاملہ ہوتا ہے تو

یکسوئی غائب ہوجاتی ہے ...

ہمیں کاروبار کرتے وقت کیوں دوسرے خیالات پریشان نہیں کرتے؟ دکان پر منتشر خیال کیوں نہیں ہوتے؟ ملازمت میں ادھر اُدھر کی سوچیں کیوں یلغار نہیں کرتیں ؟اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے غیر حاضر دماغی سے کام کیا تو ہمیں ملازمت سے فارغ کردیا جائے گا۔

یاد رکھیے!

روحانی بندہ کو مرتبۂ احسان حاصل ہونا چاہیئے ... سالک کو جب تک مرتبہ احسان حاصل نہ ہو اسے سمجھنا چاہیئے کہ ابھی اس کی روحانی طرزِ فکر پختہ نہیں ہے۔ مرتبۂ احسان تب حاصل ہوتا جب انسان اپنی روح سے واقف ہو۔ مرتبۂ احسان یہ ہے کہ تم دیکھو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے یعنی یا تو اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے یا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ لیکن یہ سب اس وقت ممکن ہے کہ جب آپ اپنی روح سے واقف ہوں کیونکہ روح ازل میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ چکی ہے، اللہ کی آواز سن چکی ہے تو جب آپ اپنی روح سے واقف ہوجائیں گے تو آپ اللہ تعالیٰ سے بھی واقف ہوجائیں گے۔

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

میں تو تمہارے اندر ہوں تم مجھے دیکھتے کیوں نہیں ہم اللہ کو اس لئے نہیں دیکھتے کہ ہم اپنی اصل سے یعنی روح سے اور اپنے مفروضہ جسم کی حقیقت سے واقف ہی نہیں ہیں۔ جب ہم روح کو پہچان لیں گے تو ہم اس حقیقت سے آشنا ہوجائیں گے کہ ہمارا جسم روح کے تابع ہے، روح جسم کے تابع نہیں ہے۔ روح کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روح امرِ ربی ہے۔ یعنی روح کا رابطہ اللہ سے قائم ہوتا ہے۔

سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کیا جائے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کا ہر فعل ہر قول اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ملتا ہے۔ اس لئے کہ جب بندہ یہ دیکھ لیتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے تو پھر وہ اپنا ہر کام ہر قول منجانب اللہ کردیتا ہے۔ یہی سیرت طیبہ کا سب سے اہم پہلو ہے اور اسی بات کا سیرتِ طیبہ ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم زندگی کا ہر فعل اور ہر قول کا رُخ اللہ کی جانب موڑ دیں۔

اب جب ہم محض قولاً زبان کے اقرار کے ساتھ، دل کے اقرار کے ساتھ باہوش وحواس رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا پیغمبر مان کر اسلام میں داخل ہوگئے ہیں تو اس مشن کو چلانے کے لئے ہمارے اوپر بھی وہی ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں جن ذمہ داریوں کو حضور پاک علیہ ﷺ نے پورا کرکے دکھایا۔ اس وقت پوری دنیا میں مسلمانوں کا جو حال ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ذلت و رسوائی اور ساری بُرائیاں مسلمانوں کے کھاتے میں ہی کیوں

آ گئی ہیں۔ جب آپ سوچیں گے تو آپ کو ایک ہی جواب ملے گا کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار تو ہم کرتے ہیں لیکن جب رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر عمل کرنے کا معاملہ آتا ہے تو ہمارا فعل ہمارے قول کے برعکس ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں اللہ کی کتاب کا علم عطا فرما دیا۔ ہمارے لئے قوانین وضع کر دیئے اور زندگی گزارنے کے لئے خود عمل کر کے دکھا دیا ہے۔

سیرتِ طیبہ کو بغور پڑھا جائے تو ہم باآسانی اس بات سے باخبر جاتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کیسے شوہر تھے؟ باپ کی حیثیت سے آپ ﷺ نے کس طرح زندگی گزاری...؟ حضور ﷺ نے تجارت فرمائی تو سوداگری کے کیا اصول اختیار کئے...؟ رسول اللہ ﷺ کے اندر عفو و درگزر بے انتہا تھا...... ہر مسلمان جانتا ہے کہ جنگ احد میں رسول ﷺ کے چچا حضرت امیر حمزہؓ شہید ہوئے اور ہندہ نے حضرت امیر حمزہؓ کا کلیجہ چبایا اور آپؓ کے کان، ناک اور اعضاء کو کاٹ کر دھاگے میں پرویا اور گلے میں پہن کر میدان جنگ میں رقص کیا... لیکن جب فتح مکہ کے موقع پر رسول ﷺ کے دربار میں آکر ہندہ اسلام قبول کرتی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اُس کا ظالمانہ، گھناؤنا، وحشیانہ اور درندگی پر مبنی عمل کو بھی معاف فرما دیا۔

ہم جب آج مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح نظر آتا ہے کہ بھائی بھائی کا دشمن بنا ہوا ہے...... حسد کی آگ بھڑکی ہوئی ہے... شوہر بیوی سے نالاں ہے... بیوی شوہر سے ناراض ہے... بچے والدین سے سہمے ہوئے ہیں... والدین کو بچوں پر اعتماد نہیں رہا... ایک عجیب نفسانفسی کا عالم ہے... جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی قدریں ہی پامال ہو گئی ہیں... اس کی ایک وجہ صرف یہ ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ تو بہت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے سلسلہ میں محافل بھی سجاتے ہیں۔ بڑے بڑے پروگرام بھی منعقد کرتے ہیں۔ ان پروگراموں میں دامے، درمے، قدمے، سخنے شامل بھی ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بہت اچھا کام ہے۔ لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو ہمارے اعمال میں حضور پاک ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے پہلو فراموش ہو جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے نہایت آسان راستہ میری دانست میں یہ ہے کہ ہر مسلمان کو رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا بھرپور اور بار بار مطالعہ کرنا چاہیئے۔ رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ پر عمل کر کے ہمیں یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے سچے شیدائی اور مخلص پیروکار ہیں۔ سیرتِ طیبہ جتنی زیادہ پڑھی جائے گی اسی مناسبت سے رسول اللہ ﷺ کی طرزِ فکر ہمارے اندر منتقل ہو گی اور جس قدر رسول اللہ ﷺ کی طرزِ فکر ہمارے اندر منتقل ہو جائے گی، اسی مناسبت سے تمام پیغمبران کرامؑ کی طرزِ فکر ہمارے اندر منتقل ہو جائے گی اس لئے کہ جو بات ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے

بتائی وہی بات حضور پاک ﷺ نے فرمائی اور حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے کوئی نئی بات نہیں کی جو بات میرے بھائی پیغمبروں نے کہی وہی دُہرا رہا ہوں۔

تمام پیغمبروں نے یہی فرمایا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی پرستش کے لائق نہیں ہے۔ ایمان لاؤ اللہ ایمان لاؤ فرشتوں پر، ایمان لاؤ رسولوں پر، ایمان لاؤ کتابوں پر اور ایمان لاؤ نیک اور بد تقدیر پر اس لئے کہ سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

یہی بات ہمارے آقا، ہمارے مولا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمائی کہ مومن کی علامت یہ ہے کہ اس کا ایمان ایک اللہ پر ہو، مومن کی شناخت یہ ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان رکھتا ہو۔ اللہ کے تمام پیغمبروں اور رسولوں پر اس کا ایمان ہو۔ فرشتوں پر اس کا ایمان ہو اور یومِ آخرت پر اس کا ایمان ہو۔

الحمد اللہ!...... ہمارے ذہن میں رسول اللہ ﷺ کا عشق موجود ہے۔ آپ ﷺ کی محبت موجود ہے ہم چاہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کریں...... لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو ہماری ذاتی خواہش، ہمارا خاندانی وقار، ہمارے اندر شیطان کا پھونکا ہوا غرور ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ان تمام دیواروں کو منہدم کرنے، ان تمام برائیوں سے بچنے اور ان تمام اونچی اونچی دیواروں کو پھلانگنے کے لئے ایک ہی نسخہ ہے اور وہ یہ ہے کہ الحمد للہ ہم حضور پاک ﷺ کے اُمتی ہیں۔ ہمارے دلوں میں حضور پاک ﷺ کی محبت بھی ہے۔ ہمارے اندر حضور پاک ﷺ کا عشق بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ رسول پاک ﷺ نے جس طرح دنیا میں زندگی گزاری ہے اس زندگی کے بارے میں ہمیں علم ہونا چاہیئے۔ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی کو سیرت طیبہ کی کتابوں میں پڑھیں گے ......ایک دفعہ پڑھیں گے، دو دفعہ پڑھیں گے، تین دفعہ پڑھیں گے...... اس میں غور و فکر کریں گے تو انشاء اللہ..... اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ہمارے اوپر نفاذ ہو جائے گا۔ ہماری زندگی میں رسول اللہ ﷺ کے اعمال کا عکس نظر آنے لگے گا اور جب ایسا ہو جائے گا تو ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سچے پکے مسلمان بن جائیں گے۔

جب حضور ﷺ کے اُمتی، حضور ﷺ کے نام لیوا، حضور ﷺ کے عشاق، حضور ﷺ سے محبت کرتے ہیں...... اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی بندہ میرے محبوب بندے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے جتنی محبت کرتا ہے میں اس محبت سے کہیں زیادہ اس بندے سے محبت کرتا ہوں۔

سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے ہیں، جو عالمین کی خدمت کرتا ہے، جو عالمین کو رزق دیتا ہے اور جو عالمین

میں آباد مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے وسائل فراہم کرتا ہے۔جس بندے کا اللہ سے تعلق قائم ہوجاتا ہے اس کے اندر اللہ کی طرف سے خدمت کا وصف منتقل ہوجاتا ہے۔بندہ کا جتنا زیادہ اللہ کی مخلوق کی خدمت میں انہماک بڑھتا ہے اسی مناسبت سے بندہ اللہ کے قریب ہوجاتا ہے،اللہ سے اس کی دوستی ہوجاتی ہے۔جو بندہ مخلوق سے نفرت کرتا ہے اور تفرقہ ڈالتا ہے وہ اللہ کا دوست نہیں۔اللہ کا دوست خود غرض نہیں ہوتا۔اللہ کا دوست خوش رہتا ہے اور سب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔

ماں باپ بچے کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہوتے ہیں اسی طرح اللہ بھی اپنی مخلوق کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہوتا ہے ایسی باتوں سے جس کے پیچھے خلوص نیت اور مطمع نظر صرف اللہ ہو۔

اللہ اپنی مخلوق کی خدمت گزاری میں مصروف ہے، ہر بندہ پر لازم ہے کہ وہ شکر گزار بندہ بن کر اللہ کی مخلوق کی خدمت کرے اور اللہ کا دوست بن جائے۔

حضرت ابراہیمؑ سے پیغمبرانہ تعلیمات رسول اللہ ﷺ تک مسلسل اور تواتر کے ساتھ جاری رہیں تمام پیغمبروں نے نوع انسانی کو یہی پیغام پہنچایا کہ اللہ ایک ہے.... حضرت محمد الرسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا نچوڑ بھی یہی ہے کہ اللہ کو ایک مانو..

ہمارے اندر اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ ہمارا خالق و مالک اللہ ہے، پیدا بھی اللہ کرتا ہے، حیات بھی اللہ عطا کرتا ہے اور موت بھی اللہ دیتا ہے۔ یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو آپ کا ذاتی شعبہ ہو .. مثلاً ہم کھا پی کر ہی جوان ہوتے ہیں .....سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھوک ہی نہ لگے تو ہم کھائیں گے کیسے ؟ نیند نہ آئے تو آدمی سوئے گا کیسے.... ؟ نیند سے بیدار نہ ہوتو آدمی اپنے خواب سے جاگ ہی نہیں سکتا......اپنی زندگی کا جب ہم محاسبہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہی بات آتی ہے کہ ہم سو فیصد حالتِ مجبوری میں ہیں۔ ہمیں کوئی بھی اختیار کسی بھی صورت میں حاصل نہیں .... مثلاً ہم اپنی مرضی سے پیدا نہیں ہوسکتے، اتنی بھی چوائس ہمارے پاس نہیں ہے کہ ہم کہیں اللہ میاں! ہمیں کسی بادشاہ کے گھر پیدا کردے، ہم غریب کے ہاں پیدا نہیں ہونا چاہتے پیدائش کے بعد آپ کی زندگی کتنی ہے؟ وہ بھی اللہ جانتا ہے دس سال کی ہو، پچاس سال کی ہو، ہوسکتا ہے آپ سو سال زندہ رہیں.... آپ جوان ہوتے ہیں آپ کو جوان ہونے میں کیا کرنا پڑتا ہے؟ ..اور اگر آپ کھاپی کر، کھیل کود کر جوان ہوجاتے ہیں تو پھر بوڑھے کیوں ہوجاتے ہیں؟

پیغمبرانہ تعلیمات کا نچوڑ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی طرز فکر قائم ہوجائے کہ انسان ہمہ وقت اللہ کی طرف متوجہ

رہے، وہ کچھ بھی کرے Care of Allah کرے۔ پیغمبر آخر الزماں سیدنا حضرت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ انسان کا ذہن اس طرح بنا دیا جائے کہ وہ کوئی بھی کام کرے پہلے اس کا ذہن اللہ کی طرف جائے پھر کام کی طرف...... مسلسل اس مشق سے وہ بندہ اللہ کا دوست بن جاتا ہے اور اس کے اوپر سے خوف و غم ختم ہوجاتا ہے۔ جب خوف وغم ہی ختم ہوگیا تو زندگی جنت کے سوا اور کیا ہوگی؟......

میرے بچو! بھائیو! بہنو اور میری بیٹیو! میری آپ سب کو نصیحت ہے اس مبارک محفل میں کہ سیرتِ طیبہ پر عمل کرتے ہوئے...... آپ لوگوں کے ساتھ بہت اخلاق و محبت سے پیش آئیں جو لوگ آپ کے پاس آئیں ان کی خدمت کریں، سلام میں پہل کریں، انشاء اللہ آپ کی کوششیں کامیاب ہوں گی، آپ اس دنیا میں اور آخرت میں اللہ کے فضل وکرم سے سرخرو ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں کو قبول فرمائیں اور جو یہاں سننے والے لوگ موجود ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہمیں بھی توفیق دے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل کریں، اپنے بھائیوں کو عمل کرنے کی طرف متوجہ کریں، اپنے بچوں میں خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کا ایسا جذبہ بیدار کریں کہ بچے از خود رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ پر عمل کرنے لگیں''۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کا حامی و ناصر ہو۔

اسلام وعلیکم!

☆......☆......☆

اراکینِ سلسلہ عظیمیہ لاہور سے خطاب

۱۴ اپریل ۲۰۰۶ء کو مراقبہ ہال جامعہ عظیمیہ کاہنہ نو، لاہور میں خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے زیرِ سرپرستی کارکنانِ سلسلہ عظیمیہ کا ایک شاندار اجتماع منعقد ہوا۔ اس اجتماع کے لئے مراقبہ ہال لاہور کی انتظامیہ نے بہترین منظم انتظام کیا جس کو بہت سراہا گیا۔ ٹیم ورک کے ساتھ کارکنانِ سلسلہ عظیمیہ نے خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کی نگرانی میں اجتماعی محفل مراقبہ میں شامل ہوکر اپنے اندر جھانکنے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔ بعدِ از محفل مراقبہ مرشدِ کریم حضرت عظیمی صاحب نے تمام کارکنانِ سلسلہ عظیمیہ اور مختلف شہروں سے آئے ہوئے مندوبین سے خطاب کیا۔ آخر میں تمام مہمانانِ گرامی اور کارکنان کے لئے بہترین کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا جس کو لوگوں نے بہت پسند فرمایا۔ پروگرام کے اختتام پر میاں مشتاق احمد عظیمی نے انتظامیہ مراقبہ ہال اور تمام خواتین دحضرات کا شکریہ ادا کیا۔

مرشدِ کریم نے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا،

دوستو ..... پیارو...... روحانی قافلے کے سالا

السلام علیکم!

آپ سب میری روحانی اولاد کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے ...... کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو اپنے کام کے لئے منتخب کرلیتے ہیں، جب تک کام کی تکمیل نہیں ہوتی وہ بندہ اگر چاہے بھی تو اسے ریٹائرمنٹ نہیں ملتی۔

اللہ کا اپنا ایک نظام ہے۔ اس نظام SYSTEM میں مخلوق کا ہر فرد، درخت کا ہر پتہ، پھول کی ہر پنکھڑی، پرندے، چرندے، زمین کے طبقات، معدنیات، نباتات، جمادات، سماوات، جنات ملائکہ ارضی وسماوی، حاملانِ عرش، جنت دوزخ، عرش وکرسی، بیت المعمور، سدرۃ المنتہیٰ، حجابِ عظمت، حجابِ کبریا، حجابِ محمود اور مقامِ محمود...... اللہ تعالیٰ کے اس نظام کو چلانے والی مشینری کے کل پرزے ہیں۔ اس نظام میں سے کوئی ایک پرزہ بھی اگر نکال دیا جائے تو مشین رک جائے گی۔ کائنات ٹھہر جائے گی۔

اس نظام میں ہر فرد کی اپنی ڈیوٹی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک سٹیج ڈرامہ ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ڈرامہ میں سین کے ساتھ کردار اور مناظر بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ہم کائناتی نظام کو ڈرامہ سمجھ لیں تو اس ڈرامہ میں ہر فرد کا الگ الگ کردار ہے۔ اس ڈرامہ میں ہر فرد ایک ایکٹر یا ایکٹریس کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ ڈرامہ کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس میں انصاف ہو، ظلم ہو، خیر ہو، شر ہو، گرمی سردی ہو، آندھی اور طوفان ہوں۔ سمندروں کا مدو جزر ہو، چاند کی چاندنی اور سورج کی روشنی ہو... کردار موجود ہوگا تو ڈرامہ چلتا رہے گا۔ کردار بدلتے رہیں گے۔ آپ سب خواتین و حضرات میری طرف توجہ فرمائیے!

کتنے باپ مرجاتے ہیں اور ان کی جگہ اور باپ آجاتے ہیں۔ کتنی ماؤں کو زمین کھا جاتی ہے، ان کی جگہ اور مائیں آجاتی ہیں۔ آج جو بچے ہیں کل باپ بن جائیں گے، ہماری ننھی منی بیٹیاں کل مائیں بن جائیں گی۔ آج کی مائیں کل بوڑھی ہو کر قبر میں جا سوئیں گی۔ دنیا کے کارخانہ میں جو بھی موجود ہے اس کی ایک حیثیت ہے۔ وہ چاہے یا نہ چاہے اس کو ڈرامے میں کام کرنا ہے۔ اسٹیج پر اسے آنا ہے، جو کردار متعین کر دیا گیا ہے، اسے پورا کرنا ہے۔ جبر کے ساتھ کرنا ہے یا خوشی کے ساتھ کرنا ہے۔ ڈرامہ کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک کردار پورے نہ ہوں۔ ڈرامہ میں ایک آدمی با جبر و اکراہ اپنا کردار ادا کرتا ہے دوسرا آدمی خوشی سے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ جو بندہ جبر و اکراہ اور مجبوری سے اپنا کردار ادا کرتا ہے وہ ناخوش رہتا ہے۔ جو بندہ اپنے حصے کا کام ڈیوٹی سمجھ کر کرتا ہے وہ خوش رہتا ہے۔

ہر کام کی ایک نوعیت ہے۔ ڈرامے میں کام کی نوعیت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر کردار اپنے آپ کو خرچ کر رہا ہے۔ مثلاً آج کا پیدا ہونے والا بچہ بڑھ نہیں رہا، گھٹ رہا ہے۔ اگر ایک بچے کی عمر ساٹھ سال ہے تو بچے کی پیدائش کا ہر منٹ، ہر دن، ہر رات، ہر مہینہ، ہر سال کم ہو رہا ہے اور ہم خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا بچہ بڑا ہو رہا ہے اور عمر بڑھ رہی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ ساٹھ سال تک زندہ رہنے والا بچہ جب ایک سال کا ہوتا ہے انسٹھ سال کا رہ جاتا ہے۔ ایک سال اس کی عمر گھٹ جاتی ہے۔ جب وہ دس سال کا ہوتا ہے پچاس سال عمر رہ جاتی ہے۔ بیس سال کا ہوتا ہے تو چالیس برس عمر باقی رہ جاتی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ یہاں ہر شے گھٹ رہی ہے۔ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ بڑھ رہی ہے۔

بندہ بشر اگر اپنے گھٹنے سے واقف نہیں مجبوراً گھٹ رہا ہے لیکن اگر یہ گھٹنا اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور پسندیدگی کے مطابق ہے تو زندگی کا ہر لمحہ کائنات کے لئے ایثار ہے۔ ہر کردار جو اسٹیج پر آ گیا یعنی دنیا میں پیدا ہو گیا اسے اپنا

کردار پورا کرتا ہے ..... اور کردار پورا کرنے کے بعد سٹیج سے اُتر جاتا ہے۔ اس کی جگہ دوسرا ایکٹر آتا ہے اپنا کردار پورا کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ایکٹریس یا ایکٹر ڈرامے کو مسلسل چلانے کے لئے ایثار کر رہا ہے۔

جتنی مخلوق اب تک پیدا ہو چکی اور جتنی مخلوق اب تک مر چکی ہے، زمین کو زندہ رکھنے زمین کی رونق بحال کرنے اور زمین کی کوکھ سے پھول پھلواری اگانے کے لئے اس نے ایثار کیا ہے۔ اس ایثار سے ہی کائنات میں رونق ہے۔ یہاں ہر چیز ایثار کے اوپر قائم ہے۔ ہوا کا ایثار یہ ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کو زندگی عطا کرتی ہے۔ پانی کا ایثار یہ ہے کہ وہ مخلوق کو سیراب کرتا ہے۔ آکسیجن کا ایثار یہ ہے کہ وہ مرتے ہوئے انسان کو زندگی بخش دیتی ہے اور..... کسی روحانی بندے کا ایثار یہ ہے کہ وہ اپنی جان کا، اپنے خون کا ایک ایک قطرہ مخلوق کے اوپر نچھاور کر دیتا ہے۔ اگر اللہ کا انعام یافتہ بندہ، فقیر اپنے خون کا اک ایک قطرہ مخلوق کے لئے نثار نہیں کرتا تو وہ اللہ کا دوست نہیں بن سکتا۔ اس لئے کہ ساری کائنات بجائے خود اللہ کا ایثار ہے۔ اللہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، اللہ سوتا ہے نہ جاگتا ہے، اللہ کے نہ بیوی ہے، نہ بچے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی خاندان ہے۔ اللہ کا ایثار یہ ہے کہ مخلوق کو کھلا رہا ہے، مخلوق کو پلا رہا ہے، مخلوق کو اولاد عطا کر رہا ہے۔ اللہ ہمہ وقت اپنی مخلوق کی خدمت کر رہا ہے۔ مخلوق کے لئے ایثار کر رہا ہے۔

''الحمدللہ رب العالمین''

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو عالمین کا رب ہے۔''

اللہ چاہتا ہے میری مخلوق پریشان نہ ہو، بھوکی نہ رہے، پیاسی نہ رہے، میری مخلوق کے لئے زمین اتنی سخت نہ ہو جائے کہ جب زمین کے اوپر چلے تو ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ میری مخلوق کے لئے زمین اتنی نرم بھی نہ ہو جائے کہ مخلوق اس میں پھنس جائے..... اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ ضروریات زندگی میں کمی نہ ہو۔

آدمؑ کے زمانے میں بہت تھوڑی مخلوق تھی۔ بڑھتے بڑھتے چھ ارب ہو گئی ہے۔ زمین پر آباد نامعلوم آبادیاں جو نہیں معلوم کتنی ہیں۔ چھ ارب مخلوق کی ضروریات الٰہی نظام کے تحت آٹومیٹک AUTOMATIC پوری ہو رہی ہیں۔ بلاشبہ یہ اللہ کا ایثار ہے۔

حساب کتاب سے یہ بات سامنے آتی ہے اس زمین پر روزانہ اٹھارہ ارب انسان کھانا کھاتے ہیں۔ دوسری مخلوق اس کے علاوہ ہے۔ یہ سمجھنا اور کہنا کہ بندہ محنت کر کے روٹی کھا رہا ہے، اچھی بات ہے لیکن اگر بغور جائزہ لیا جائے تو صحیح بات یہ ہے کہ ہر آدمی خود کو دوسروں پر ایثار کر رہا ہے۔ چاہے یہ ایثار آپ خوشی سے کریں یا خوشی سے نہ

کریں۔آپ سوچ سمجھ کر ایثار کریں، نادانستگی میں ایثار کریں، بہرحال آپ ایثار کرنے پر مجبور ہیں۔

یہاں سب ایک سے نہیں ہوتے۔ سب پہلوان نہیں ہوتے، سب کمزور نہیں ہوتے۔ سب طاقتور نہیں ہوتے، سب قدآور نہیں ہوتے، کوئی چھوٹے قد کا ہوتا ہے کوئی بڑے قدر کا ہوتا ہے۔کوئی چوڑے سینے کا ہوتا ہے، کوئی ڈیڑھ پسلی کا ہوتا ہے.... لیکن جو جہاں اور جس حالت میں بھی ہے اس کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ دنیا ایثار کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

انسان پیدا ہوتا ہے۔چھوٹا سا ہوتا ہے۔اسے اپنا پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں سے کھایا کہاں سے پیا۔کھیل کود میں تماشہ بنی میں، بے عقلی میں، بے شعوری میں زندگی گزارتا ہے اور جب ذرا آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ختم ہوگیا۔ بچپن ختم ہونے کا مطلب ہے جوانی کے لئے بچپن کا ایثار کردیا گیا۔اب ذرا اور بڑا ہوا۔ ہوش وحواس درست ہوئے کچھ پڑھا لکھا تو والدین کی خدمت میں لگ گیا۔ابا اماں کی خدمت، بہن بھائی کی شادی، گھر کی تعمیر میں جو وقت لگا وہ بھی ایثار ہی تو ہے۔ابھی وہ اس سے فارغ نہیں ہوا کہ شادی ہوگئی۔اب وہ بیوی کی خواہشات پوری کرنے میں لگ گیا۔میاں بیوی کے لئے اور بیوی میاں کے لئے ایثار کرتے رہے۔ابھی کچھ دن گزرے تھے کہ اولاد ہوگئی۔ ماں باپ دونوں اولاد کی خدمت اور دیکھ بھال میں مصروف ہوگئے۔اولاد جوان ہوئی ان کی شادی کی فکر دامن گیر ہوگئی۔ذمہ داریاں پوری ہوئیں یا نہیں ہوئیں، زمین نے کہا تم نے جو ایثار کرنا تھا وہ پورا ہوا اور عمر تمام ہوئی، زمین چھوڑ دو اب یہی ایثار تمہاری اولاد کرے گی۔زمین نے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور کھائے ہوئے بھس کی طرح بنادیا۔گوشت پوست کھاد بن گیا، ہڈیاں راکھ ہوگئیں۔

روحانی شعور ہم پر واضح کرتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کے ساتھ ایثار کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔وہ اس بات کو سمجھے یا نہ سمجھے بہرحال اس کی زندگی کا ہر لمحہ، ہر دن کسی کے اوپر نثار ہورہا ہے۔اور وہ نثار ہونا ایثار کے زمرے میں آتا ہے۔

جتنے بھی پیغمبران علیہم الصلوٰۃ والسلام اس دنیا میں تشریف لائے ان کے حالات و واقعات سامنے ہیں اور سب پیغمبروں کے سرتاج حضور پاک ﷺ کی زندگی بھی ہمارے سامنے ہے۔رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں کے بنائے ہوئے غلط نظام کو صحیح اور درست کرنا چاہا تو لوگ آپ کے درپے آزاد ہوگئے۔لیکن حضور پاک ﷺ نے تکلیفیں اٹھائیں، پتھر کھائے، لہولہان ہوئے، راستے میں کانٹے بچھائے گے، بیت اللہ میں عبادت کے دوران ابوجہل نے کثیف خون اور دوسری گندگیوں سے بھری ہوئی اونٹ کی اوجڑی آپؐ کے سر پر رکھ دی۔

چہرہ اور سر مکمل طور پر اوجڑی کے غبارہ میں بند ہوگیا اور اوجڑی کے نچلے سرے کو تھیلی کی طرح مضبوطی سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گردن میں باندھ دیا گیا۔ لوگ کھڑے ہوکر تماشہ دیکھتے رہے۔ جم غفیر میں سے ایک فرد بھی آگے نہ بڑھا کہ اس گندگی اور تعفن کے غلاف سے آپؐ کا سر، خاک اور منہ آزاد کردے۔ سب اس انتظار میں تھے کہ دم گھٹ جائے۔ سیدہ رقیہؓ واقعہ کی اطلاع پا کر سراسیمہ حالت میں خانہ کعبہ میں داخل ہوئیں اور روتے ہوئے سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سر کو اوجڑی کی گرفت سے آزاد کرایا۔ اپنے دامن سے چہرہ مبارک صاف کیا اور سہارا دے کر اپنے عظیم باپ کو گھر لے آئیں...... حد تو یہ ہے کہ بائیکاٹ کردیا گیا۔ بھوک سے بلک بلک کر بے ہوش ہوگئے۔ پانی بند کردیا گیا۔ انتہا یہ ہے کہ مکہ سے انہیں نکلنے پر مجبور کردیا گیا...... لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کے راستے کو نہیں چھوڑا۔ اللہ کی آواز لوگوں تک پہنچاتے رہے۔

اللہ کا راستہ کیوں نہیں چھوڑا......؟

اس لئے نہیں چھوڑا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ایثار کے سوا کچھ نہیں تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی اللہ کے لئے اس طرح ایثار کردی جس طرح اللہ رب العالمین نے کائنات کے لئے ایثار کیا ہے۔

"یداللہ فوق ایدیھم"

"اللہ کا ہاتھ ہے، اوپر ان کے ہاتھ کے"

جس نے ہمارے محمد ﷺ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ جس نے ہمارے محمد ﷺ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی۔ اللہ نے اس سے محبت کی...... کیوں؟

اس لئے کہ جو ایثار خالق کائنات اپنی مخلوق کے لئے کررہا ہے وہ محمد الرسول اللہ ﷺ نے کرکے دکھایا اور اسی ایثار کی بنیاد پر محمد الرسول اللہ ﷺ رحمت اللعالمین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات میں اعلان فرمادیا:

"وما ارسلنک الا رحمۃ اللعالمین"

اے محبوب! محمد الرسول اللہ ﷺ ہم نے تجھے تمام عالمین کے لئے رحمت بنادیا۔

اللہ ربُّ العالمین ہے۔ اللہ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، اللہ نہ سوتا ہے نہ جاگتا ہے۔ اللہ کو تو اُونگھ بھی نہیں پکڑتی، اللہ نہ شادی کرتا ہے نہ اللہ کے اولاد ہے۔ اللہ کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لئے ایثار کررہا ہے۔ مخلوق کے لئے وسائل فراہم کرتا ہے۔ وسائل ترتیب و توازن کے ساتھ پیدا کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ

تعالیٰ نے مخلوق سے تھوڑی پوچھ کر مخلوق کے ضروریاتِ زندگی اور تقاضے پیدا کئے ہیں۔ جب سے کائنات موجود ہے، عالمین موجود ہیں، مخلوق کا کفیل اللہ ہے اور مخلوق کی ضروریات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس کے دستِ قدرت سے باہر ہو لیکن اللہ تعالیٰ خود تمام ضروریات سے ماوراء ہے۔

سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اندر تمام بشری تقاضے موجود ہیں۔ آپؐ کو بھوک بھی لگتی تھی آپؐ سوتے بھی تھے، آپؐ نے شادیاں بھی کیں، آپؐ کی اولاد بھی ہوئی، آپؐ نے کاروبار بھی کیا۔ حضور ﷺ بشری تقاضے پورے کرنے کے لئے وسائل کی تقسیم سے واقف ہیں۔ اس لئے آپ ﷺ نے وسائل استعمال کئے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت اللعالمین کا مرتبہ عطا کر کے پوری کائنات میں وسائل کی تقسیم کا نظام آپؐ کے سپرد کر دیا ہے۔

اللہ کے چہیتے محبوب ﷺ نے اللہ کے لئے شہر چھوڑا۔ غارِ حرا میں تشریف لے گئے۔ وہاں تخلیقی رموز پر غور وفکر کرتے رہے۔ رشتہ داروں کی باتیں سنیں، کسی نے مجنوں کہا، کسی نے جادوگر کہا۔ طائف گئے تو رشتہ داروں نے منہ موڑ لیا شقی القلب لوگوں نے پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا اور کہا دیوانہ آگیا دیوانہ آگیا۔ پیر مبارک سے جوتا اتارا تو خون سے بھرا ہوا تھا لیکن اللہ کے محبوب بندے نے ایثار نہیں چھوڑا۔ رسول اللہ کا ایثار اللہ کو اتنا پسند آیا کہ اللہ نے انہیں رحمت اللعالمین بنا دیا۔ نہ صرف یہ رحمت اللعالمین بنا دیا بلکہ دین کی تکمیل فرما دی اور وہ علوم عطا فرما دیئے جو تخلیق کے فارمولے ہیں۔

بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں بظاہر ہوا، پانی اور غذا کا انتظام نہیں ہے لیکن بچہ کی نشوونما ہو رہی ہے۔

هوالذی یصور کم فی الارحام کیف یشاء

اللہ تعالیٰ کہتے ہیں ''دیکھو ہم ماؤں کے پیٹوں میں کیسی تصویر کشی کرتے ہیں''۔

ماں کا ایثار یہ ہے کہ وہ نو مہینے تک اپنے بچے کو خوشی خوشی خون پلاتی ہے۔ بچہ تولد ہوتا ہے تو دو سال تک اپنے سینے سے بچے کے اندر دودھ انڈیلتی رہتی ہے۔ کیا یہ ماں کا ایثار نہیں ہے؟

باپ صبح سے شام سردی میں، گرمی میں محنت مزدوری کرتا ہے۔ بچوں کی نشوونما کرتا ہے۔ بچوں کو اچھی تعلیم دلاتا ہے۔ بچوں کو اچھا کھانا کھلاتا ہے۔ بچوں کی صحت کا خیال کرتا ہے۔ کیا یہ باپ کا ایثار نہیں ہے؟

اگر ہم غور وفکر کریں تو کائنات کو سمجھنے کے لئے صرف ایک لفظ کافی ہے کہ کائنات ایثار کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے وصال سے پہلے تین باتیں فرمائی تھیں۔ ایک بات چونکہ میری ذات

سے متعلق ہے اس کو ظاہر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ دو باتیں عرض کئے دیتا ہوں ..... فرمایا:

خواجہ صاحب یہ بات یاد رکھیئے!

فقیر کی ذات چمار ہوتی ہے۔ سید، پٹھان، خان، قریشی، انصاری، صدیقی، عثمانی کچھ نہیں ہوتی اور چمار کے اوپر آسمان سے بیگار اترتی ہے۔ اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ مخلوق کی خدمت کرے۔

دوسری بات یہ ہے:

اللہ کا مشن چلانے والے لوگ دیوانے ہوتے ہیں۔ جس روز عقل و شعور آپ پر غالب آ گیا دیوانگی نکل جائے گی۔ مشن فیل ہو جائے گا۔ مشن چلانے والا بندہ ایثار کے سوا کسی چیز سے واقف نہیں ہوتا۔

فرمایا:

''کسی کو بنانے کے لئے اپنا بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ جب تک تم اپنے آپ کو کھو نہیں دو گے، دوسرا بندہ کچھ بنے گا نہیں۔ جب تک ماں اپنا خون نچوڑ نچوڑ کر بچے کے حلق میں انڈیل نہیں دیتی بچے کی نشوونما نہیں ہوتی''۔

دیوانگی ایک ایسی حالت ہے کہ آدمی یہ نہیں سوچتا کہ میرے ساتھ کسی نے کیا کیا ہے۔ وہ صرف یہ سوچتا ہے کہ میں کسی کے ساتھ کیا کر سکتا ہوں اور میں نے اب تک اس کی خدمت کیوں نہیں کی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ بندہ میرے لئے کیا کر سکتا ہے؟ وہ ایک بات جانتا ہے کہ میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں اور میں نے اب تک اس کے لئے کیوں کچھ نہیں کیا۔

غور فرمایئے! آپ کے اندر جو الیکٹریسٹی آ رہی ہے، جس کی بنیاد پر آٹو میٹک مشین آپ کے اندر چل رہی ہے وہ انرجی Energy مفت ہے۔ کوئی کنکشن نہ کوئی سوئچ، آن یا آف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مشین چل رہی ہے، جسم کے اندر ہر پُرزہ چل رہا ہے۔ گردے، آنتیں اور دوسرے اعضاء متحرک ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو نہ چل رہی ہو۔ جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھئے! کوئی کنکشن نظر نہیں آتا۔ پیروں کے نیچے چھو کر دیکھئے کوئی کرنٹ نظر نہیں آتا۔ زمین پر ہاتھ پھیریئے وہاں بجلی محسوس نہیں ہوتی، ہاتھ دائیں بائیں لہرایئے! ہاتھ بجلی کے تاروں سے نہیں ٹکراتا۔ لیکن مشین چل رہی ہے، کیوں چل رہی ہے کس سورس کے ساتھ چل رہی ہے؟...... ایک میگنیٹک فیلڈ MAGNETIC FIELD سے چل رہی ہے۔ میگنیٹک فیلڈ روشنیاں ہیں، لہریں ہیں، انوار ہیں۔

اللّٰہُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ.

اللہ ساوات اور ارض کی روشنی ہے، اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

اس میگنیٹک فیلڈ سے لوگ سیراب ہو رہے ہیں، چل پھر رہے ہیں اور حرکت کر رہے ہیں۔ میگنیٹک فیلڈ اللہ کا نور ہے۔ تمام کائنات اور کائنات کی تمام انواع کا ہر فرد اللہ کے نور سے زندگی حاصل کر رہا ہے۔ اللہ کا نور آسمانوں اور زمین میں تمام مخلوقات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

سلسلہ عظیمیہ کی تعلیمات کا نچوڑ یہی ہے کہ عظیمی بندہ اگر وہ عظیمی ہے تو وہ ایثار کے سوا کچھ نہیں ہے اور اگر اس کے اندر ایثار نہیں تو وہ عظیمی نہیں ہے۔ اگر آپ عظیمی بننا چاہتے ہیں اور آپ کو رسول اللہ ﷺ کے دربار میں اپنی شناخت کرانی ہے، آپ کو اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل کرنا ہے تو صرف ایک کام کریں .....

دنیا کے لئے ایثار کریں، اپنے لئے کسی سے کچھ نہ چاہیں۔ اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار کر لیا جو قلندر بابا اولیاءؒ کا ذاتی طریقہ ہے تو آپ کامیاب ہیں اور اگر یہ طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر یہ سب میلہ ٹھیلہ ہے۔

سلسلہ عظیمیہ کا مشن یہ ہے کہ ہم مخلوق کے لئے ایثار کریں۔ اللہ کے لئے ایثار کریں، ایثار کی تعریف یہ ہے کہ آپ کسی مخلوق، بھائی بہن، بیٹے، بیوی اور شوہر سے کوئی توقع قائم نہ کریں۔ توقع صرف اللہ کے ساتھ قائم کریں۔ بیٹا کس نے دیا اللہ نے، وسائل کس نے پیدا کئے ......؟ اللہ نے، گھر بنانے اور کھیتی باڑی کرنے کے لئے زمین کس نے بنائی......؟ اللہ نے، آکسیجن، ہوا، پانی، سورج چاند کس نے بنائے.....؟ اللہ نے سماوات اور اَرض کو انسانوں کے لئے کس نے مسخر کیا......؟ اللہ نے لیکن انسان اصل مالک و خالق سے توقع قائم نہیں کرتا بندوں سے توقع قائم کرتا ہے۔ بیٹا بڑھاپے کا سہارا بنے گا یا نہیں یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ بڑے نصیب والے ہیں وہ ماں باپ جن کی اولاد بڑھاپے کا سہارا بن جاتی ہے۔ کہاں سہارا بنتی ہے وہ تو خود سہارے کی محتاج ہے۔ مگر باپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ میں اپنی اولاد کے لئے کچھ کر دوں، اولاد میرے لئے کچھ کرے نہ کرے۔ جب باپ اللہ کی مخلوق کو اولاد کی طرح سمجھتا ہے تو اولاد بھی باپ کی خدمت کرتی ہے۔ اس لئے کہ اولاد کے اندر باپ کی طرزِ فکر منتقل ہوتی ہے۔ اولاد باپ کی طرزِ فکر سے متاثر ہو کر ماں کے لئے ایثار کرتی ہے لیکن اب زمانہ کی قدریں بدل گئی ہیں۔ چھوٹا بھائی بڑے سے توقع قائم کر رہا ہے۔ بڑا بھائی چھوٹے سے توقع قائم کر رہا ہے۔ بیوی شوہر سے توقع قائم کئے ہوئے ہے۔ شوہر بیوی سے توقع قائم کئے ہوئے ہے۔

لیکن کوئی خود اپنے اوپر کسی کا حق قائم نہیں کرتا۔ بڑا بھائی چاہتا ہے کہ چھوٹے اس کے لئے خادم بن کر کام کریں مگر وہ چھوٹوں کے لئے ایثار نہیں کرتا۔ اولاد چاہتی ہے کہ والدین اولاد کی توقعات پوری کریں۔ مگر اولاد والدین کے حقوق پورے نہیں کرتی۔ ہر طرف خود غرضی کا مہیب دیو منہ کھولے کھڑا ہے۔ اس غلط طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی شخص اس ہستی سے تعلق قائم نہیں کرتا۔ جو فی الواقع اس بات پر قادر ہے کہ روزانہ لاکھوں خواہشات پوری کرسکتی ہے۔ اللہ کے لئے یہ بالکل معمولی بات ہے۔ روزانہ ایک لاکھ خواہشات پورا کرنا بھی اس کے لئے مشکل نہیں ہے۔ اتنا بڑا اللہ جو ہماری ایک کروڑ خواہشات بھی پوری کرسکتا ہے۔ ہم اس سے ایک خواہش بھی پوری نہیں کرانا چاہتے۔ مخلوق مخلوق کی محتاج بن گئی ہے۔

روحانیت کا منشا یہ ہے کہ مخلوق مخلوق کے کام آئے۔ مخلوق مخلوق سے توقع نہ رکھے۔ مخلوق صرف اپنے رب سے توقع قائم کرے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ بغیر غرض کے اپنی مخلوق کی خدمت کررہا ہے۔ اسی طرح بندے بھی بغیر غرض کے اللہ کی مخلوق کے کام آئیں جب یہ صورت کسی انسان کے اندر پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق کی خدمت اس طرح کرے جس طرح اللہ اپنی مخلوق کی خدمت کررہا ہے تو اللہ خوش ہوتا ہے اور اس بندے کو اپنی گود میں بٹھا لیتا ہے۔ آپ لوگ مخلوق سے توقعات قائم کرکے اللہ کی قربت سے محروم نہ ہوں۔

مخلوق سے رشتہ قائم رکھو۔ توقعات توڑ دو۔ مخلوق سے رشتہ نظام کا ایک حصہ ہے۔ لیکن مخلوق سے توقعات قائم رکھنا اللہ کو ناپسندیدہ ہے۔ اس لئے کہ سارے وسائل جو مخلوق کی معرفت آپ کو ملتے ہیں وہ سب اللہ نے تخلیق کئے ہیں۔ سلسلہ عظیمیہ کی تعلیمات کی روشنی میں ہم سب پر فرض ہے کہ ہم اللہ کی مخلوق کی خدمت اس طرح کریں کہ نہ صلہ وستائش کی تمنا ہو اور نہ مخلوق سے کوئی توقع ہو۔

آپ سب لوگ دور دراز سے تشریف لائے۔ آپ نے میرے لئے، حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے لئے ایثار کیا۔ اپنے وقت کا ایثار کیا۔ اپنے پیسے کا ایثار کیا۔ اپنے آرام و آسائش کا ایثار کیا۔ میں آپ کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس ایثار کو قبول فرمائے۔ ہم سب مخلوق کے ساتھ توقعات وابستہ کرنے کے عمل سے آزاد ہوجائیں۔ ہماری توقعات کا محور صرف اللہ کی ذات ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا ہے کہ میرے بچوں کی روحانی ترقی جتنی ہونی چاہیئے تھی نہیں ہوئی، روحانی ترقی محدود اس لئے ہے کہ اپنے مرشدِ کریم سے محبت تو بہت ہے، ایثار بھی ہے لیکن انا کے خول میں بند ہیں۔

اقتدار کا عفریت لپٹا ہوا ہے۔ پیرو مرشد کو دیکھنے کا شوق تو بہت ہے مگر مرشد کے علوم سیکھنے کا ذوق کم ہے۔ سلسلہ عظیمیہ کے تمام کارکنان، میرے دوست، میرے بچے، میری بہنیں اور بیٹیاں سب پر لازم ہے کہ مراقبہ ضرور کریں چاہے کچھ ہو جائے۔ مراقبہ میں کوتاہی نہ کریں۔ اس سلسلے کے اسباق پڑھیں۔ قواعد وضوابط پر عمل کریں۔ ان اغراض و مقاصد اور قواعد وضوابط کو بار بار پڑھیں یاد کرلیں اور ان کی روشنی میں اپنی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالیئے۔

غصہ نہ کریں، منافقت نہ کریں کیونکہ منافق بندہ روحانی نہیں ہوتا اور منافقت یہ ہے کہ آپ سارے دن میں ۱۰۰ مرتبہ یاحیی یاقیوم بھی نہ پڑھیں۔

شک نہ کریں۔ کیونکہ جس بندے کے اندر شک ہے وہ کبھی متقی نہیں ہوسکتا اور جو متقی نہیں وہ اللہ کو نہیں دیکھ سکتا۔ دنیا سے محبت نہ کریں۔ اس سے بڑی بے وفا چیز کوئی نہیں ہے۔ آپس میں محبت کرو، ایک دوسرے کو بہن بھائیوں کی طرح چاہو، کسی کی برائی نہ کرو، چغل خوری اور غیبت نہ کرو، کسی کا حق نہ مارو، جو تم کسی کے لئے کر سکتے ہو وہ کرگزرو اللہ کے لئے خرچ کرو، اللہ بہت دے گا، خرچ کرنے سے کمی نہیں ہوتی، خرچ کرنے سے نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ کنجوسی اور بخل سے دلوں میں زنگ لگ جاتا ہے۔ اس گھر کو زنگ لگنے سے بچائیں جس کو اللہ نے اپنا گھر کہا ہے۔

میری یہ باتیں آپ اپنے ذہن میں محفوظ کرلیں۔ اپنے دلوں پر نقش کرلیں۔ اپنی ڈائریوں اور رجسٹروں میں لکھ لیں کے ''سچا عظیمی، مخلص اور ایثار پسند آدمی، کبھی بھوکا نہیں رہے گا، ننگا نہیں رہے گا، کبھی بے گھر نہیں رہے گا، کبھی مفلس و قلاش نہیں ہوگا''۔

میں نہیں رہوں گا مگر میری باتیں آپ کو یاد آئیں گی۔ آپ اللہ کے دیئے ہوئے وسائل میں دل نہ لگائیں بلکہ وسائل دینے والی ذات میں دل لگائیں۔

مسلمانوں کی زبوں حالی کا المیہ یہی ہے کہ مسلمان نے اللہ کی پھیلائی ہوئی دولت کو تو اہمیت دی ہے لیکن اللہ کی اہمیت کو ختم کردیا ہے۔

اللہ کو جانیں، اللہ کو سمجھیں کیونکہ انسان کی کوئی حیثیت نہیں ہے بس اللہ ہی اللہ ہے۔ اللہ ہی اوّل ہے، اللہ ہی آخر ہے، اللہ ہی ابتداء ہے، اللہ ہی انتہا ہے، اللہ ہی ظاہر ہے، اللہ ہی باطن ہے، اللہ ہی نگاہ ہے، اللہ ہی سماعت ہے، اللہ ہی زندگی ہے اور اللہ ہی زندگی گزارنے کا شعور ہے۔

تمام کائنات کا خالق، مالک اور رازق اللہ ہے۔ اللہ ہی مردہ دلوں کو اپنے نور سے زندہ کرنے والا ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تو اللہ تھا اور جب کچھ نہیں ہوگا تو اللہ ہوگا۔

ہمیں حضور قلندر بابا اولیاءؒ اور نبی کریمؐ کے طریقوں پر چلنا ہے اور چل کر مالک و حاکم اللہ سے دوستی کرنی ہے۔ اپنی روح کو جان کر اللہ کو دیکھنا ہے، اللہ سے تعارف حاصل کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام خواتین وحضرات کو اور امتِ مسلمہ کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے۔ (آمین)

السلام علیکم!

مرشد کریم مراقبہ ہال (جامعہ عظیمیہ) تشریف لا رہے ہیں

اراکین سلسلہ عظیمیہ سے خطاب

سیشن برائے روحانی سوال وجواب

مرشدِ کریم حضور خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب کے ساتھ سلسلہ عظیمیہ کے دوستوں نے مختلف اوقات میں، مختلف مقامات پر لاہور کے اندر، ذاتی اور اجتماعی نشست و برخاست میں روحانیت کے عمیق موضوع پر اپنی فکر کو وسعت دینے کے لئے اور مرشدِ کریم کی طرز کو اختیار کرنے کے لئے ، سوالات کئے۔ جن کے جوابات مرشدِ کریم نے اپنے مخصوص انداز میں دیئے۔ نوعِ انسانی کے لئے مرشدِ کریم کے علم کا یہ ورثہ، اس کی بھلائی کے لئے عام کیا جا رہا ہے۔ قارئین کے لئے یہ سوالات اور جوابات دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ یہ تمام سوالات سلسلے کے بہن بھائیوں نے مراقبہ ہال لاہور کے زیرِ اہتمام مختلف مقامات پر کئے جن میں جامعہ عظیمیہ و مراقبہ ہال کاہنہ نو لاہور، مراقبہ ہال برائے خواتین سمن آباد، مراقبہ ہال مزنگ اور کچھ نجی تقریبات شامل ہیں۔ یہ سوالات ۱۹۹۵ء سے لیکر ۲۰۰۲ء تک کے عرصہ پر مشتمل تھے مگر کانٹ چھانٹ کر کے ان میں سے کچھ اہم سوالات اور ان کے جوابات آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین!

سوال: سلسلہ عظیمیہ کے بنیادی ڈھانچہ کے بارے میں کچھ بیان فرمائیں؟

جواب: دنیا میں تقریباً دوسو سلاسل موجود ہیں ہر خطے میں ہر ملک میں کوئی نہ کوئی سلسلہ مشہور رہا ہے برصغیر پاک و ہند میں چار سلسلے زیادہ مشہور ہیں۔ سلسلے سے مراد یہ ہے کہ ماورائی علوم کو ترتیب و تدوین کے ساتھ بیان کرنا اور بندے کا اللہ سے تعارف حاصل کرنا ہے۔ دنیا میں جس طرح اور بے شمار سلاسل موجود ہیں اسی طرح ایک سلسلہ، سلسلہ عظیمیہ ہے۔ سلسلہ عظیمیہ کی جو تعلیمات ہیں وہ ان چاروں سلاسل کے عین مطابق ہیں۔ سلسلہ عظیمیہ کی تعلیمات کو موجودہ سائنس کی توجیہات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بہت ساری باتیں ہیں کہ جو اگر اب سے پچاس سال پہلے کہہ دی جاتی تھیں تو شعور پر وزن پڑتا تھا سائنس میں نئی نئی ایجادات اور نئی نئی ٹیکنالوجی سامنے آنے سے اور فاصلے کم سے کم ہونے سے انسانی شعور میں بیداری پیدا ہوئی ہے۔ شعور میں بیداری پیدا ہونے سے ذہنوں میں وسعت آئی ہے۔ جب شروع میں پتہ چلا کہ ٹیلی فون ایجاد ہوگا تو لوگوں نے مذاق اڑایا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ پھر

ٹیلی فون بن گیا۔ اس کے بعد ریڈیو آیا لوگوں نے اس کا بھی مذاق اڑایا مذاق اڑانے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے شعور میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ وہ آنے والی ٹیکنالوجی کو قبول کر سکیں۔ پھر پتہ چلا کہ T.V آئے گا اور وہ فلاں فلاں کام کرے گا۔ جتنی مخالفت ریڈیو اور ٹیلی فون کی ہوئی اتنی ٹی وی کی نہیں ہوئی کیونکہ لوگوں کے شعور میں یہ سکت آگئی تھی کہ وہ ٹی وی کو قبول کر سکیں۔ اس کے بعد کمپیوٹر آگیا کمپیوٹر نے ڈاک کے نظام کو نہایت آسان کر دیا۔ لوگوں کے ذہنوں میں جو مادی تقاضے تھے وہ ختم کر دیئے کیونکہ موجودہ سائنسی دور نے انسانی شعور کو ترقی دی ہے۔ سائنس کے مطابق پانچ فیصد سیل دماغ کے کھلے ہیں اور باقی بند پڑے ہیں انسانی شعور کی ترقی اور وسعت کا یہ عالم ہے کہ اب تو چھوٹا بچہ بھی دلیل کے بغیر کسی بات کو قبول نہیں کرتا۔ ایک بچہ میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھا اللہ میاں کہاں ہیں ہر چیز نظر آرہی ہے یہ ریڈیو ہے یہ کرسی میز ہے یہ نظر آرہے ہیں اللہ کیوں نہیں نظر آتا۔ روحانی سلسلوں کا تعلق چونکہ اندرونی کیفیات اور ماورائی علوم کے ساتھ ہے اس لئے ان کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ وہ ہر دور میں انسانی سکت کے مطابق عوام کو، مخلوق کو، اللہ سے متعارف کرائے۔ اس لئے ایسے سلسلے کی بنیاد رکھی جائے جو سائنسی علوم کے مطابق کام کرے۔ جو پرانے تمام سلسلوں کی تعلیمات کو سائنسی علوم کی روشنی میں لوگوں تک پہنچائے۔ اس طرح عظیمیہ سلسلہ وجود میں آیا۔

سوال: اس سلسلہ عظیمیہ کے بانی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب: یہ بات یقینی ہے غیر مسلم تو اعتراض کر سکتے ہیں لیکن مسلمان نہیں کہ کوئی بھی سلسلہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی اجازت اور منظوری کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔ عظیمیہ سلسلے کے بانی کا نام سیّد محمد عظیم برخیاؔ ہے۔ سیّد محمد عظیم نام ہے اور برخیاؔ شاعرانہ تخلص ہے۔ آپ خانوادہ اہلِ بیت ہیں۔ حضرت امام حسن عسکریؒ کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت موسیٰ رضاؒ سے براہ راست فیض یافتہ ہیں۔ میں نے تقریباً (۱۶) سال ان کی خدمت میں تربیت حاصل کی اور جو کچھ ان سے سیکھا وہ اللہ کا پیغام اللہ کی باتیں لوگوں تک پہنچا رہا ہوں حالانکہ سارے درخت قلم بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائیں تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوتیں۔

سوال: کیا آپ صرف پاکستان میں ہی روحانیت کی تعلیم دے رہے ہیں؟

جواب: پاکستان کے علاوہ یورپ میں روحانیت کی بہت پزیرائی ہوئی۔ ساری دنیا میں ہمارے کل ۲۷ سینٹرز ''مراقبہ ہال'' ہیں۔ انگلش کے الگ اردو کے الگ۔ امریکہ میں چار سینٹر ہیں جہاں روحانی تعلیم دی جاتی ہے۔ امریکہ کے ہسپتالوں میں ہمارا ایک سبجیکٹ ہے ''کلر تھراپی'' اس پر کام ہورہا ہے۔ وہاں وہ کلر تھراپی کے ذریعے مریضوں کا علاج

کرتے ہیں۔ وہاں ریڈیو ٹی وی میں ہمارے سلسلے اور کام کو کافی کوریج دی جاتی ہے۔

سوال: کیا روحانیت کو بطور Subject سکولوں یا کالجز میں پڑھانا چاہیئے؟

جواب: ''سن فورڈ'' یونیورسٹی میں انہوں نے ہم سے سلیبس مانگا تھا جو ہم نے انہیں دے دیا وہ منظور بھی ہو چکا ہے اور انشاء اللہ دسمبر میں کلاسز شروع ہو جائیں گی۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے کہ یہاں کلاسز ہونی چاہئیں تو بھئی ہونی تو چاہئیں لیکن نہیں ہو رہی حالانکہ یہاں بھی ضرورت ہے۔ بے سکونی یہاں بھی ہے یورپ میں بھی ہے۔ لیکن فرق ہے نالج کا نالج وہاں زیادہ ہوگا جہاں تعلیم ہوگی جہاں تعلیم ہوگی وہاں ہر چیز میں ترقی ہوگی جبکہ پاکستان میں ابھی بہت سے مسائل ہیں جو کہ تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہیں۔ یہاں تو ابھی روٹی کپڑا مکان کے مسائل سے نہیں نکل سکے۔ یہاں تو لوگوں کے گھریلو مسائل ہی ختم نہیں ہوتے کہ وہ کسی اور طرف توجہ دیں۔ پاکستان میں میرے پاس جو لوگ مسائل لے کر آتے ہیں وہ یہ ہوتے ہیں کہ شادی بیاہ نہیں ہو رہے۔ بچے نافرمان ہیں، نوکریاں نہیں مل رہیں، میاں بیوی کے جھگڑے وغیرہ۔ جہاں پر لوگ ان مسائل سے آزاد نہیں تو وہ روحانیت پر کیا توجہ دیں گے نہ ہی سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اب نوجوان طبقہ ہے وہ تعلیم یافتہ ہے اور روحانیت کو سمجھتا ہے اور اس کی طرف توجہ دے رہا ہے۔

سوال: کیا روحانیت سیکھنے کے لئے تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے؟

جواب: جی ہاں گریجویٹ ہونا ہر شعبے کے لئے بہت ضروری ہے اور روحانیت کے لئے تو تعلیم یافتہ ہونا بہت اہم ہے۔ کم از کم بی۔ اے ضرور کیا ہو۔ شروع شروع میں جب ہم نے کم تعلیم یافتہ افراد کو روحانیت کی تعلیم دینا شروع کی تو وہ نہیں چل سکے صرف اپنی کم علمی کی وجہ سے کچھ سمجھ ہی نہ سکے۔ سائنس کے طالب علم ہماری بات زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ بھئی جہاں آپ کی پی ایچ ڈی ختم ہوتی ہے وہاں سے روحانیت شروع ہوتی ہے یعنی پی ایچ ڈی کرنے والا روحانی اسباق آسانی سے سمجھ جاتا ہے اور اس کے علاوہ روحانیت سیکھنے کے لئے ذہنی صلاحیت ہونی چاہیئے اور دلچسپی ہونی چاہیئے۔ جب تک کسی بھی چیز میں آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوگی آپ کچھ نہیں سیکھ سکتے اور یہ آپ کی اپنی طرز فکر پر منحصر ہے کہ آپ سیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔

سوال: کیا ہر شخص روحانی علوم سیکھ سکتا ہے؟

جواب: مرد عورت ہر شخص روحانی علوم سیکھ سکتا ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ ہر شخص خواہ ہندو ہو یا مسلم یا کوئی اور مذہب رکھنے والا جس طرح میٹرک کر سکتا ہے، بی۔ اے کر سکتا ہے یا پی۔ ایچ۔ ڈی کر سکتا ہے اسی

طرح روحانی علوم بھی سیکھ سکتا ہے لیکن جو شخص اسلامی دائرہ کار میں روحانی علوم سیکھے گا اس کا تعلق براہ راست قرآن سے ہوگا۔ دوسرے لوگ یعنی دوسرے مذہب کے لوگ جو علم سیکھیں گے وہ روحانی علوم تو ہوں گے لیکن انہیں اسلامی روحانی علوم نہیں کہیں گے۔ مثلاً ایک ہندو اور ایک مسلم نے ایک ہی جگہ سے میٹرک کیا ہے دونوں تعلیم یافتہ تو کہلائیں گے لیکن ہندو کو مسلم اور مسلم کو ہندو نہیں کہہ سکتے ہیں وہ دونوں اپنی تعلیم کو اپنے مذاہب کے مطابق استعمال کریں گے۔

سوال: سائنس کا علم اور روحانیت کا علم یہ کیا ہے؟

جواب: سائنس ایک ایسا علم ہے جو انسانی دماغ کو روشن بنا دیتا ہے اور روحانیت ایسا علم ہے جو انسان کے روشن دماغ کو غیب سے متعارف کرواتا ہے غیب کی دنیا سے روشناس کر دیتا ہے اپنی اصل سے واقفیت کر دیتا ہے۔

سوال: یہ فرمائیں کہ خود سپردگی کیا ہے مرید کیسے اپنے آپ کو مراد کے حوالے کرے؟

جواب: جب کوئی طالب علم استاد کی شاگردی میں آتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے پڑھو! الف ب، بے جیم وغیرہ وغیرہ بچے کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ الف، بے، جیم کیا ہے وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے وہی کچھ سیکھتا ہے جو کچھ اسے استاد سکھاتا ہے۔ لیکن یہی طالب علم اگر الف، بے، جیم کو قبول نہ کرے تو وہ علم نہیں سیکھ سکتا۔ مفہوم یہ ہے کہ بچے کی لاعلمی اس کا علم بن جاتا ہے وہ بحیثیت شاگرد استاد کی رہنمائی قبول کر لیتا ہے اور درجہ بدرجہ علم سیکھتا چلا جاتا ہے۔ ایک آدمی جو باشعور ہے اور وہ کسی نہ کسی درجہ میں دوسرے علوم کا حامل بھی ہے۔ جب روحانیت کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی پوزیشن بھی ایک بچے کی ہوتی ہے۔ روحانیت میں شاگرد کو مرید اور استاد کو مراد کہا جاتا ہے۔ مرید کے اندر اگر بچے کی افتادِ طبیعت نہیں ہے تو وہ مراد کی بتائی ہوئی کسی بات کو اس طرح قبول نہیں کرے گا جس طرح بچہ الف، بے، جیم کو قبول کرتا ہے۔ چونکہ روحانی علوم میں اس کی حیثیت ایک بچے سے زیادہ نہیں ہے اس لئے اسے وہی طرز فکر اختیار کرنا پڑے گی جو بچے کو الف، ب، ج یم سکھاتی ہے۔ مطلب یہ کہ خود سپردگی کے بغیر انسان روحانیت نہیں سیکھ سکتا ہے۔ کسی علم کو سیکھنے میں صرف یہ طرز فکر کام کرتی ہے کہ استاد کے حکم کی تعمیل کی جائے اور استاد کی تعمیل حکم یہ ہے کہ لاعلمی اس کا شعار بن جائے۔ روحانی طالب علم کو کچھ سیکھنے کے لئے ہر حال میں پہلے اپنے علم کی نفی کرنی پڑتی ہے اور جیسا مراد مرید سے کہے مرید کو ویسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک مقولہ ہے کہ گرد جو کہے وہ کرو، گرد جو کرے وہ نقل نہ کرو۔

سوال: روحانی علوم کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟

جواب: روحانیت کوئی نیا علم نہیں ہے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ آدم علیہ السلام سے انسانوں میں منتقل ہوئی ہے نئی چیز یا نئی بات تو کچھ بھی نہیں بس ذرا سمجھنے کی بات ہے۔ اب اگر آپ ایک اچھا گلاس یا پیالہ بنا لیتے ہیں تو اس سے پانی کی تسکین ختم تو نہیں ہو جاتی بھئی پانی تو ہاتھوں سے بھی پیا جا سکتا ہے مطلب یہ کہ دنیا کتنی بھی ترقی کرے لیکن اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنی طرز فکر کو اللہ کی جانب ہی موڑنا ہے اپنی اصل کو اپنے اندر ہی تلاش کرنا ہے۔ علم کوئی بھی نیا نہیں ہوتا پہلے سے موجود ہوتا ہے اور نئی نئی صورت میں سامنے آتا ہے۔ بات صرف تفکر کرنے کی ہے۔ اب اڑن کھٹولا ہی لے لو کتنی پرانی چیز ہے لیکن اب اس کی نئی شکل ہوائی جہاز بھی تو ہے اور جو آج کل ہم ٹی وی دیکھ رہے ہیں اور اس میں نئے نئے پروگرام دیکھ رہے ہیں تو یہ بھی بہت پرانی چیز ہے۔ اہرام مصر سے وہ جو ایک ڈبہ ملا ہے ٹی وی جیسا وہ کیا ہے؟ بھئی سوچنے کی بات ہے ناں۔ نئی تو کوئی بھی چیز نہیں کوئی علم نیا نہیں سب پرانے ہیں۔ روحانی علوم سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ورثہ ہیں یہ علوم سینوں میں پلتے رہے۔ اصحاب صفہ کو سیدنا حضور ﷺ خود ان علوم کی تربیت دیتے رہے اب ان کے ورثا کے ذریعے یہ تعلیمات جاری ہیں اور جاری رہیں گی۔

سوال: ''غصہ'' آپ کی اکثر تحریریں اس اہم نکتے کے گرد گھومتی ہیں غصہ کیوں آتا ہے؟ اور اس کو کنٹرول کیسے کیا جائے؟ جبکہ ایسی صورت حال میں بندہ یہ بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ناپسند فرماتے ہیں اور سیدنا حضور ﷺ بھی ناپسند فرماتے ہیں اور غصے کی حالت بدستور قائم ہے؟

جواب: غصے کا تعلق خون میں ارتعاش سے ہوتا ہے۔ کسی بات سے جب ناگواری پیدا ہوتی ہے تو اس کی جو وائبریشن ہے اس نے دماغ کے ان خلیوں کو چھیڑ دیا جو خلیے خون کو اعتدال میں رکھتے ہیں چونکہ اعتدال نہیں رہا اس لئے غصے میں دورانِ خون بھی بڑھ جاتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو ایک بات آپ کو یہ نظر آئے گی کہ کائنات میں اعتدال ہے۔ ہر چیز میں توازن ہے معین مقداریں ہیں۔ مثلاً ناک ہے تو انسان کی ناک کی الگ معین مقداریں ہیں جانوروں اور پرندوں کی ناک کی الگ معین مقداریں ہیں۔ مطلب یہ کہ نظام قدرت میں توازن ہے۔ غصے کا عمل ایسا ہے کہ سوچ میں جو توازن ہیں اس میں گڑ بڑ ہو جاتی ہے۔ خون کا جو کام ہے کہ صحت مند اجزاء یا عناصر کو متوازن رکھنا تو غصے کی وجہ سے وہ بیلنس ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان اس غصے کی حالت میں جو بات کرتا ہے یا فیصلے کرتا ہے تو وہ غلط ہو جاتے ہیں اور پھر انسان ساری عمر پچھتاتا ہے۔ اس لئے سیدنا حضور ﷺ نے غصے سے منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ جو لوگ غصہ نہیں کرتے اور معاف کر دیتے ہیں تو ایسے احسان کرنے والے بندے کو اللہ دوست

رکھتا ہے۔غصہ کرنے والا آدمی اللہ کی محبت سے محروم ہو جاتا ہے۔ غصے میں قربانی اور ایثار میں بہت فرق ہے۔ اس کی مثال حضرت علیؓ کا وہ واقعہ ہے جس میں آپ ایک یہودی سے لڑ رہے تھے یہودی کو حضرت علیؓ نے پچھاڑ دیا اور اس کے سینے پر چڑھ گئے۔ اس یہودی نے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ کو غصہ آگیا تو آپ نے فرمایا یہودی سے کہ جا میں تجھے آزاد کرتا ہوں کیونکہ میں اللہ کے لئے لڑ رہا تھا تم نے مجھ پر تھوک دیا اور مجھے غصہ آگیا اگر میں ایسی حالت میں تجھے قتل کر دیتا۔ تو یہ میرا ذاتی عمل ہوتا یہودی حضرت علی کی باتیں سن کر مسلمان ہوگیا۔ عام قدریں یہ رائج ہیں کہ اگر کوئی تھوک دے تو آدمی غصے میں آجاتا ہے۔ یاد رکھئے! غصہ ہمیشہ وہاں آتا ہے جہاں اقتدار کی خواہش ہو اور انسان خود کو منوانا چاہتا ہو۔ اقتدار اللہ کے علاوہ کسی کو زیب نہیں دیتا۔ بیوی اس لئے غصہ کرتی ہے کہ خاوند اسے مانے، خاوند اس لئے غصہ کرتا ہے کہ یہ بیوی میری کنیز ہے۔ غصہ ختم کرنے کا جو طریقہ روحانی لوگ بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے اندر سے اقتدار کی خواہش ختم کریں اور اقتدار اعلیٰ صرف اور صرف اللہ کو مان لیا جائے۔ دل سے مانا جائے کہ ہم تو اللہ کے بندے ہیں غلام ہیں۔ بھئی ڈیوٹی کرنے والے، کام کرنے والے ملازم ہی ہوئے ناں تو ہم سب اللہ کے ملازم ہیں اور ایک ملازم کو آقا کے سامنے غصہ کرنا زیب نہیں دیتا۔ ایک بات یہ کہ غصہ کرنے والے لوگوں کا رنگ جل جاتا ہے کالا ہو جاتا ہے۔ خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے اور کرختگی آجاتی ہے۔ ہنسنے، بولنے خوش رہنے والے آدمی کے چہرے پر ملائمت ہوگی شگفتگی ہوگی۔ اب ایک آدمی خوب گورا چٹا ہے لیکن غصے کی وجہ سے وہ اچھا نہیں لگے گا اور چہرہ بے رونق ہو جائے گا بلکہ چہرے پر کرختگی آجائے گی۔ جبکہ ایک آدمی معمولی شکل وصورت کا ہے میری طرح اور وہ غصہ نہیں کرتا خوش رہتا ہے تو اس کے چہرے پر کشش نظر آئے گی اور اس کا چہرہ اچھا لگے گا۔ تو بھئی آپ خوش رہیں اور ماحول کو خوش گوار رکھیں اور غصے کو اپنے اندر سے ختم کریں۔

سوال: سلسلہ عظیمیہ کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں؟

جواب: بھئی یہ جو سلسلہ ہے عظیمیہ اس کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ''خدمتِ خلق'' بغیر کسی صلہ و ستائش کے بغیر کسی مطلب کے۔ دوسرے یہ کہ سائنسی علوم کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کو پوری نوع کو ایسا لٹریچر فراہم کرنا کہ جس کی بنیاد پر پوری سائنس اور روحانیت ایک ہو سکے۔ ہمارا پیغام خدمتِ خلق کرنا، خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنا ہے۔ تمام نوعِ انسانی کو سکون آشنا زندگی کی ترغیب دینا ہے۔ آپ کسی عظیمی بہن یا بھائی سے ملئے جو عظیمی سلسلے میں کم از کم تین سال گزار چکا ہو تو اس کے اندر آپ کو سب سے پہلے محبت نظر آئے گی۔ انسانوں، پرندوں، جانوروں، پھولوں، درختوں ہر چیز سے محبت نظر آئے گی۔ دوسرا آپ اس کی باتوں سے اندازہ لگالیں گے کہ اس کو اللہ کی قربت حاصل

ہے۔ کیونکہ سلسلے کے جو بنیادی بزرگ ہیں بڑے ہیں انہیں حضورﷺ کی نسبت سے اللہ کا قرب حاصل ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس سلسلے میں آنے کے بعد نشئی لوگ نشہ کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک نشئی آدمی جب اس سلسلے میں شامل ہوا تو اسے ایسا ماحول یہاں ملا کہ اس کی احساس محرومی ختم ہو گئی۔ احساس محرومی ختم ہوئی تو اس نے نشہ کرنا چھوڑ دیا۔ یہاں آ کر اسے روحانی سکون ملا۔ روحانیت ایسی چیز ہے کہ اگر اسے قرآن و حدیث کی روشنی میں استعمال کیا جائے تو معاشرے کی برائیاں دور ہو سکتی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ لوگ مخالفت بہت کرتے ہیں۔ سمجھتے نہیں مخالفت کرنے والوں میں پچاس سال سے اوپر کے لوگ ہیں۔ مخالفت کرنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ انہیں بات سمجھ نہیں آتی۔ لیکن نوجوان طبقہ نے اسے قبول کیا ہے اور سمجھا ہے۔ آپ کسی عظیمی نوجوان سے پوچھیں کہ انہیں روحانیت میں یا اس سلسلے میں آ کر کیا ملا تو جواب ملے گا سکون ملا، اعتماد ملا، شک و شبہ کی زندگی سے نجات ملی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں ہر چیز کے بارے میں علم ملا ایسا علم جو شاید ہمیں اور کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔

سوال: روحانیت سیکھنے کے لیے چلّے، مجاہدے اور ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے بعض حضرات جنگلوں کا رخ بھی کرتے ہیں تو یہ سب لوگوں کی معاشی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں؟

جواب: آپ کوئی بھی علم سیکھنا چاہیں اس میں ریاضت و مجاہدہ کی لازماً ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی بچہ جب اسکول جاتا ہے صبح سویرے بیدار ہوتا ہے، تیار ہوتا ہے، اسکول جاتا ہے وہاں دوپہر تک کلاس میں رہتا ہے۔ تپتی دھوپ میں گھر آتا ہے۔ بعض اوقات گرمی سے نڈھال ہو کر بچے گھر آ کر چارپائی پر گر جاتے ہیں اور اگلی صبح پھر یہی عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ عمل ریاضت و مجاہدہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ہماری ماں بہن سخت سردی یا شدید گرمی میں بچے کے لیے روٹی پکاتی ہیں کپڑے دھوتی ہیں گھر صاف کرتی ہیں تھک کر بے حال ہو جاتی ہیں یہ بھی ریاضت ہے۔ جب ہم کوئی بھی کام ریاضت یا محنت کے ساتھ سیکھتے ہیں یا کرتے ہیں تو اس کے لیے دنیا کے باقی کام چھوڑ تو نہیں دیتے اسلام کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دو گناہ معاف نہیں کرتا ایک شرک اور دوسرا حقوق العباد۔ جو آدمی گھر بار چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل جائے تو یہ اس نے حق تلفی کی اور حق تلفی شرک کے برابر ہے۔

جو شرک کرتا ہے وہ روحانیت کبھی نہیں سیکھ سکتا۔ یہ اصل میں بہت بڑی سازش ہے۔ سازش کے تحت ایک گروہ نے تصوف کو بدنام کیا ہے کہ یہ دنیا بیزار ہوتے ہیں۔ تو ایسی کوئی بات نہیں۔ جن بزرگوں سے تمام سلسلے چلے ہیں آپ ان کے بارے میں پڑھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ان بزرگوں نے شادیاں بھی کیں اور معاشی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ تصوف میں یا روحانیت میں سیدنا حضورﷺ سے بڑھ کر تو کوئی نہیں ہے۔ آپؐ نے شادیاں بھی کیں،

کاروبار بھی کیا بچوں کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں آپ کوئی جنگل میں تو نہیں گئے۔ اب میں اپنے بچوں کی ذمہ داریاں نبھا چکا ہوں سب بچے اپنے اپنے کاروبار سے ہیں۔ میں چاہوں تو جنگل کو نکل جاؤں یا داتا کے مزار پر بیٹھ جاؤں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ دنیا بیزاری تو شرک ہے۔

سوال: آپ کا مشن کیا ہے اور اس کے تقاضے بیان فرمادیں؟

جواب: روحانی مشن چلانے کے لیے آپ کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ ہو۔ دنیاوی مفاد نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایثار و قربانی اور خلوص کا جذبہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے اندر برداشت ہو صبر تحمل ہو۔ آدمی کے اندر معافی کا خانہ بہت زیادہ ہو اور روحانی مشن چلانے والے کے اندر یہ بات ہو کہ جو باتیں وہ دوسروں سے چاہتا ہے وہ لازماً اس کے اپنے اندر ہوں۔

ایک چیز یہ کہ دیوانگی ہونی چاہیئے وہ یہ نہ دیکھے کہ دن ہے کہ رات ہے اور دوسروں کے سامنے اپنا آرام بھی قربان کردے۔ دیوانگی سے اپنی ذات کی نفی کردے۔ ایک دفعہ میرا ایک چرچ میں پروگرام تھا مجھے بخار ہوگیا۔ ۱۰۲ بخار تھا میں نے کہا پھر پتہ نہیں موقع ملے یا نہ ملے مجھے لے چلو۔ گاڑی میں ڈال کر مجھے لے گئے۔ پروگرام کے بعد میں بے ہوش ہوگیا کوما میں چلا گیا۔ مجھے ۱۰۷ بخار ہوگیا۔ چار دن بعد جب ٹھیک ہوا تو مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا۔ اچھا تو میں نے ہونا ہی تھا بخار تو مجھے ویسے بھی ہوسکتا تھا تو مجھے ساری زندگی اس بات کا قلق رہتا اگر میں پیغام نہ پہنچا سکتا۔ مرا تو پھر بھی نہیں۔ یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں دیوانگی کی ایک جھلک ہے اور حضور اکرمؐ کی جو زندگی ہے مشن کے لحاظ سے تو وہ مکمل مشعلِ راہ ہے اور اس کے لیے میں نے ایک کتاب لکھی ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ مشن کے بارے میں ہے ضرور پڑھئے گا۔ روحانیت کے سلسلے میں میرا پیغام خاص طور پر خواتین کے لئے ہے کہ وہ کسی بھی معاملے میں اپنے آپ کو کم تر نہ سمجھیں۔ روحانیت میں وہ مردوں کے برابر بلکہ ان سے زیادہ بلند مقام حاصل کرسکتی ہیں اور مردوں کو چاہیئے کہ عورت کی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

سوال: اسپرٹ Spirit اور مائنڈ Mind میں کیا فرق ہے۔ ان کی حدود کیا ہیں اور مائنڈ پاور فل ہے یا اسپرٹ؟

جواب: انفارمیشن اور انفارمیشن کی سورس Source of Information پر ساری کائنات قائم ہے۔ دماغ (مائنڈ) کی حیثیت انفارمیشن یعنی اطلاع کی ہے اور روح اس اطلاع کی ماٰخذ اور منبع (Source) ہے۔ اگر ماٰخذ ہی نہ ہو تو اطلاع نہیں ہوگی۔ روح، اسپرٹ یا Soul پوری زندگی کی دستاویز ہے۔ پوری زندگی کا ریکارڈ ہے۔ اس

دستاویز سے دماغ اطلاعات اخذ کرتا ہے اور آگے بڑھا دیتا ہے۔ ہر آدمی میں پڑھنے لکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک آدمی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ دوسرا آدمی ایک کلاس بھی نہیں پڑھتا۔ اب جس نے نہیں پڑھا۔ اس کے لئے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں صلاحیت نہیں تھی۔ اس نے اس لئے نہیں پڑھا کہ دراصل اس نے سورس آف انفارمیشن سے اپنے دماغ میں کچھ منتقل ہی نہیں کیا۔ اس لئے اس کا مظاہرہ بھی نہیں ہوا۔

سوال: روحانی علوم سیکھنے کے لئے مراقبہ کے علاوہ کوئی اور آسان راستہ ہو تو بتائیں؟

جواب: مراقبہ کوئی مشکل عمل نہیں ہے۔ مراقبہ روحانیت سیکھنے کا آسان ترین راستہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی پیغمبر گزرے ہیں سب ہی نے مراقبہ کیا ہے۔ مراقبہ ایک اصطلاحی نام ہے جس کا مطلب ہے غور کرنا، تفکر کرنا یعنی کسی بھی چیز کی بابت یکسوئی اور مرکزیت کے ساتھ سوچ بچار Concentration کرنا۔

قرآنِ حکیم میں سات سو چھپن آیات تفکر، غور و فکر اور تدبّر سے متعلق احکامات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان ساڑھے سات سو آیات میں کائنات پر غور کرنے، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر تفکر کرنے اور اس قسم کی باتوں پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ چاند کیا ہے؟ سورج کیا ہے؟ کہکشانی نظام کیا ہیں؟ آپ اپنے گھر میں پانی پر تفکر کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے بنایا ہے؟ باغ میں جا کر مختلف پھولوں پر تفکر کر سکتے ہیں کہ ایک ہی قطعہ زمین و یکساں مٹی سے ایک جیسے پتوں اور مختلف رنگوں و خوشبو والے پھول کیسے نکل آئے! اس تفکر و غور و فکر کرنے کا اصطلاحی نام مراقبہ ہے۔ مراقبہ میں آنکھیں بند کرنے کے لئے اس لئے کہا جاتا ہے کہ آنکھیں بند کرنے سے یکسوئی جلدی ہو جاتی ہے۔ سائنسی ایجادات غور و فکر ہی کا تو نتیجہ ہیں۔ اگر روحانی عالم غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں تو کہا جاتا ہے مراقبہ کہاں سے آگیا؟ میرے عزیز بھائی! کیا شریعت نے سوچنے، غور و فکر کرنے اور تفکر کرنے سے منع کیا ہے؟

سوال: سلسلہ عظیمیہ کس مسلک سے ہے اور چار سلسلوں میں کس سے وابستہ ہے؟

جواب: سلسلہ اور مسلک میں فرق ہوتا ہے۔ مسلک کا تعلق فقہ سے ہے اور سلسلہ روحانی تعلیمات کا اسکول ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب تک دنیا میں دو سو سلاسل اس بنیاد پر قائم ہوئے کہ جیسے جیسے نوعِ انسانی کے شعور نے ترقی کی اسی مناسبت سے سلسلے کے اسباق مرتب ہوئے۔ مثلاً آج کے دور میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعورِ انسانی بالغ ہو گیا ہے۔ جیسے جیسے قوموں کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے ان کے لئے راستے متعین ہوتے رہتے ہیں اور یہ بات قرآن حکیم کے عین مطابق ہے۔ ”جو لوگ اللہ کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ اللہ ان کے لئے اپنے راستے کھول دیتا ہے“۔

سلسلہ عظیمیہ نے انسانی شعور کی پختگی اور سائنسی علوم کی پیش رفت کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے اسباق مدون کئے ہیں جن سے انسان روحانی علوم سیکھ سکتا ہے۔ مثلاً لوحِ محفوظ کو فلم، پروجیکٹر یا ٹی وی اسٹیشن کی مثال دے کر آسانی کے ساتھ سمجھایا جاسکتا ہے یا روح کے متعلق کمپیوٹر کی مثال دی جاسکتی ہے۔

سوال: کیا روح کو جانے بغیر بھی زندگی کا مقصد پورا ہوسکتا ہے؟

جواب: آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ روح کو جانے بغیر دنیا کا مقصد تو پورا ہو جاتا ہے لیکن زندگی کا اصل مقصد روح کو جانے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ اب اگر آپ کا یقین ہے کہ اس دنیا کے بعد بھی دوسرا عالم ہے تو جب تک آپ روح کو نہیں جانیں گے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مرنے کے بعد روح ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ گدھے اور انسان میں یہ فرق ہے کہ انسان روح کو جان لیتا ہے اور گدھے کو اللہ نے یہ صلاحیت نہیں دی کہ وہ روح کو جان سکے۔ صلاحیت ہونے کے باوجود بھی آدمی روح کو نہ جانے تو کیا ہوا؟ انسان کا تو مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ وہ اپنی روح کو جان لے اور اپنی روح کو جان لینے کے بعد اپنے رب کو پہچان لے۔ اب اگر کوئی شخص عرفان ذات اور عرفانِ الٰہی کے بغیر مرتا ہے تو مرنے کے بعد کی زندگی جو بہت ہی لمبی، طویل اور نہ ختم ہونے والی ہے، بہت عذاب میں گزرتی ہے۔

سوال: جدید نفسیات نے اتنی ترقی کی ہے کہ شعور، لاشعور اور تحت لاشعور کے مختلف درجات بیان کر دیئے ہیں۔ کیا روحانیت میں بھی شعور، لاشعور اور تحت لاشعور ہوتے ہیں؟

جواب: ان باتوں سے روحانیت کا دامن کبھی خالی نہیں رہا۔ بات صرف اتنی ہے کہ انسانی شعور کمزور تھا۔ بات سمجھانے کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب جدید علوم میں پیش رفت ہونے اور سائنسی ایجادات سامنے آنے کے بعد روحانی معاملات سمجھنے اور سمجھانے میں بہت آسانی اور سہولت ہوگئی ہے۔ مثلاً بجلی، ریڈیو، ایٹم کی تھیوری، لہروں کا نظام، کمپیوٹر وغیرہ کی مثالیں انسانی ذہن کو بات سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔ اسی طرح زمین کے طبقات اور ان کے رنگ بتا دیئے گئے ہیں۔ اب اس بات کو کون مانے گا کہ زمین کو ایک گائے نے اپنے سینگوں پر اٹھا رکھا ہے اور سینگ بدلنے سے زلزلہ آتا ہے۔ سارا قرآن روحانیت ہے۔ قرآن کو ایک ارب مسلمان جانتے اور مانتے ہیں مگر قرآن کریم کی روح سے واقف نہیں اسی لئے ذلیل و خوار ہیں۔ ہمارے اسلاف چونکہ قرآنِ حکیم کی روح سے واقف تھے اس لئے ساری دنیا پر حکمران تھے۔ مسلمان اور مومن الگ الگ بات ہے۔ جو روحانیت سے واقف ہوتا ہے وہ موحد ہو جاتا ہے مشرک نہیں رہتا۔ الحمد للہ میرے شاگردوں میں سوائے یہودیوں کے دیگر مذاہب کے لوگ بھی ہیں۔ ایک

بار ایک ہندو شاگرد نے میرے اسباق پر ذوق وشوق سے عمل کیا جب اس نے بہت ہی زیادہ ترقی کی تو کہا کہ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں لیکن میں نے کہا کہ ابھی آپ لگے رہیں حتیٰ کہ ایک دن وہ بہت گھبرایا ہوا آیا کہ رات خواب میں کرشن جی نے کہا ہے کہ میری طرف سے خواجہ صاحب کو کہو کہ تجھے سیدھا راستہ دکھا دیں تو میں نے اس کو کلمہ پڑھا دیا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسانی ارتقاء کی تکمیل سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ہو گئی۔ لیکن ہم بحیثیت مسلمان وہ نہیں ہے جو ہمارے اسلاف تھے۔ یقیناً ہم پیچھے ہٹے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علوم اور نعمتوں سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے ہیں۔

سوال: کیا مشاہدہ ہونا ممکن ہی نہیں ہے؟

جواب: اگر ایک مقدمۂ قتل میں گواہ عدالت کو بتائے کہ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن فلاں سے سنا ہے کہ اس طرح قتل ہوا ہے تو کیا عدالت سُنی سنائی بات پر گواہی تسلیم کر لے گی؟ گواہی کے لئے لازم ہے کہ گواہ نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں تو بلا مشاہدہ گواہی کیسے قابلِ قبول ہو گی۔ قرآنِ حکیم میں آیا کہ یہ جاہل اور گنوار لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور مومن بن گئے۔ بھلا یہ مومن کیسے بن سکتے ہیں جبکہ ایمان تو ابھی ان کے قلوب میں داخل ہی نہیں ہوا۔ ہاں یہ مسلمان ضرور ہو گئے ہیں۔ ایمان کا تعلق دل کے مشاہدے اور گواہی سے ہے اور گواہی تب ہی قبول اور معتبر ہے جب آپ نے کچھ دیکھا ہو۔ یہ امر تو بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مشاہدہ ہو سکتا ہے۔

اسی بات کو دوسری طرح سمجھاتے ہوئے فرمایا ''ہماری روح عالمِ ارواح میں روزِ ازل اللہ کو دیکھ چکی ہے اللہ سے ہم کلام ہو چکی ہے۔ اس کے رب ہونے کا اقرار کر چکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی روح سے واقف ہو جائیں۔ جب ہم اپنی روح سے واقف ہو جائیں گے تو ہم ضرور اس مشاہدے کو حاصل کر لیں گے جو روح پہلے کر چکی ہے۔ نمازِ مغرب جماعت سے ادا کی گئی اور مراقبہ کے بعد مرشدِ کریم نے ہم سب ساتھیوں سے دریافت کیا کہ جیسی محنت ہم نے دنیاوی علوم کے حصول کے لئے کی ہے۔ کیا ویسی ہی تگ و دو اور محنت روحانی علوم کے حصول کے لئے بھی کی جا رہی ہے؟ سب کا جواب نفی میں تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ دنیاوی علوم میں میٹرک، انٹر اور اس کے بعد پیشہ وارانہ تعلیم کے حصول کے لئے مجموعی طور پر ۱۷ سال لگتے ہیں اور ان سترہ سالوں میں کم و بیش روزانہ دس گھنٹے محنت کی جاتی ہے۔ تب کہیں جا کر آپ ڈاکٹر، انجینئر یا اکاؤنٹنٹ وغیرہ بنتے ہیں۔ صرف میٹرک کرنے میں

پینتیس ہزار سو گھنٹہ کا وقت محنت اور اسی مناسبت سے رقم خرچ ہوتی ہے۔ تب کہیں جا کر طالب علم اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک شعبہ کا انتخاب کر سکے۔ آج کل تو میٹرک کے بعد چپڑاسی کی نوکری بھی نہیں ملتی۔ اس کے برعکس روحانی علوم کے لئے روزانہ بمشکل پندرہ بیس منٹ مراقبہ کیا جاتا ہے اور ایک دو تین چار ماہ بعد ہی شکوہ ہوتا ہے کہ ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ان چار ماہ میں بھی باقاعدہ نام کی چیز نظر نہیں آتی۔ کیا روحانی علوم جن کی افادیت اور دائرہ کار ایک دو نہیں بلکہ بے شمار عالمین کی زندگی اور نظام پر محیط ہے کیا اس کی اہمیت میٹرک سے بھی کم کر دی جائے؟ ان توجہ طلب اور فکر آموز ارشادات پر تفکر سے یہ بات زیادہ واضح انداز میں سمجھ آئی کہ روحانیت میں عمل پہلے اور علم بعد میں ملتا ہے۔ جبکہ مادیت اس کے برعکس ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اپنے مرشد کے حکم پر پوری جوانی خانقاہ میں صرف پانی بھرنے میں گزار دیتے ہیں۔ خواجہ غریب نوازؒ اتنی محنت نہ کرتے یا اس محنت کی توجیہہ جاننا شروع کر دیتے کہ میں تو روحانی علوم حاصل کرنے آیا ہوں نہ کہ پانی بھرنے یا یہ کہ پانی بھرنے کا روحانی علم سے کیا تعلق ہے۔ تو وہ یہ علم حاصل نہ کر پاتے۔ روحانیت کا پہلا سبق باادب بانصیب اور دوسرا سبق عمل ہے۔

سوال: کائنات کے مناظر اور وسائل دیکھ کر کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

جواب: اس کا نتیجہ اللہ ہے۔ سب کچھ اللہ ہے۔ اللہ وہ مصورِ کائنات ہے جس نے زمین بنائی، پہاڑ قائم کئے۔ پانی کے چشموں و دریاؤں کا نظام بنایا، درخت اگائے، پھل پھول پیدا کئے۔ پانی کو ٹھنڈا، میٹھا اور خوش ذائقہ بنایا۔ بندہ ہر ظاہری چیز کا ذکر تو کرتا ہے۔ مگر اس چیز کو بنانے والے، اللہ کا ذکر نہیں کرتا۔

علم الیقین وعین الیقین کا تقاضہ ہے کہ پسِ پردہ حقیقت سے روشناس ہو کر اپنے ہر عمل اور ذہنی حرکت کو اسی حقیقت کے تناظر میں دیکھا جائے اور اس ذات کی قلبی نسبت حاصل کر لی جائے جو ان مناظر، وسائل اور نعمتوں کا مالک ہے۔ ہمارا خالق اور ہمارا کفیل ہے۔ خود زندہ ہے اور ہمیں زندگی کو قائم رکھنے کے لئے وسائل فراہم کرنے والا حیّ و قیوم ہے اور جس کی طرف ہم کو واپس جانا ہے۔

مردِ کامل جب تربیت حاصل کر لیتا ہے تو اس کے ذہن کا یہ پیٹرن بن جاتا ہے کہ وہ کسی بھی غلطی پر فوراً استغفار کرتا ہے اور شرمندگی و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔ جبکہ عام فرد اپنی غلطی تسلیم ہی نہیں کرتا۔ روحانی لوگ غصہ اور دوسروں کی دل آزاری سے بچتے ہیں۔ روحانیت میں سب سے بڑی رکاوٹ مردم آزاری ہے۔ جس سے دل سخت ہو جاتا ہے مردم آزاری سے ہمیشہ بچنا چاہیئے۔

سوال: سائنس کہتی ہے کہ مادہ فنا نہیں ہوتا۔ جب کہ آپ نے فرمایا ہے کہ روح نکل جانے کے بعد ہمارا مادی جسم

فنا ہو جاتا ہے جبکہ روح زندہ رہتی ہے۔ ذرا اس کی وضاحت فرما دیجئے؟

جواب: انسان پیدا ہوتا ہے، مرتا ہے۔ مرنے کے بعد انسان کی شکل وصورت، جسم، سوچ حواس وہ تو ہمیں اس دنیا میں نہیں ملتے۔ وہ تو مٹی میں مل گئے مٹی فنا ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کل نفس ذائقة الموت اور ہر چیز کے اوپر فنا ہے۔ اب سائنسدان جس بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ مادہ فنا نہیں ہوتا ..... اِس بناء پر کہتے ہیں کہ انسان کا جو وجود ہے وہ مادّی عناصر سے تخلیق ہوا ہے۔ لیکن سائنس کی اس بات کو کم از کم میں تو تسلیم نہیں کرتا اس لئے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے۔ مادے سے اس کا وجود تخلیق ہوتا ہے لیکن اس مادی وجود میں اگر روح داخل نہ ہو تو مادہ متحرک نہیں ہوتا۔ اگر ماں کے پیٹ میں بچے کے اندر روح نہ آئے تو بچہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پانچ سے چھ فٹ کا مادی وجود اس دنیا میں رہتا ہے، اس وقت متحرک رہتا ہے جب اس کے اندر روح ہوتی ہے۔ جب اس میں سے روح نکل جاتی ہے تو مادّی وجود پر فنائیت طاری ہو جاتی ہے۔

سوال: عورتوں کے حقوق کا تعین مثلاً ترکہ، وراثت، آدھی گواہی اور وراثت میں آدھا حصہ کیوں ہے؟

جواب: بات دراصل صلاحیتوں کی ہو رہی ہے۔ ایک آدمی انجینئر ہوتا ہے تو ایک عورت بھی انجینئر بن سکتی ہے۔ ایک آدمی داکٹر بن جاتا ہے تو ایک عورت بھی ڈاکٹر بن سکتی ہے۔ اب رہی وراثت کی بات تو عورتوں کو وراثت میں باپ کی طرف سے بھی حصہ ملتا ہے اور شوہر کی طرف سے بھی۔ جب باپ اور شوہر دونوں کے حصوں کو آپ شامل کریں تو مرد کے برابر حصہ ہو جائے گا۔ جہاں تک گواہی کا تعلق ہے کہ دو عورتوں کی گواہی اور ایک مرد کی گواہی تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کے اوپر نفسیاتی اور طبی نقطہ نظر سے ایسے حالات گزرتے ہیں جن کا مرد کسی بھی طرح متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔ ان حالات میں ہوسکتا ہے کہ عورت کا ذہن اپنے ان مخصوص معاملات میں اُلجھا ہوا ور اس دوران اگر کوئی بھول ہو جائے تو دوسری خاتون اسے یاد دلا سکتی ہے اور یہ جو مسئلے ہیں یہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ یہ بات صحیح ہے، ہم مسائل کی طرف تو بعد میں آئیں گے پہلے تو ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا مرد اور عورت ایک ہی ذہن رکھتے ہیں، ایک صلاحیت رکھتے ہیں، ان کے اندر روحیں مختلف ہوتی ہیں یا ایک ہوتی ہیں؟..... تو جواب یہ ہے کہ روحیں سب کے اندر ایک ہوتی ہیں۔ صلاحیتیں سب کے اندر ایک سی ہیں۔

سوال: آج کل کے معاشرے میں خواتین زندگی کے ہر میدان میں طبع آزمائی کر رہی ہیں کیا اس طرح معاشرے کا نظام درہم برہم نہیں ہو رہا ہے؟

جواب: میرے خیال سے تو درہم برہم نہیں ہوا بلکہ اچھا ہوا ہے۔ ..... اور اگر کہیں درہم برہم ہوا ہے جیسے یورپ کی

آپ مثال لے سکتے ہیں تو وہ درہم برہم اس لئے ہوا ہے کہ خواتین نے اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق صلاحیتیں استعمال ہوں تو معاشرہ درہم برہم نہیں ہوگا بلکہ اچھا ہو جائے گا۔ مثلاً ایک خاتون اچھی Teacher ہے تو وہ بچوں کو اچھی طرح پڑھاتی، سکھاتی ہے، ان کی اچھی تربیت کرتی ہے۔

پیغمبرانہ طرزِ زندگی کے ساتھ خواتین جب اپنی صلاحیتوں کا استعمال کریں گی اس سے معاشرے میں سدھار پیدا ہوگا اور مرد اور عورت ایک دوسرے کو سمجھ کر ایک دوسرے کی خدمت گزاری زیادہ اچھی طرح کرسکیں گے۔

سوال: دفاتر میں عورت اور مرد کے اکٹھے کام کرنے سے مسائل کیوں جنم لیتے ہیں؟

جواب: ہمیں ایک فریم ورک Frame Work بنانا ہوگا جو کہ قرآن و حدیث کا فریم ورک ہو۔ میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ قرآن و حدیث سے ہٹ کر کوئی عورت کام کرے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت اور مرد دونوں کی حیثیت برابر برابر ہے۔ ہماری تو کوشش ہی یہی ہے کہ خواتین اپنا مقام پہچانیں۔ عہدِ نبویؐ کی خواتین نے جہاد میں حصہ لیا۔ حضور پاک ﷺ کے دور میں خواتین نے نرسنگ کی۔ صحابیاتؓ نے علمِ حدیث مردوں کو سکھایا۔

اگر پیغمبرانہ طرزِ فکر کے بغیر یا اس کے خلاف اگر ترقی ہو تو وہ ترقی ہرگز نہیں ہوتی..... بات وہی ہے کہ سب سے پہلے ہمیں قرآن پڑھنا ہے۔ قرآن سے خواتین کے حقوق تلاش کرنے ہیں۔ رسولِ پاک ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرنا ہے۔ رسول پاک ﷺ کے ساتھ ان کی ازواجِ مطہرات کی زندگی کا مطالعہ کرنا ہے۔ بس جس طرح انہوں نے (۱۴۰۰) چودہ سو سال پہلے کیا آپ بھی کریں اور جہاں تک علم سیکھنے کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر علم سیکھنا فرض ہے''۔

سوال: اسلام میں پردے کے احکامات کیا ہیں؟

جواب: پہلی بات یہ کہ نہ تو میں کوئی مفتی ہوں نہ ہی مولوی اور نہ عالمِ دین ہوں۔ میرا جو جواب ہوگا وہ ایک عالمِ دین کا نہیں ہوگا۔ کیونکہ میں ایک روحانی آدمی ہوں۔ میں نے تو آپ کو ایک Message دیا ہے کہ عورتیں پیغمبرانہ تعلیمات حاصل کریں اور اپنے حقوق کے بارے میں علم حاصل کر کے ان حقوق کو حاصل کریں اور جب تک انہیں اپنے حقوق کا علم نہیں ہوگا وہ اسی طرح ڈرتی لرزتی رہیں گی اور کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اب یہ پردہ کیا ہے یہ تو آپ کسی عالمِ دین سے پوچھیں گے تو وہی آپ کو بتائیں گے۔

میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو بیت اللہ شریف میں پردہ ہے وہی سب جگہ کا پردہ ہے۔ جیسے آپ طواف کرتے

وقت پردہ کرتے ہیں اسی طرح سب جگہ کریں۔ گھر کا جو پردہ ہے بس وہی پردہ ہے۔

سوال: عورتوں کو کیسے اسلامی تعلیمات سے آشنا کیا جائے جبکہ ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے باوجود ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے؟ ....

جواب: یہ تو ایسا ہی سوال ہے کہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں میٹرک کرنا چاہتا ہوں بتائیں میٹرک کیسے کروں؟ .... آپ جواب دیں گے اسکول میں داخلہ لینا ہوگا .... آپ نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا ہے .....

سوال: مرد اور عورت دونوں برابر ہیں تو اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی وضاحت کریں؟

جواب: ابھی چند مہینے پہلے روحانی ڈائجسٹ میں وقار یوسف صاحب نے ایک کالم لکھا تھا، اس میں اس بات کی بڑی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن پڑھنا اور سمجھنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض و بما انفقو من اموالھمo

سورۃ النساء کی ان آیات کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ "مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر افضل بنایا ہے اور اس لئے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں"۔

وقار صاحب نے لکھا تھا کہ "اس آیت کے تین حصے کئے جاسکتے ہیں: (الف) **الرجال قوامون علی النساء** (ب) **بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض** (ج) **و بما انفقو من اموالھم**۔

عربی زبان کے لفظ قوامون کا اردو زبان میں ترجمہ حاکم کیا گیا ہے۔ اس آیت میں جہاں ایک کو دوسرے پر فضیلت کا ذکر ہے وہاں صرف یہ مطلب نکالا گیا ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ حالانکہ زندگی میں بے شمار مقامات ایسے آتے ہیں جہاں پر اسلام نے عورت کا رتبہ اس قدر بڑھا دیا ہے کہ مرد اس تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ خاص طور پر جب عورت کا کردار بحیثیت ماں کے زیرِ بحث آتا ہے۔ عورت کی بحیثیت ماں اس قدر فضیلت بیان ہوئی ہے کہ جنت کو ماں کے قدموں تلے بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس آیت میں فضیلت کا ذکر اگر مرد کے لئے سمجھا جائے گا تو یہ مطلق فضیلت نہیں ہے بلکہ مرد کے کسی کردار سے منسلک اور مشروط ہے۔ بصورتِ دیگر اس کا اطلاق مختلف اوقات میں مختلف انسانوں یعنی کبھی مرد اور کبھی عورت پر ہوسکتا ہے۔

اس آیت میں آگے وہ سبب بھی بیان ہو رہا ہے جسے مرد کی فضیلت سے منسلک قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ مال خرچ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مال پاس ہو۔ مال پاس ہونے کے لئے

ضروری ہے کہ مال کمایا جائے، مال کمانے کے لئے گھر سے باہر نکل کر معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا اور جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ مرد گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے محنت ومشقت کر کے مال کما کر لاتا ہے۔ اس طرح اس کا یہ حق بنتا ہے کہ گھر کے معاملات اس کی رائے یا اس کی مرضی کے مطابق چلائے جائیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی مرد گھر کی کفالت کے لئے اپنی معاشی ذمہ داریاں پوری نہیں کرنا چاہتا اور مجبوراً اس کی بیوی، بیٹی یا بہن کو معاش کے حصول کے لئے تگ ودو کرنی پڑتی ہے...... تو پھر بھی اس کی فضیلت گھر میں قائم رہے گی؟...... بعض گھروں میں ایسی صورت حال پیش آسکتی ہے کہ گھر کے کفیل مرد کا انتقال ہو جائے یا وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر کہیں چلا جائے اور بچوں کی پرورش کی تمام تر ذمہ داری ماں پر آپڑے۔۔ اس ماں کے پندرہ سولہ سال کے لڑکے ہوں جو تعلیم حاصل کر رہے ہوں کیا ایسے گھر میں سرپرست ماں ہوگی یا مرد ہونے کی وجہ سے اس ماں کے لڑکے گھر کے سرپرست قرار پائیں گے؟...... ظاہر ہے کہ گھریلو معاملات، بچوں کے رشتہ ناطوں کا فیصلہ وہ لڑکے نہیں بلکہ ان کی ماں ہی کرے گی۔

اس آیت میں لفظ ''قوامون'' کا مطلب حاکم سمجھ لیا گیا ہے جبکہ عربی زبان کی لغات میں قوامون کے معنی ہیں، ''دوسرے کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا ذمہ دار''۔ عربی زبان کی لغت المنجد میں قوام کے یہ معنی بتائے گئے ہیں ''خوبصورت قد والا، معاملہ کا ذمہ دار وکفیل، معاملہ کی ذمہ داری کو پورا کرنے پر قادر''۔ قوام کی جمع قوامون ہے۔ ان معانی کو سامنے رکھتے ہوئے اس آیت میں غور کیا جائے تو ایک بالکل ہی مختلف صورتحال سامنے آتی ہے۔ بجائے اس کے مرد کو عورت پر حاکم قرار دے کر عورت کے درجہ کو مرد سے کم سمجھا جائے یہاں تو عورت کی سہولت کے لئے اس کے حق کی وکالت کی جارہی ہے۔ گھریلو زندگی کے حوالہ سے اس بات کی بہت اہمیت ہے۔ گھر کا نظام چلانا مرد اور عورت کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ بچوں کی پرورش ونشوونما اور گھر کی دیکھ بھال عورت کے ذمہ ہو تو اخراجات کی فراہمی سے بری الذمہ رہنا اس کے لئے بہتر ہے۔ چنانچہ ایسی صورت میں اپنی بیوی اور بچوں کے لئے اور گھر کے دوسرے زیرِ کفیل افراد کے لئے معاش کے حصول کے لئے دوڑ دھوپ اور وسائل کی فراہمی مرد کے ذمہ قرار دی گئی ہے۔

الرجال قوامون علی النساء۔ مرد عورتوں کے لئے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے ذمہ دار ہیں...... اور ایسا کر کے مرد عورت پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ عورت گھر کے اندر کی ذمہ داریاں ادا کر کے اپنا کردار ادا کرتی ہے...... اور مرد گھر کے باہر کی ذمہ داریاں ادا کر کے اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

اب ان آیات کی ترجمانی اس طرح ہو سکتی ہے کہ عورتوں کے لئے وسائل مہیا کرنے اور ان کے امور کی دیکھ بھال مردوں کی ذمہ داری ہے، کیونکہ اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی ہے۔ اور فضیلت کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ (یعنی مرد) اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گھر کے باہر کام کاج یا مال کمانا صرف مرد کا حق نہیں قرار دیا گیا عورت اگر چاہے تو وہ بھی معاشی سرگرمیوں میں حصہ لے کر مال کما سکتی ہے۔ لیکن ایسی صورتِ حال میں اسلام نے عورت کو مرد پر فضیلت دی ہے۔ وہ اس طرح کہ گھر کے اخراجات کی فراہمی مرد کے ذمہ لگائی گئی ہے لیکن عورت کے لئے ایسی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ عورت اگر اپنی کمائی میں سے مرد کو ایک پیسہ بھی نہ دے تو مرد کا اس پر کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ سورۂ النساء میں ہے:

ترجمہ:۔ ''مرد جو کچھ کمائیں ان کا حصہ ہے۔ اور عورتیں جو کچھ کمائیں وہ ان کا حصہ ہے''۔

سورۂ النساء میں فضیلت کے اس مشروط اعلان کے علاوہ کہیں بھی عورت پر مرد کی مطلق حاکمیت کا کوئی فرمان قرآن میں نہیں ملتا۔

سوال: اباجی ہم سلسلہ عظیمیہ کا پیغام کیسے دیں ہم تو چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں اور ہمیں تو تقریر وغیرہ بھی نہیں آتی؟

جواب: روحانی ڈائجسٹ پیغام کے لئے بہت مفید ہے۔ تین ماہ تک روحانی ڈائجسٹ دیں اس کے بعد اِن سے اس سلسلے میں بات کریں کہ روحانی ڈائجسٹ کیسا لگا۔ پڑھے لکھے لوگوں میں ڈائجسٹ دیں اور جو لوگ پہلی مرتبہ ملیں اِن سے روحانیت کی ابتدائی باتیں کریں۔ بڑے کے ساتھ اسٹوڈنٹ بن کر بات کریں اور اگر چھوٹا ہے تو اُستاد بن کر بتائیں اور اگر اسٹوڈنٹ آتا ہے تو اپنی خودنمائی اور علم کی دھاک نہ بٹھاؤ۔ اَن پڑھ کی بجائے پڑھے لکھے لوگوں کو بتائیں۔

کسی نے روحانی علاج کی اجازت طلب کی تو فرمایا کہ ''جب مرکز مضبوط ہو جائے گا تو پھر کام کی نوعیت کے مطابق الگ شاخ بنائی جا سکتی ہے''۔ پھر فرمانے لگے کہ ''بغیر اجازت والے مراقبہ نہ کریں اور دماغی امراض والے کو بھی مراقبے کی اجازت نہیں ہے تاکہ بعد میں نہ کہیں کہ سلسلہ عظیمیہ نے پاگل کر دیا ہے''۔

سوال: ہم ترقی میں پیچھے کیوں ہیں؟

جواب: ''چین میں اتنی ترقی ہے کہ وہاں پچیس فیصد خواتین فوجی پائلٹ ہیں اس لحاظ سے ہم ان سے دوسو (۲۰۰)

سال پیچھے ہو گئے ہیں۔ یہاں یہ ہے کہ بس علم پڑھنا تو علم ہے ہمارے پاس جو علم ہے وہ اتنا کمزور ہے کہ اگر بچوں کو انگریزی پڑھا دی تو وہ دوسرا علم ختم ہو جائے گا اس لئے پیچھے ہو گئے ہیں۔ یہ کیسا اسلام ہے جو تعلیم پر پہرے بٹھا دے۔ ہم علم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے ترقی میں بھی پیچھے ہیں۔

سوال: جمہوریت کا آج کل بہت شور ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ”تاریخ میں عوامی دور کوئی نہیں گزرا کچھ حضرت عمرؓ اور کچھ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا دور رہا۔ نظام چلانے والوں کا تمام رہن سہن تو عوام کے خلاف ہوتا ہے اس لئے کیسے عوامی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ جس نے کبھی بھوک نہ دیکھی ہو وہ نچلے طبقے کا کیا خیال رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کو پرکھ لیں کچھ بھی نہیں ہے جن لوگوں نے عوام کی خدمت کی لوگوں نے اِن کو رد کر دیا اور مرنے کے بعد اُن کے پیچھے چل پڑے، زندگی میں تو کبھی ساتھ نہیں دیا۔ دولت سے آدمی خواہ مخواہ مرعوب ہوتا ہے آپ کو چاہیئے کہ آپ اچھی سوسائٹی میں اُٹھیں بیٹھیں آپ کو سوسائٹی کے آداب آنے چاہئیں۔ لیکن دولت یا دولت مند سے کبھی مرعوب نہ ہوں۔

سوال: ہمارے کام کیوں منظور نہیں ہوتے؟

جواب: بڑے بڑے عہدیدار کوششیں بھی کرتے ہیں لیکن اللہ کی طرف سے منظور نہیں ہوتا، آرڈر نہیں ہوتا اس لئے کام نہیں ہوتا۔ جب لوگ کہتے ہیں کہ ”اللہ کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا“۔ تو یہ جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ اِن کا ذہن تو اللہ کی طرف ہوتا نہیں تمام دنیا میں رہتا ہے۔ پھر حضرت بایزید بسطامیؒ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے پاس جب کوئی سائل آتا تو تکیہ کے غلاف میں سے دو دینار نکال کر اسے دے دیتے۔ ایک دفعہ تکیہ کے غلاف میلے ہو گئے انہیں دھونے کے لئے ایک عورت کو دے دیا۔ جب وہ دھونے لگی تو دو دینار نکل آئے، اُسے مختلف خیال آنے لگے۔ وہ حضرت کے پاس چلی گئی کہا کہ یہ آپ کے ہیں فرمایا ہاں جب کبھی مہمان کا خیال آتا ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ تکیہ میں دو دینار ہیں۔

جب کبھی کسی فقیر کے پاس جاؤ خالی ہاتھ نہ جاؤ بھلے ماچس کی ڈبیا ہی لے جاؤ۔ کیونکہ اللہ والے کا ذہن اللہ کی طرف ہوتا ہے لوگ اِن کی طرف آتے ہیں اِس بندے کو فکر رہتا ہے کہ مہمان آئیں گے اگر اس کا اسٹور بھرا ہوا ہے تو اس کا ذہن اس طرف نہیں جاتا لیکن اگر نہیں ہے تو کہتا ہے کہ بھئی کوئی چیز ہی لے آتے یہ اس لئے ہے تا کہ اس کی ریاضت اور ربط دُنیا کی طرف نہ ہو۔ تھوڑا تھوڑا ہی بہت ہوتا ہے۔ آپ جب مراقبہ ہال آئیں تو کچھ نہ کچھ لیتے ہی آیا کریں۔ میاں صاحب اکیلے آدمی ہیں انہیں فکر رہتا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا لنگر پہلے بڑا تھا اب تاریخ میں داتا صاحب کا لنگر بہت ہی بڑا ہے سب سے بڑا ہے۔ ریڈی میڈ (Ready Made) لگتا ہے۔ خواجہؒ صاحب کے دور میں تین ہزار تا ساڑھے چار ہزار کا لنگر چلتا تھا اب تو کوئی حساب ہی نہیں۔ پھر فرمایا کہ انگلینڈ میں کیمرے سے اوراء کی تصویر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے مراقبہ ہال کی خاتون کی جب اُنہوں نے تصویر اُتاری تو تصویر دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ایک سفید روشنی کی بیم (Beam) ہے۔ تو اُنہوں نے تصویر دیکھ کر کہا آپ تو روحانی خاتون ہیں۔ جب اُن سے اِس بارے میں پوچھا گیا تو اُس نے بتایا کہ میں نے مراقبہ میں اپنے شیخ کا تصور کیا تھا۔ مراقبہ یں تصور کرنے سے لاشعوری تحریکات نور کے نزول کرنے سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔

پھر فرمایا کہ لاشعور کی تحریکات بچوں میں زیادہ ہوتی ہیں لیکن ہمارے یہاں بچوں کی باتوں کو رد کر دیتے ہیں، انہیں ڈراتے ہیں پاگل سمجھتے ہیں۔ امریکہ میں ۹ یا ۱۲ بچے جینئس ہیں جن میں سے ایک سعیدہ باجی کا نواسہ ہے۔ ان سب کا تمام خرچہ حکومت خود برداشت کرتی ہے اور اِن کے لئے الگ اور دوسروں سے مختلف نصاب اور اساتذہ ہیں اور ہم اُن سے، ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔

سوال: دُعا کا روحانی فلسفہ کیا ہے؟

جواب: بھئی دُعا ایک درخواست ہے جو لوگ عمل کرتے ہیں اُن کا عمل ہی دعا بن جاتا ہے۔ پھر ایک واقعہ سناتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایک محلے میں دو عورتیں جو کہ ہمسائیہ تھیں رہا کرتی تھیں۔ دونوں کا ایک ایک بچہ تھا۔ اُن میں سے ایک عورت اپنے بچے کو صبح سویرے تیار کرتی اُسے ناشتہ کراتی اور اسکول چھوڑ کر آتی گھر آ کر سارا دن اُس کی کامیابی کے لئے دعا مانگا کرتی دوپہر کو جب وہ واپس آتا تو اُسے نہلاتی اور سُلا دیتی۔ شام کو کھیلتا رہتا اور رات کو تھک کر سو جاتا۔ الغرض یہ اُس کی روٹین تھی۔ اِس کے برعکس دوسری عورت بھی اپنے بچے کا خیال بالکل اِسی طرح رکھتی لیکن رات کو وہ روز اُسے سکول کا کام کرواتی اور سکول کا کام کرنے کے بعد اُسے سونے دیتی۔ دوسری عورت میں یہ خاص بات تھی کہ وہ اپنے بچے کی کامیابی کے لئے دعا نہیں مانگتی تھی۔ جب امتحان کا نتیجہ آیا تو دوسری عورت کا بچہ پاس ہوگیا اور جو صرف دعا مانگا کرتی تھی اس کا بچہ فیل ہوگیا۔ آپ دعا کے ساتھ کوشش بھی کیجئے۔

اس کے بعد ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

کسی گاؤں میں ایک باپ بیٹا رہا کرتے تھے اُن کی روزی کا ذریعہ کاشتکاری تھا لیکن اُن کی زمین کا جو قطعہ تھا اُس کے اندر ایک پہاڑ آتا تھا۔ اس پہاڑ کی وجہ سے ان کی زمین کاشت کے قابل نہ تھی۔ اُن کے پاس اِس کا

صرف ایک ہی حل تھا کہ اس پہاڑ کو وہاں سے ختم کر دیا جائے لیکن نئی زمین خریدنے کے لئے ان کے پاس اتنی رقم نہ تھی جس سے وہ نئی جگہ کاشت کے لئے خرید سکیں۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس پہاڑ کو وہاں سے ختم کر دیا جائے۔ جب گاؤں والوں کو اُن کی اس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے ان باپ بیٹے کا خوب مذاق اُڑایا اور کہا کہ یہ تو بالکل ناممکن ہے کہ اتنے بڑے پہاڑ کو تم دو باپ بیٹا ختم کر دو گے۔ تمہاری زندگی ختم ہو جائے گی لیکن یہ پہاڑ ختم نہ ہو گا۔ لیکن باپ بیٹوں نے اُن کی باتوں کی بالکل پرواہ نہ کی اور تیشہ اٹھا کر پہاڑ ختم کرنے چلے گئے۔ کچھ دن تک تو دونوں کام کرتے رہے لیکن پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ پہاڑ کو کچھ ہوا ہے کہ نہیں۔ ایک دن اللہ کو اِن کی محنت پسند آ گئی انہوں نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ پہاڑ کو اس زمین پر سے غائب کر دو۔ فرشتے نے حکم کی تعمیل میں رات کو پہاڑ ختم کر دیا۔ صبح جب باپ بیٹے پہاڑ توڑنے کے لئے آئے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اُنہوں نے جگہ ہموار کی اور کاشتکاری کے لئے بیج بویا اور ہل چلایا جس سے اُنہیں ایک عمدہ فصل حاصل ہوئی۔ گاؤں والے یہ سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔

آپ بھی روحانی ترقی کے لئے پابندی سے مراقبہ کریں، لٹریچر پڑھیں، اور یا حَیُّ یا قَیُّوم پڑھیں۔ دُعا قبول ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔ یہ ایک باقاعدہ پراسیس (Process) ہے۔ جس طرح اگر آپ کبھی کسی کام کے لئے پٹواری کو درخواست دیں تو وہ درخواست پٹواری سے تحصیلدار کے پاس جائے گی۔ تحصیلدار سے اسسٹنٹ کمشنر، اسسٹنٹ کمشنر سے ڈپٹی کمشنر، ڈپٹی کمشنر سے کمشنر، کمشنر سے ہوم سیکرٹری، ہوم سیکرٹری سے وزیرِ اعظم، وزیرِ اعظم سے صدر تک درخواست منظوری کے لئے جائے گی اور جب صدر اس درخواست کو منظور کر لے گا تو منظوری کے بعد پھر انہی مراحل میں سے ہوتی ہوئی پٹواری تک درخواست پہنچ جائے گی اس کے بعد آپ کا کام ہو جائے گا۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ کا سسٹم بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہزاروں کروڑوں فرشتے ایسے ہیں جو اس سسٹم میں کام کر رہے ہیں۔

اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ بھی ہے کہ ایک چور چوری کرنے آیا اور آپ نے اسے ابدال بنا دیا۔ اُسے ابدال بننے میں کتنا وقت لگا یہ تو کوئی دیکھتا ہی نہیں ہے۔ مسلمانوں نے دعا کے معنی کو غلط سمجھ لیا ہے اِسی لئے مسلمانوں میں اِتحاد نہیں ہے۔

سوال: دنیاوی کام سرانجام دیتے ہوئے بندے کا ذہن کس طرح ہر وقت مرشدِ کریم کی طرف لگا رہے؟

جواب: آپ دنیاوی کام سرانجام دیتے ہوئے سورج کی روشنی کو کیسے محسوس کرتے ہیں؟ آپ سانس کیسے لے رہے ہیں؟ جواباً عرض کیا "غیر ارادی طور پر"۔ ابا جی نے فرمایا کہ "بات ہوتی ہے عشق کی، محبت اور لگن کی، یقین کی بات ہوتی ہے اور یہ سب یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ پریکٹس سے آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ جب آپ کو یقین ہو گا کہ میں

بھی سورج کی طرح موجود ہوں تو آپ مجھے بھی دیکھنے لگیں گے۔ایک دفعہ مجنوں لیلیٰ کے عشق میں گلیوں میں دیوانوں کی طرح پھر رہا تھا کہ لوگوں نے کہا کہ یہ کُتا لیلیٰ کا ہے۔ مجنوں نے اسے اُٹھایا، چومنے لگا اور پیار کرنے لگا۔ پھر ایک دفعہ مجنوں دریا کے کنارے ریت میں اُنگلیاں پھیر رہا تھا۔ لوگوں نے پوچھا کیا کر رہے ہو؟ کہا کہ لیلیٰ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ ریت کے ذرّوں کی چمک میں مجھے لیلیٰ نظر آ رہی ہے۔ بھئی یہ سب یقین سے ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک محبوب اپنے عاشق سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور محبوب نے اُسے گھر سے باہر نکال دیا۔ عاشق بیچارہ گھر سے باہر دروازے پر بیٹھ گیا۔ وہ بیٹھا رہا۔ لوگوں نے اُس سے کہا کہ اُس نے تو تمہیں گھر سے باہر نکال دیا ہے تو اُس عاشق نے کہا کہ چلو محبوب کسی کام کے لئے دروازہ کھولے گا تو ہمیں بھی دیدار ہو جائے گا۔

سوال: زوال کے وقت سے کیا مراد ہے؟

جواب: ظاہری معنی تو سورج کے غروب ہونے یا گھٹنے کا وقت ہے۔ زوال کے وقت ظاہری حواس یعنی بیداری کے حواس پر بوجھ پڑتا ہے۔ عصر اور مغرب کے وقت بندہ بیزاری محسوس کرتا ہے کیونکہ دن کے حواس رات کے حواس میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں اِسی لئے رات کے حواس غالب ہونے سے بیزاری کی کیفیت ہوتی ہے۔

پھر اباجی فرمانے لگے کہ پشاور میں ہمارے بزرگ دوست عبیداللہ دُرانیؒ صاحب اور میں ایک دفعہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اُنہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ خواجہ صاحب قلندر بابا اولیاءؒ جنت اور دوزخ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

میں نے عرض کیا کہ ایک طرف سائبیریا کے لوگ رہتے ہیں جو نہایت ہی ٹھنڈا اور برفباری والا علاقہ ہے اور دوسری طرف افریقہ کے لوگ رہتے ہیں اگر سائبیریا یعنی ٹھنڈے علاقے کے لوگ افریقہ یا گرم علاقوں میں چلے جائیں اور افریقہ والے سائبیریا چلے جائیں تو ان کے لئے وہ دوزخ ہوگی لیکن اِن کے درمیان میں جنت ہے اور دوسری طرف آگ دوزخ ہے۔ بھئی سائبیریا کے لوگ کِدھر جائیں گے دوزخ میں جائیں گے کیونکہ اِن کے لئے تو یہی جنت اور دوسروں کے لئے جنت دوزخ ہے۔ وہ یہ جواب سُن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ آپ بہت شریر ہیں۔

سوال: عُرس کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب: ”یہاں پر جب کوئی بندہ مرتا ہے تو وہاں (اعراف) میں پیدا ہوتا ہے۔ وہاں اُس کے آنے کی خوشی میں سالگرہ ہوتی ہے۔ اور یہاں عُرس منایا جاتا ہے۔ عُرس کے معنی عُروس یعنی دُلہا کے ہیں۔ معراج کی رات تقریبات ہوتی ہیں اور حضرت جبرائیلؑ اس کے میزبان ہوتے ہیں۔ سب لوگ تو نہیں جاتے جو اس قابل ہیں وہ چلے جاتے

ہیں۔

سوال: مقام کے بارے میں وضاحت فرمائیں؟

جواب: روحانیت میں مقام نہیں ہے مقام تو محدودیت ہے۔ آپ کا شعور محدود ہے۔ اور ہم محدود ہیں۔ ہم اِس کو محدود کر کے سمجھ رہے ہیں۔ جہاں رُک کے وہاں مقام ہے۔

سوال: سلسلہ چھوڑنے سے (بیعت ہونے کے بعد) زندگی خراب کیوں ہو جاتی ہے؟

جواب: حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا تھا کہ جو بندہ سلسلہ عظیمیہ میں آتا ہے وہ لاشعور کے قریب ہو جاتا ہے یعنی نور کے قریب ہو جاتا ہے تو جب سلسلہ کو چھوڑ کر دور ہو جاتا ہے تو اُس کا شعور رُک جاتا ہے یعنی وہ خود کوشش کرتا ہے کہ لاشعور سے دُور ہو جائے جبکہ وہ لاشعور کے نزدیک ہوتا ہے اِسی کشمکش میں اس کی فہم ختم ہو جاتی ہے اور وہ بس زندگی کی روٹین کو پورا کرتا ہے۔ بعض اوقات تو پاگل بھی ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا حضور قلندر بابا اولیاءؒ نگینے ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور ہر نگینہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ بعض بندے اتنے قریب آتے ہیں کہ بعد میں دور چلے جاتے ہیں اور بعض کوئی وجہ بتائے بغیر چلے جاتے ہیں اور پھر کبھی نظر نہیں آتے، حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے اپنی پوری زندگی میں ۲۹ دوست (مرید) بنائے اور نہ جانے اب وہ کہاں چلے گئے۔

سوال: جنگل کی بکریاں کم بیمار ہوتی ہیں اور گھر والی بکریاں اکثر بیمار رہتی ہیں، کیوں؟

جواب: بکری کبھی بیمار نہیں ہوتی سب بیماریاں انسان کے اندر ہیں، پرندوں کو کبھی کوئی بیماری نہیں ہوئی۔ وہ نہ زمین میں کاشت کرتے ہیں پھر بھی انسان سے اچھا کھاتے ہیں، انسان کی طرح پریشان بھی نہیں ہوتے۔ پرندے شادیاں بھی کرتے ہیں اِن کے بچے بھی ہوتے ہیں، وہ اِن کو پالتے بھی ہیں صرف انسان طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہے پریشان ہے مگر پھر بھی اشرف المخلوقات ہے یہ کیسے؟

پھر فرمایا کہ ایک دفعہ خواب میں مجھے میرے والد صاحب ملے۔ رو رہے تھے۔ میں نے سبب پوچھا کہ آپ تو اتنی عبادت کرتے تھے پانچ حج بھی کیے جن میں سے ایک حج پیدل جدّہ سے مکّہ تک کیا۔ تو فرمایا کہ میرے ۶۵ سال کہاں گئے میری پینسٹھ ۶۵ سال کی عبادت کہاں گئی۔ سب ختم ہو گیا بس پیر و مُرشد کی نظر کام کر گئی۔

سوال: ایک دفعہ ایک ڈاکٹر صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے مراقبہ میں کامیابی نہیں ہوئی اتنا عرصہ ہو گیا ہے؟

جواب: میں نے اُس سے پوچھا کہ میٹرک کتنے عرصے میں کیا تو بولے ۱۰ سال میں۔ تو میں نے کہا کہ ۲ اور ڈالو

نرسری والے اب ہوئے ۱۲ سال تو ان ۱۲ سال میں اگر آپ روزانہ ۱۰ گھنٹے پڑھائی کو دیتے ہیں تو ایک سال میں ۳۶۰۰ اور دس سال میں تقریباً چوالیس ہزار گھنٹوں میں آپ نے میٹرک کی۔ اور میٹرک کرنے سے آپ کچھ بن نہیں جاتے۔ آپ میٹرک سے چپراسی بنیں گے گزٹڈ آفیسر نہیں۔ پھر ۸ سال اور لگالیں تو یہ بنے ۷۲۰۰۰ ہزار گھنٹے۔ اِن بہتر ہزار گھنٹوں سے آپ ڈاکٹر بنے۔ تو یہ صرف بہتر ہزار گھنٹے آپ نے پیٹ کے لئے، کھانے پینے، گزارہ کرنے کے لئے خرچ کئے۔ پیٹ کے لئے، کھانے پینے کے لئے تو جانور بھی یہ سب کر لیتے ہیں۔ بلّی بھی پیٹ پالتی ہے۔ پرندے بھی ایسے کر لیتے ہیں۔ آپ نے ایسا کون سا کارنامہ کر دیا اور آپ! روحانیت کے لئے ۲۷ گھنٹے بھی نہیں دیتے۔

۱۵ منٹ مراقبہ کرتے ہیں وہ بھی صحیح نہیں۔ اچھا اب مراقبہ کرتے ہیں تو ذہن کاروبار میں لگ جاتا ہے۔ مراقبہ میں صرف اولاد کے لئے دعا کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ یکسوئی نہیں ہوتی۔

یہ بتائیں کہ جب آپ کاروبار کرنے کے لئے میز پر بیٹھتے ہیں تو پھر یکسوئی کہاں سے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آفس میں کام کرتے وقت، فائلیں بناتے وقت آپ کو یکسوئی ہو جاتی ہے۔ بھئی آخر یہ ۱۵ منٹ مراقبہ میں ہی یکسوئی کیوں نہیں ہوتی۔ اچھا مراقبہ اگر کرتے بھی ہیں تو اس میں ناغے ہوتے ہیں۔ اصل میں مراقبہ مسائل دور کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ جب کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو مجھے کہتے ہیں کہ میرا فلاں مسئلہ حل کر دو میرا کاروبار صحیح نہیں چل رہا، تعویز دے دو اور دُعا بھی کریں، پڑھنے کے لئے بھی دیں۔ میں تو یہ کر دیتا ہوں لیکن اصل مقصد کے لئے رجوع نہیں کرتے۔

ایک شعر میں نے سنا کہ ۔

نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

سب پہلا مصرعہ پڑھتے ہیں دوسرا کوئی پڑھتا ہی نہیں۔ بھئی اگر ذوقِ یقین پیدا ہو جائے تو تقدیر بدل جاتی ہے۔ جیسے کچھ لوگ لاتقربو الصلوٰۃ ''کہ صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ'' تو پڑھتے ہیں لیکن یہ نہیں کہتے کہ جب تم نشے کی حالت میں ہو۔ روحانیت مذاق نہیں ہے۔ ایک دفعہ ایک لڑکا میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ امّاں نے بھیجا ہے۔ اماں سلام کہتی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ ہمارا کاروبار ٹھیک نہیں چل رہا۔ کچھ پڑھنے کے لئے بتا دیں اور تعویز وغیرہ بھی دے دیں۔ میں نے پڑھنے کے لئے بھی دے دیا اور تعویز بھی دے دیا۔ آخر جب وہ جانے لگا تو مجھے خیال آیا کہ پوچھنا

تو چاہیئے کہ کیا کاروبار کرتے ہو۔ تو جب میں نے پوچھا بھئی کیا کام کرتے ہو تو کہنے لگا کہ میں گورکن ہوں۔ اسی طرح ڈاکٹر جب دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمیں رزق دے تو اس کا مطلب ہے کہ اے اللہ بندوں کو بیمار کر دے تا کہ وہ میرے پاس آئیں۔ جس طرح گورکن نے دُعا کی یعنی اے اللہ بندوں کو مارتا کہ میرا رزق مجھے ملے۔ بھئی بندوں کے مرنے میں ہی اُس کا رزق ہے۔

ایک دفعہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ مجھے فرمانے لگے۔ گرو جو کہتا ہے وہ کرو، جو کرتا ہے وہ نہ کرو۔ پھر اباجی فرمانے لگے کہ ایک پیر صاحب تھے اور ان کا ایک چیلہ تھا جو کہ بہت موٹا تھا۔ وہ دونوں چلتے چلتے ایک مُلک میں پہنچے تو وہاں کی ہر چیز ٹکے کے بھاؤ مل رہی تھی۔ چیلے کو حلوہ بڑا پسند تھا تو حلوہ بھی ٹکے بھاؤ مل رہا تھا۔ پیر نے چیلے سے کہا یہاں سے چلو، یہاں ہر چیز ٹکے کے بھاؤ ہے کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے لیکن وہ چیلا صاحب تو حلوہ کھانے کے لئے وہیں رک گئے اور نہ مانے۔ پھر گرو یعنی اُس پیر صاحب نے اپنے چیلے کو پڑھنے کے لئے کچھ بتایا اور کہا کہ جب کوئی اُفتاد پڑے تو یہ پڑھ لینا ہم آجائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

اس شہر میں اُن دِنوں ایک قتل ہو گیا۔ قاتل کی بڑی تلاش کی گئی لیکن کچھ نہ پتا چلا تو بادشاہ نے کہا کہ جس کی گردن اس پھندے میں فِٹ آجائے اُسے پھانسی پر لٹکا دو۔ ملازم دیکھتے بھالتے اُس چیلے کے پاس بھی پہنچ گئے۔ جب گردن دیکھی تو وہ پوری فِٹ نکلی۔ اُسے اُسی وقت پکڑ کر لے گئے۔ چیلے نے بہت شور مچایا لیکن کچھ بس نہ چلا۔ آخر چیلے کو جو پڑھنے کے لئے بتایا تھا اُس نے پڑھا اور اگلے دن پیر صاحب چیلے کے پاس پہنچ گئے تو چیلا قدموں میں گر گیا کہ حضور مجھے یہاں سے بچائیں تو پیر صاحب بولے کہ میں نے تجھے پہلے نہیں کہا تھا کہ یہاں معاملہ اندھیر نگری چوپٹ راج والا ہے۔ پھر کہا اچھا کچھ کرتے ہیں۔ کل جب تجھے پھانسی دینے لگے تو تُو کہنا کہ میں نے مرنا ہے۔ اور میں کہوں گا کہ نہیں مجھے پھانسی دو۔ سب ادب ایک طرف جیسے میں کہہ رہا ہوں ویسے کرو۔ چنانچہ کل جب ایسا ہی ہوا تو بادشاہ حیران ہوا۔ اس نے دونوں کے مرنے کی وجہ پوچھی تو پیر صاحب بولے کہ اس گھڑی جو مرے گا سیدھا جنت میں جائے گا تو بادشاہ فوراً بولا کہ مجھے پھانسی دے دو چنانچہ اِس طرح اُس ملک کی بادشاہ سے جان چھوٹی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ گُرو جو حکم دے وہ ضرور کرو۔

اسی طرح ایک شخص کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کُمہار کے گھر میں تھی اور ایک کِسان کے۔ جب اُن کا باپ اُن سے ملنے گیا تو پہلی بیٹی جو کہ کمہار کے گھر والی تھی بولی اباجی دُعا کر دیجئے کہ بارش نہ ہو کیونکہ ہمارے تمام برتن مٹی کے ہیں۔ بارش سے برتن ختم ہو جائیں گے۔

وہی باپ جب دوسری بیٹی کے پاس گیا تو وہ بولی ابا جی دُعا کریں کہ بارش ہو جائے۔ کپاس کا بیج ڈالا گیا ہے۔ وہ ٹھیک اُگے گا۔ اب بیچارہ باپ کس کے لئے دُعا کرے یا نہ کرے۔ وہ مجبور ہے۔

سوال: ذوقِ یقین کیسے پیدا کیا جائے؟

جواب: جو کہا جائے وہ کرتے رہو، کرتے رہو، کرتے رہو۔ کرتے کرتے ذوقِ یقین پیدا ہو جائے گا۔

سوال: امیری اور غربت کا روحانیت سے کیا تعلق ہے؟

جواب: سلسلہ کی ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میرے شوہر کام نہیں کرتے، سارا دن گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ ابا جی نے فرمایا کہ جب اُس کے شوہر سے کہا تو اُس نے آگے سے جواب دیا کہ ابا جی کون سا کام کرتے ہیں تو بھئی مرشد کی عملی زندگی کو اپناتے نہیں اور جو مرشد اگر نہیں کرتا تو کہتے ہیں کہ وہ نہیں کرتا تو ہم بھی نہیں کرتے۔ یہ تو نظام ہی غلط ہے۔ بھئی ابا جی کے دسترخوان پر ۱۵ بندے کھانا کھاتے ہیں تو آپ کے کتنے کھاتے ہیں اسی لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ پریکٹیکلی یعنی عملی زندگی گزارنی چاہیئے۔

✓ سب کچھ لوحِ محفوظ پر لکھا ہے۔ اگر لوحِ محفوظ پر سواری لکھا ہے تو اب یہ ذہنِ انسانی پر (Depend) کرتا ہے کہ وہ کیسی سواری پسند کرتا ہے۔ اس کی ذہنی وسعت پر سب کچھ منحصر ہے۔ وہ چاہے تو اپنے لئے سائیکل پسند کرلے، سوزوکی گاڑی یا گدھا گاڑی۔ لوحِ محفوظ پر تو سواری لکھا ہے اب تو یہ اِس کے ذہن پر منحصر ہے کہ اُس کا ذہن کتنا وسیع ہے کہ کیا سواری پسند کرتا ہے۔ اور جو پسند کرتا ہے وہ ملتا بھی ہے۔

جو کچھ کرتا نہیں وہ کہتا ہے کہ ہم نیکی کر رہے ہیں، روحانیت پر چل رہے ہیں۔ اِسی لئے تو مصیبتیں آ رہی ہیں حالانکہ وہ خود نہیں جانتے کہ وہ چل بھی رہے ہیں کہ نہیں۔ جو بندہ (Status) بنا لیتا ہے اسے کہتے ہیں کہ یہ اسمگلر ہے۔ اور جو غریب ہوتا ہے وہ اپنی غریبی کو نیکی کا نام دیتا ہے حالانکہ غریبی کا نیکی سے کوئی تعلق نہیں۔

ہمت کرنے سے آدمی کچھ کر بھی لیتا ہے۔ کئی آدمیوں میں تو کسی سے بولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کسی کی سفارش بھی نہیں کر سکتے۔

مگر یہ بھی یاد رکھیں کہ: وسائل کے پھیلاؤ سے پریشانی بڑھ جاتی ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے مجھے ایک واقعہ سُنایا تھا کہ ایک پیر صاحب تھے اِن کے ایک دوست تھے، جن کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد پیر صاحب کو اپنے دوست کے بچوں کا خیال آیا کہ چلو اِن سے ملا جائے۔ تو وہ چھوٹے بیٹے کے پاس گئے۔ جب چھوٹے لڑکے سے ملاقات کی تو بہت گرم جوشی سے ملے اور اپنے گھر لے گئے۔ اُن کے

گھر میں بہت تنگدستی اور عسرت تھی۔ خیر پیر صاحب نے وہاں قیام کیا اور رات کو اُن سے پوچھا کہ تم کیا کام کرتے ہو۔ تو چھوٹے لڑکے نے بتایا کہ والد صاحب نے بہت سمجھایا کہ پڑھ لکھ لو لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی بلکہ بُرے لوگوں کی صُحبت میں وقت گزارا۔ اب میں چڑی مار ہوں۔ تو پیر صاحب بولے کہ اچھا صبح ہم تمہارے ساتھ چلیں گے تو لڑکے نے کہا کہ حضور آپ میرے والد صاحب کے پیر صاحب ہیں۔ آپ کہاں جائیں گے۔ آپ یہاں قیام کریں۔ میں جلدی آ جاؤں گا لیکن پیر صاحب نہ مانے اور بولے کہ نہیں میں تو ضرور آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ پھر صبح کو وہ پیر صاحب کو بھی ساتھ لے گئے جال لگا دیا۔ بہت چڑیاں، طوطے اور پرندے آئے لیکن جب بھی لڑکا جال کھینچنے لگتا تو پیر صاحب بولتے نہیں رہنے دو۔ وہ جو دانہ تھا پرندے سب چُگ گئے۔ شام کو خالی ہاتھ واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ یونہی چلتا رہا، جال لگایا جاتا لیکن پرندوں کو پکڑنے سے پہلے ہی روک دیا جاتا رہا۔ اتنے میں تمام رزق جو جمع تھا ختم ہو گیا۔ اب وہ قرض لے کر اپنی ضروریات پوری کرنے لگے۔ ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ لوگوں نے قرض دینا بند کر دیا۔ پیر صاحب سے عرض کیا اُنہوں نے اپنے پاس سے روپے دے دیئے اور کچھ عرصہ یونہی کام چلتا رہا۔ ایک دن جال لگائے بیٹھے کہ ایک پرندہ آ گیا۔ پیر صاحب نے کہا کہ فوراً جال کھینچ لو۔ جال کھینچ لیا۔ پرندہ پکڑ کر دیکھا تو وہ باز تھا۔ پیر صاحب نے لڑکے کو سختی سے تاکید کی کہ باز کو شہر میں اچھے داموں فروخت کرنا۔ اس نے باز فروخت کر دیا جس سے حاصل ہونے والی رقم سے اُن کے حالات اچھے ہو گئے۔ پھر پیر صاحب نے فرمایا کہ تیری قسمت یعنی لوحِ محفوظ میں پرندے پکڑنا لکھا تھا چڑی بھی ایک پرندہ ہے اور باز بھی ایک پرندہ دونوں میں کیا فرق بس تو باز ہی پکڑا کر۔

اس کے بعد بڑے لڑکے کے پاس پیر صاحب چلے گئے۔ وہ بھی بڑی گرم جوشی سے ملا، اپنے گھر لے گیا۔ اس سے حال احوال پوچھا اس نے کہا کہ حالات بڑے اچھے ہیں۔ پیر صاحب نے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں کہا کہ میں سرکاری اصطبل میں گھوڑوں کی خدمت پر مامور ہوں۔ ایک رات اُنہوں نے لڑکے کو بلایا اور کہا بھئی آپ ملازمت چھوڑ دیں۔ لڑنے کہا جی پھر کیا کریں گے۔ پھر سوچا والد صاحب کے پیر صاحب ہیں اس لئے ادب کی خاطر آخرکار انہوں نے وہاں سے استعفیٰ دے دیا۔ لوگوں نے کہا بھئی خوب ترقی ہوئی ہے سرکاری ملازمت ہے آپ چھوڑ رہے ہیں۔ الغرض ایک دن پیر صاحب نے کہا دُلہن کو بلاؤ اس کے زیورات لے کر کہا کہ اِنہیں بیچ کر اس سے اعلیٰ نسل کا گھوڑے کا بچہ خرید لاؤ۔ وہ خرید لایا۔ پیر صاحب نے کہا کہ اب اس کی خوب خدمت کرو۔ اُس نے خوب کھلایا پلایا۔ گھوڑا اچھا خاصا صحت مند اور جوان ہو گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اب اِسے بازار لے جا کر اچھے داموں

فروخت کر دو۔ گھوڑا اچھے داموں فروخت ہو گیا۔ پیر صاحب نے کہا کہ اس رقم سے دوسرے دو یا تین گھوڑے آ جائیں گے لے آؤ۔ اِسی طرح اُن سب کی خدمت کرو اور بیچو پھر پیر صاحب فرمانے لگے کہ تیرا رزق اگر گھوڑوں میں ہی تھا تو کیوں نہ گھوڑوں کا سوداگر بن، گھوڑوں کا ملازم ہی کیوں۔ اس طرح وہ گھوڑوں کا سوداگر بن گیا۔

دراصل سب کچھ انسان کی ذہنی وسعت پر منحصر ہے جیسی چاہے معیشت اختیار کر لے۔ چاہے دال کھائے یا گوشت۔ پوری دنیا دستر خوان ہے۔ لیکن تھوڑی سی محنت اور جدوجہد لازماً کرنی پڑتی ہے۔

سوال: آپ لوگوں کو مختلف وظائف بتاتے ہیں جس سے بے شمار لوگوں کو فائدہ ہوا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو ایک ہی مسئلے کے لئے مختلف وظائف مختلف مدت میں پڑھتے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ اگر شادی یا روزگار کے لیے وظیفہ کرنے کی مدّت ختم ہونے کے بعد بھی مسئلہ حل نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وظیفہ پڑھنے یا دعا کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جو کام اپنے وقتِ مقرر پر ہونا ہوتا ہے وہ اسی وقت ہوتا ہے۔ اور ہماری نہ قبول ہونے والی دعائیں خدا کے حضور جمع ہوتی رہتی ہیں جن کا اجر آخرت میں ملے گا۔ آپ بتائیں جب وقت مقرر ہے تو وظیفہ کیوں پڑھا جائے؟

جواب: بات صحیح ہے کہ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ہر کام لوحِ محفوظ پر پہلے سے نقش ہے۔ لوحِ محفوظ سے یہ نقوش نزول کرتے ہیں تو عالمِ ناسوت میں مظاہر بنتے ہیں۔ لوحِ محفوظ کی تحریر یا نقوش میں مظاہرات کی دنیا کے وجود میں آنے یا لانے کے لیے تدابیر بھی ہوتی ہیں۔ یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ اگر ہم کسی کام کے سلسلہ میں انتظار کرتے ہیں تو دس منٹ کا انتظار بعض اوقات قیامت بن جاتا ہے۔ اور بعض اوقات سالوں کی زندگی اس طرح گزر جاتی ہے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اب وقت اور اس کا تعین دو الگ الگ باتیں ہو گئیں وقت کو اگر انتظار کے ساتھ گزارا جائے تو وقت کی طوالت انتظار کی نوعیت سے طویل اور طویل تر ہو جاتی ہے۔ مفہوم یہ ہوا کہ وقت دراصل ایک کیفیت ہے۔ کیفیت جیسی ہو گی وقت اُسی کے حساب سے طویل یا قلیل ہو جائے گا۔ اس وقت ہم جن حواس میں کام کر رہے ہیں وہ حواس بے یقینی، وساوس اور نا امیدی کے حواس ہیں۔ ایسی صورت میں اگر سائل کو ایسے کام میں لگا دیا جائے کہ جس میں امید، یقین، روشنی اور نور شامل ہو تو یہ ایک قسم کا تعمیری و تدبیری عمل بن جاتا ہے اور مایوس و نامراد، کم ہمت انسان کو ایک سہارا مل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا رجحان اللہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ’’مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا‘‘۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ محض وظیفے پڑھ لینے سے کام بن جاتے ہیں یہ فطرت کے خلاف ہے۔ دعا کے ساتھ عمل اور مسلسل عمل کی

ضرورت ہے۔ بڑوں نے کہا ہے۔ جوئیندہ پائندہ۔ یعنی جو کوشش کرتا ہے وہ پالیتا ہے۔

سوال: کیا کوئی شخص ایک جگہ موجود ہو تو بعینہ اسی وقت کسی دوسری جگہ بھی موجود ہو سکتا ہے؟ نیز ایک آدمی کو کمرے میں بند کر دیا جائے اور وہ بغیر دروازہ کھولے باہر نکل جائے کیا یہ ممکن ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟ کیا یہ ریاضتوں کے ذریعے ممکن ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بھی چیز ودیعت ہوتی ہے اس پر ریاضت تو کرنا پڑتی ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ کا درجہ پیغمبروں سے کم ہے۔ اور پیغمبروں کی زندگی میں ہمارے لئے سب سے بڑی مثال رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ آخری نبیؐ ہیں اور بحیثیت نبیؐ کے اللہ تعالیٰ نے جو عروج و کمال شب معراج میں حضور ﷺ کو عطا کیا ہے وہ کسی نبی کو حاصل نہیں اور نہ ہی کسی پیغمبر کے ساتھ اس طرح بات چیت ہوئی۔ اس کے باوجود حضور ﷺ کو بھی ریاضت کرنا پڑی مثلاً غار حرا میں مراقبہ کرنا، اور قریش مکہ نے جو کچھ حضورؐ کے ساتھ کیا اور آپؐ نے برداشت کیا وہ بلاشبہ ریاضت و مجاہدہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والدین سے جدا ہونا، باپ بیٹے میں دیوار کھڑی ہونا، کیونکہ ان کے والد کی بت پرستی کی وجہ سے باپ بیٹے میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ساری کی ساری ریاضت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز ودیعت ہوتی ہے تو ریاضت کرنا پڑتی ہے۔ اب اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک چیز پہلے سے ودیعت ہے پھر آپ ریاضت کرتے ہیں۔ اس میں وقت کم لگتا ہے۔ اور نتائج زیادہ شاندار مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک باپ اولاد کے لئے بڑا کاروبار چھوڑ جاتا ہے۔ اور کاروبار سیکھنے کے لئے اولاد کو وقت لگانا پڑتا ہے۔ لیکن وہ تھوڑے سے وقت میں پورا کاروبار سنبھال لیتی ہے۔ اس کے برعکس ایک آدمی مزدور ہے اور وہ زمین کھودتا ہے وہ محنت مزدوری کرتا ہے۔ اسے بہت زیادہ ریاضت اور مشقت کرنا پڑتی ہے۔

فرق یہ ہے کہ اگر کوئی چیز پہلے سے ودیعت شدہ ہے تو تھوڑی سی ریاضت میں بڑے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

سوال: قرآن پاک میں کوئی ایسا واقعہ موجود نہیں، نہ ہی رسول پاک ﷺ کے دور میں یا صحابہ کرامؓ کے دور میں یا تاریخ میں ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک آدمی بیک وقت دو جگہوں پر موجود ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک آدمی کئی جگہوں پر موجود ہو؟

جواب: تاریخی حوالے سے میرے سامنے بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے، اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کوئی

ایسا واقعہ ملتا ہے۔لیکن اس دور میں اور آج کے دور میں فرق ہے۔ آج ہمارے ہاں ٹیلویژن ہے۔ حضورﷺ کے زمانے میں تو یہ بھی نہیں ہوا کہ ایک آدمی بیک وقت لاکھ جگہ نظر آیا ہو۔ ان کے زمانے میں یہ بھی نہیں ہوا کہ آپ یہاں بیٹھ کر امریکہ بات کرلیں۔تو جیسے جیسے نوع انسانی کا ارتقاء ہوتا رہا نئے نئے علوم سامنے آتے رہے۔

جہاں تک آدمی کا زائد جگہوں پر موجود ہونے کا تعلق ہے۔ ایسا ممکن ہے۔ جب ہم روحانیت کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو بہرحال روحانی علوم مادّی علوم سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً ہم ایک آدمی کو ٹی۔ وی اسٹیشن پر کھڑا کر کے اسے ایک کروڑ جگہ پر ڈسپلے کر سکتے ہیں اور اسے ایک کروڑ سے زیادہ آدمی دیکھ سکتے ہیں۔ مادی لحاظ سے اگر یہ ممکن ہے تو روحانی طور سے یہ کیسے ممکن نہیں ہے۔ ٹی۔ وی اسٹیشن سے جو پروگرام ڈسپلے ہو رہے ہیں اسے کئی جگہوں پر دیکھا جاتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان کی تصویر کو لہروں میں منتقل کر کے مخصوص فریکوئینسی یا مخصوص چینل کے ساتھ فضا میں منتشر کر دیا جاتا ہے۔ اور جب اس چینل سے وہ نقطے یا لہریں ٹی۔ وی اسکرین پر آتی ہیں تو جیتی جاگتی تصویر بن جاتی ہیں۔ جب مادی اعتبار سے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا جاسکتا ہے تو روحانی اعتبار سے ایک روحانی آدمی اپنے آپ کو روحانی طور پر کئی جگہ ڈسپلے کر دے تو میرے خیال میں یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ کی ملاقات کسی ایسے آدمی سے ہوئی جس نے آپ کے سامنے اس قسم کا مظاہرہ کیا ہو؟

جواب: میں اپنے پیر و مرشد حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں شب و روز سولہ (۱۶) برس رہا ہوں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے سوئیٹزرلینڈ سے ایک خط ملا۔ جس میں ایک بھائی نے حضور بابا صاحب کے بارے میں لکھا تھا کہ آپ یہاں تشریف لائے تھے۔ اور ہمیں ملاقات کا کافی وقت ملا، یوں ہوا اور یوں ہوا۔ اب خط پڑھ کر میں بڑا حیران ہوا کہ قلندر بابا تو کہیں گئے نہیں۔ پھر یہ خط کیسا ہے؟ میں نے اپنے پیر و مرشد سے اس بارے میں پوچھا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ دوسرہ واقعہ یوں ہے کہ قلندر بابا اپنے ایک دوست جس کے گھر اکثر جایا کرتے تھے۔ کے پاس گئے ہوئے تھے۔ شدید بارش ہو رہی تھی۔ میں نے ان کی واپسی کا کافی انتظار کیا۔ پھر یہ سوچ کر سو گیا کہ اس بارش میں اب کہاں واپس آئیں گے۔ رات کو جب آنکھ کھلی تو آپ کمرے میں موجود تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اندر کیسے تشریف لائے۔ اور دروازہ کس نے کھولا؟ تو فرمانے لگے کہ میں نے دستک اس لئے نہ دی کہ میں نے سوچا کہ آپ کی نیند خراب ہو گی۔

اس کے علاوہ میں نے بہت سے واقعات دیکھے ہیں۔ اور ایسے واقعات بھی ہیں جو میں بیان نہیں کر سکتا۔ مگر میں نے یہ سارے واقعات اس وقت دیکھے تھے جب میں سال ہا سال ان کی خدمت میں رہا۔

شروع میں میں نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی اور نہ ہی میں ان کی کوئی کرامت دیکھ کر بیعت ہوا۔ نہ ہی میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ مجھے کچھ دکھائیں۔ البتہ میں نے ان کے اندر ایک چیز دیکھی کہ ان کے اندر محبت اور اخلاص بہت تھا۔ جو مجھے کبھی بھی نہیں ملا۔ اور میں اسی محبت اور اخلاص کی بنیاد پر ان سے منسلک ہو گیا۔

تذکرہ غوثیہ میں حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ نے بھی اس قسم کے کئی واقعات کا تذکرہ کیا ہے ان کے ایک بھائی ابدال تھے۔ ان کا اور اپنی والدہ کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ تذکرہ غوثیہ ماورائی علوم کے اوپر بھرپور کتاب ہے۔

سوال: قرآن کریم تمام علوم کا منبع ہے اور اس کے بعد حدیث شریف ہے۔ کیا قرآن اور حدیث کی رو سے مراقبے سے ایسے افعال جن کا تعلق عام فطرت سے نہ ہو۔ سرزد ہونا ممکن ہے؟

جواب: ماورائی واقعات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن میں حضرت سلیمان کا واقعہ درج ہے کہ وہ دربار میں تشریف فرما تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ کوئی ہے جو بلقیس کا تخت لے آئے۔ تو ایک جن بولا کہ آپ کا دربار برخاست ہونے سے پہلے تخت لے آوٴں گا۔ وہاں ایک انسان بھی موجود تھا اس نے کہا میرے پاس کتاب کا علم ہے میں پلک جھپکتے میں تخت حاضر کر دوں گا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پلک جھپکی تو بلقیس کا تخت حاضر تھا۔ حالانکہ درمیان میں ستائیس یا اٹھائیس سو میل کا فاصلہ تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ۔ آگ کا ٹھنڈا ہونا بھی بالکل ایک ماورائی بات ہے۔ آگ کے شعلے اتنے اونچے تھے کہ پرندے بھی جل کر خاکستر ہو گئے تھے۔ لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا گیا تو آگ گلزار بن گئی۔

حضرت عزیر کا واقعہ۔ ایک درخت کے نیچے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو سواری کے لئے جو گدھا ساتھ تھا اس کی ہڈیاں بھی راکھ بن گئیں۔ لیکن توشہ دان میں کھانا خراب نہیں ہوا۔

سوال: کرامت اور روحانیت کے بارے میں وضاحت فرمایئے؟

جواب: جہاں تک کرامت کا تعلق ہے یہ اولیاء اللہ کے علاوہ یوگا کرنے والے اور ٹیلی پیتھی کے ماہروں سے بھی سرزد ہوتی ہے۔ مثلاً فلاں یوگی فضا میں اڑ گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل روحانیت کا منشاء کرامت نہیں ہے اور نہ ہی کرامت کا تعلق روحانیت سے ہے۔ روحانیت کا منشاء یہ ہے کہ بندے کا اللہ کے ساتھ کتنا تعلق قائم ہے۔ آپ کا تعلق اللہ سے قائم ہو سکتا ہے بشرطیکہ جسمانی رشتوں کے

ساتھ ساتھ روحانی رشتے کو تلاش کریں۔ یعنی اللہ سے رشتہ قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی روح سے واقف ہوں اگر نماز میں کنسنٹریشن یا اللہ سے رابطہ نہ ہو تو ایسی نماز نمازیوں کے لئے ہلاکت بن جاتی ہے۔ روحانیت یہ ہے کہ اگر آپ کی اللہ سے دوستی ہے تو آپ روحانی آدمی ہیں۔ اور اگر اللہ سے آپ کی دوستی نہیں ہے تو آپ آسمان پر بھی اڑیں تو آپ روحانی آدمی نہیں ہیں۔

سوال: قرآن پاک میں کہیں بھی روحانی آدمی کا ذکر نہیں ہے۔ وہاں مسلم ہے یا غیر مسلم، مومن ہے یا فاسق اس بارے میں وضاحت فرمایئے؟

جواب: قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ حالانکہ ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا یعنی یہ مومن نہیں ہیں۔ شرط یہ ہے کہ آپ پہلے ایمان لائیں پھر مومن بنیں۔ جب تک آپ مومن نہیں بنیں گے اس وقت تک اسلام قابل تذکرہ تو ہے لیکن آپ نے اسلام کا حق پورا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسلام میں پورے کے پورے...... داخل ہو جاؤ۔ یعنی ایمان کے ساتھ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ مسلمان ہونا الگ بات ہے مومن بننا الگ بات ہے دراصل ایمان ہی روحانیت ہے۔ اور مومن ہی روحانی آدمی ہے۔ اگر آپ کے اندر ایمان نہیں ہے تو آپ روحانی آدمی نہیں ہیں۔ جب تک آپ اپنی روح سے واقف نہ ہوں گے مومن نہیں بنیں گے۔ اور جب آپ مومن بن جائیں گے تو خود بخود روحانیت سے واقف ہو جائیں گے۔ روحانیت کا مطلب ہے ایقان، یقین اور ایمان کا مطلب بھی یقین ہے۔ یقین کی صحیح تعریف مشاہدہ ہے مشاہدہ کے بغیر یقین کی تکمیل نہیں ہوتی۔

سوال: آپ نے ایک کتاب ''ٹیلی پیتھی سیکھئے'' لکھی ہے۔ اس کتاب کو لکھنے میں آپ کا کیا مقصد ہے؟

جواب: میں نے یہ کتاب اس وقت لکھی جب روس، امریکہ اور دیگر ممالک میں ٹیلی پیتھی کا بہت زور تھا۔ ایک ایسی ہی مجلس مذاکرہ میں کہا گیا کہ غیر مسلمانوں نے ٹیلی پیتھی کا علم ایجاد کر لیا ہے۔ مسلمانوں نے کیا کیا؟ یہ بات میرے تو دل کو لگ گئی اور میں نے ٹیلی پیتھی پر کتاب لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ کتاب لکھنے سے میرا منشاء یہ تھا کہ ان لوگوں کے اندر فکرِ سلیم پیدا ہو جائے جو غیر مسلموں سے متاثر ہو کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے سے بلاشبہ بے شمار لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ جن لوگوں کی طرز فکر میں عیسائیت اور دہریت غالب آ گئی تھی۔ اس کتاب کو پڑھنے اور مشقیں کرنے سے ان کے اندر سے عیسائیت اور دہریت نکل گئی۔ وہ صراطِ مستقیم کی طرف گامزن ہو گئے۔ اس کتاب میں رسول اللہ ﷺ کے دور کی بہت سی مثالیں

دی گئی ہیں۔ جن میں اونٹ اور کنکریوں کی مثالیں شامل ہیں یہ کتاب شائع کرنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ لوگوں کے اندر فکرِ سلیم پیدا ہو جائے اور غیر مسلمانوں نے ماورائی علوم میں جو ترقی کی ہے مسلمان بھی فکر سلیم کے ساتھ ترقی کریں۔ اس کتاب میں آٹھ اسباق ہیں پہلے میں نے خود ان پر عمل کیا پھر ان سے حاصل ہونے والے نتائج کی روشنی میں کتاب لکھی۔

سوال: یہ لوگ جو یوگا اور ٹیلی پیتھی سکھاتے ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک کیا ہے۔ اور سب کس چیز پر زور دیتے ہیں؟

جواب: ان سب میں قدر مشترک یہ ہے۔ اور سب اسی چیز پر زور دیتے ہیں کہ آدمی اپنے اندر Inner یا ذات سے واقف ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا بھی ارشاد ہے کہ جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا اس لئے جب ہم اپنے انر یا اپنی ذات سے واقف ہو جائیں گے تو خود بخود اللہ تعالیٰ سے ہمارا رابطہ و تعلق قائم ہو جائے گا۔

سوال: قرآن پاک میں ارشاد ہے زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے ہر شے اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ ہندو۔ عیسائی اور کمیونسٹ اور ان کے پیروکار بھی خدا کو مانتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ان کو غیر مسلم کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: انسانی ساخت کا جب ہم تذکرہ کرتے ہیں تو اس دنیا میں رہتے ہوئے ہمارے سامنے دو باتیں آتی ہیں۔ نمبر (۱) انسان کا مادی جسم نمبر (۲) انسان کا روحانی جسم۔ مادی وجود میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اختیار کے استعمال کا حق دیا ہے چاہے ہم اپنے اختیارات اچھے کاموں میں استعمال کریں یا برے کاموں میں۔ اختیارات کے استعمال کا حق قرآن پاک سے ثابت ہے۔

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ بندے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ دین پر چلے یا نہ چلے۔ حضور ﷺ کی باتیں لوگوں نے جب نہ سنیں تو حضور ﷺ پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا کہ اے پیغمبر ﷺ ہم نے آپ کو لوگوں کے اوپر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ آپ ہمارا پیغام لوگوں تک پہنچا دیجئے۔ جس نے سننا ہے وہ سن لے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ دین کو قبول کرے یا نہ کرے۔ دین کا قبول کرنا یا نہ کرنا ہمارے مادی وجود کا کام ہے۔ لیکن مادی وجود کے ساتھ روح کا بھی عمل دخل ہے۔ روح ہر چیز کے اندر ہوتی ہے۔ ہر وہ چیز جس کے اندر نشوونما ہے۔ جو گھٹ رہی ہے یا بڑھ رہی ہے یا جس کے اندر زندگی ہے اس کا تعلق روح سے ہے۔

جب یہ تذکرہ آتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہی ہے۔ تو اس میں کائنات کی تمام مخلوقات شامل ہیں۔ اور ہر چیز کی روح اللہ کا ذکر ہی کر رہی ہے۔ صرف مادی وجود کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اللہ کا ذکر کرے یا نہ کرے۔ کسی ہندو کی روح ہندو نہیں ہوتی کسی کمیونسٹ کی روح کمیونسٹ نہیں ہوتی۔ اور کسی مشرک کی روح مشرک نہیں ہوتی بلکہ شرک کا تعلق مادی وجود اور شعور سے ہے۔ اس آیت میں تفکر کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کائنات میں جتنی بھی مخلوقات ہیں سب روحانی طور پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہی ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ کا قرب اور اپنی روح کا عرفان حاصل کرنے کے لئے کون سا عمل اختیار کیا جائے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کا قرب اور روح کا عرفان حاصل کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یا عمل صلوٰۃ قائم کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ اعجاز حاصل ہے کہ انہوں نے ہماری زندگی کی ہر حرکت کو صلوٰۃ میں شامل کر دیا ہے۔ کھڑے ہونا، جھکنا، بیٹھنا، لیٹنا، پڑھنا، خاموش رہنا وغیرہ اس لئے اگر ہم صحیح معنوں میں صلوٰۃ قائم کر لیں تو ہمیں روح کا عرفان حاصل ہو جائے گا۔ آج ہم صحیح معنوں میں صلوٰۃ کو اس لئے قائم نہیں کر سکتے کہ ہم کنسنٹریشن یعنی ذہن کو یکسو کرنے کے عمل سے واقف نہیں ہیں۔ ذہن کو یکسو کرنے کے لئے مراقبہ بہترین مشق ہے۔ اور جب ذہن یکسو کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے تو صلوٰۃ میں بھی ہمارا ذہن خود بخود یکسو ہو جائے گا۔ جب صلوٰۃ میں کنسنٹریشن حاصل ہو جائے گی تو ہمیں مرتبۂ احسان حاصل ہو جائے گا۔ مرتبۂ احسان یہ ہے کہ بندہ یہ محسوس کرے کہ اسے اللہ دیکھ رہا ہے یا بندہ یہ محسوس کرے کہ بندہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ **الصلوٰۃ معراج المومنین**۔ معراج کا مطلب ہے غیب کی دنیا میں داخل ہونا۔ اگر انسان صلوٰۃ (نماز) میں کنسنٹریشن یعنی یکسوئی حاصل کر لے تو اس عمل کے ذریعے اسے معراج حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے انسان کو اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی روح کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔

اختتام